خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



خاتون کی ڈائری

ناول

افسانے

سچی کہانیاں







کہنے سننے

۱۱ر جنوری ، ۲۸ر دسمبر

ایک تکلیف دہ دن ، ایک دکھ بھری تاریخ
۱۱ر جنوری آنے والی تھی —— ۱۱ر جنوری کو
انشا بھائی کو سفر پہ گئے دو سال ہونے
والے ہیں.
وہ تو اکثر سفر پہ جاتے رہتے تھے.
لیکن اتنا طویل سفر انہوں نے پہلی بار کیا.
ہم تو ہر روز ان کے منتظر تھے.

○

محبت ہماری بھی کم نہیں تھی ان سے
لیکن اک شخص لے گیا بازی
شاید ان کے بغیر اداس رہتا تھا
جہانگیر بھائی کہ پیارا سب کا تھا
عصمت باجی کے سر کا تاج تھا وہ
۲۸ر دسمبر کو انکے پاس جا پہنچا
کتنا بے تاب تھا انکے پاس جانے کو
دیکھئے اب کون لوٹ کے آتا ہے
یا ہم کو بھی پاس بلاتا ہے.

○

کل بھی ہم روئے
آنسوؤں کے ہار پروئے تھے
آنسو ہمارے رواں تھے کل بھی
آنسو آج بھی کسی طور نہیں تھمتے
جانے والا تو جاتا رہتا تھا
سفر پہ سفر منتظر تھا ان کا
اتنا لمبا طویل سفر ان کو
اس سے پہلے نہ پیش آیا تھا
اب انتظار میں پتھرا گئیں آنکھیں
جانے والا اب تلک نہیں آیا.
کس سے پوچھوں جواب کون دے گا
آنے والا نہ آیا تو کیا ہو گا - ؟

حمیدہ بانو

۲۸ر دسمبر کو ہماری بہنوں میں سے سب سے بڑی بہن عصمت خاتون کے شوہر محمد جہانگیر اشرفی بھی انشا بھائی جان کے پاس چلے گئے.



نادرہ خاتون



عاصمہ تاج

سویٹ نادرہ آپی

ڈھیروں سلام!

دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ پڑھا۔ بہت خوبصورت لگا۔ ٹائٹل بے حد پیارا تھا۔ ناولوں میں مشرف تمیز اور ریحانہ زیدی کے ناولوں کی دونوں قسط پڑھیں بہت اچھی ہیں۔ خاص کر ریحانہ زیدی کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ اتنا خوبصورت ناول لکھنے پر ان کو مبارکباد پہنچا دیجئے۔ افسانے یوں تو تمام کے تمام خواتین ڈائجسٹ کے معیار کے تھے لیکن زیادہ دلکش ریحانہ زیدی اور عظمیٰ ناز کے تھے۔ مستقل سلسلوں میں آپ سے کیا پردہ تھا اور رنگا رنگ پھول تھا۔ سچی کہانیوں میں ناظمہ انور کی کہانی اچھی لگی۔

شگفتہ خانم

پیاری نادرہ باجی! سلامت تا قیامت

آداب!

دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا اور بہت جلد ہی ہضم کر لیا۔

اس دفعہ خاص کر "نگاہِ التفات" نہایت دلچسپ رہا۔

فوزیہ خان کا افسانہ "کھیل کھیل میں" ریحانہ زیدی کا "پہچان" اور عظمیٰ ناز کا "سیاہ ریشم" بہترین کاوش ہیں۔ سچی کہانیاں "اندھا اعتبار" اور "کانچ کے ٹکڑے" دونوں پسند آئیں۔ دوسرے افسانے "شکستِ فاش" "رنگِ سراب" "جینے کی تمنا کون کرے" بھی پسند آئے۔

میری طرف سے تمام قلمکار بہنوں کو مبارکباد دیں۔

بہت سی پرخلوص دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ!

باجی نئے سال کی مبارکباد بھی ابھی ہی قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی یہ رسالہ ترقی کرے۔ آمین

یاسمین سلیم خان — کوٹ ادو

ڈیرسٹ نادرہ آپی

آداب!

دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ بہت خوبصورت ہے۔ نگاہِ التفات بہت اچھا چل رہا ہے۔ قسط پڑھ کر اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور "آپ سے کیا پردہ" میں دیکھ ہماری وید کے کارن پڑھ کر ابنِ انشا کی یاد شدت سے آئی۔ حمیدہ بانو نے ایک اور نمبر ترتیب دینے کا ارادہ کیا ہے تو اس کے لئے میں گزارش کروں گی کہ اس نمبر کا نام انشا نمبر رکھا جائے۔ جنوری آئی مگر اپنے ساتھ بھولی بسری ہمارے معروف شاعر ابنِ انشا کی یاد اپنے دامن میں بھر لائی ہے۔ آپ سے کیا پردہ پڑھتے ہیں تو ان کا مقدس چہرہ نظروں میں آجاتا ہے۔ ریحانہ زیدی کا ناول پھانس بہت ہی عروج پر ہے۔ دل موہ لینے والا اور اس دفعہ انھوں نے "پہچان" افسانہ بھی پڑھوایا بہت شاندار ہے۔ ملکہ معین کا چاند بہت حسین ہے۔ اگلی آخری قسط کی نوید سنا کر تو بے چین کر دیا ہے۔ ابھی سے جنوری کا انتظار ہے۔ عظمیٰ ناز کا افسانہ سیاہ ریشم، فوزیہ خان کا کھیل کھیل میں، سچی کہانی اندھا اعتبار بہت اچھا ہے۔

شہناز فیضی — کراچی

سویٹ نادرہ بجو

آداب قبول کریں۔

حسب سابق سرورق کو بے انتہا جاذب نظر پایا۔ دسمبر کا ماہنامہ تمام تر رعنائیوں سمیت ہمارے سامنے ہے۔ سب سے پہلے انشا جی کا "آپ سے کیا پردہ" میں دیکھ ہماری وید کے کارن بے حد پسند آیا۔ یہ شعر تو جی کو بہت ہی پسند آیا۔

ہاں اس نے جھلکی دکھلائی ایک ہی پل کو دریچے میں
جانو اک بجلی لہرائی، عالم ایک شہید ہوا

دونوں ناول "نگاہِ التفات" اور "پھانس" خراماں خراماں اپنی اپنی چال میں خوب چل رہے ہیں۔ افسانوں میں لبنیٰ غزل کا افسانہ "چاند نہ میرے آنگن اترا" ریحانہ زیدی کا "پہچان" اور عظمیٰ ناز کا "سیاہ ریشم" بے حد پسند آئے۔ باقی سب سلسلے لاجواب اور شاندار لگے۔ ہاں خواتین کی محفل میں ذوالقرنین کی پردہ نشینی بے حد بری طرح کھٹکتی ہے۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ خدا کرے ہمارا یہ ماہنامہ خوب ترقی کرے اور ہر ماں، بیٹی، بہن اسے اپنے ساتھ رکھنے میں فخر محسوس کرے۔ اللہ کرے یہ زینہ بزینہ ترقی کی جانب بڑھے۔ آمین۔

شازیہ تاج — ایبٹ آباد

پیاری آپی نادرہ

سلام شوق

دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح کرنوں کو جگمگاتا ہوا ہمارے پاس آپہنچا۔ اس ماہ کی تمام کرنیں من کو بھائیں۔ "پھانس" نے نیا موڑ اختیار کر لیا ہے۔ "چاند" بھی بہترین کاوش ہے۔ سب سلسلے اچھے ہیں۔ ذوالقرنین کی محفل بھی جم چکی ہے۔

خدا کرے خواتین ڈائجسٹ اور ہمارا ساتھ سدا قائم رہے۔ آمین۔

دلشاد نسیم — کراچی

پیاری باجی

تسلیمات!

اس ماہ کا شمارہ پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح تازگی، راحت لئے دل میں اترتا چلا گیا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اس پیارے رسالے کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

توحید صدیقی — کراچی

سویٹ نادرہ آپی

آداب

دسمبر کا شمارہ اپنی تمام تابانیاں سمیٹے میرے سامنے ہے۔ اور میں دھنک کے رنگوں میں گھری سوچ رہی ہوں کہ کس رنگ کو منتخب کروں۔ اس کی خوشبو ہی منفرد انداز لئے ہوئے ہے۔ چاند کی آخری قسط کے لئے بہت بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ریحانہ زیدی کا افسانہ پہچان بہت خوبصورت اور دلچسپ تحریر تھی۔ تحسین انجم انصاری کا شکست فاش جس میں حقیقت بھی تھی اور دلچسپی کا عنصر بھی۔ فوزیہ خان کھیل ہی کھیل میں سبق دے گئیں۔ اور طاہرہ ناہید حجاب بھنور سے ساحل تک خوب لائیں۔ بہرحال ہر تحریر اپنی جگہ لاجواب ہے۔

بشریٰ صدیقی — کراچی

پیاری باجی

آداب!

باجی ایک دفعہ پھر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر خدمت ہوں۔ اس ماہ کا رسالہ بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مہینے کی پہلی ہی تاریخ کو جلوہ فگن ہوا۔ چاند اپنے آخری مراحل میں پہنچ گیا ہے۔ نگاہِ التفات اور پھانس تعریف کے قابل ہیں۔ اور باقی تمام بہنوں کے افسانے اپنی جگہ آپ تھے۔ انشا جی کی غزل بہت شاندار تھی اور باقی تمام غزلیں بھی اچھی تھیں۔ تمام سلسلے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھے۔

رخسانہ ہارون — میرپور خاص

پیاری نادرہ آپی

آداب عرض

اس دفعہ نظر سرورق پر پڑی تو دل جھوم گیا۔ "نگاہِ التفات" مشرف تیز کا قابل تعریف تھا۔ "چاند" بہت ہی خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ "پھانس" کی قسط پسند آئی۔ فوزیہ خان کا افسانہ "کھیل ہی کھیل میں" بے حد پسند آیا۔ ریحانہ زیدی، عظمیٰ ناز، لبنیٰ غزل کے افسانے بہت پسند آئے۔ باقی سب سلسلے بھی دلچسپ تھے۔

آخر میں آپ کی چھوٹی بہن کی یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔

نگہت واحد علی

پیاری نادرہ بجیا

آداب!

ماہ دسمبر کا جھلملاتا "خواتین ڈائجسٹ" ملا۔ یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ اس کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

اس ماہ کے خواتین میں تمام کہانیاں سبق آموز تھیں۔ تمام مصنفاؤں کو مبارکباد پہنچا دیں۔ مستقل سلسلوں میں "رنگا رنگ پھول"، "بہنوں کی محفل"، "میری بیاض" سے میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔

رعنا اختر بدایونی — کراچی

نادرہ باجی

بہت بہت آداب!

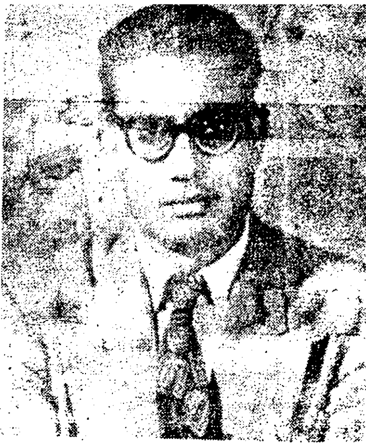
دسمبر کا خواتین ڈائجسٹ پڑھا۔ بہت ہی اچھا تھا۔ میری اپنی نظر میں یہ پاکستان کا واحد مایہ ناز رسالہ ہے جو پورے ملک میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

"چاند" بہت اچھی جا رہی ہے اور سب بہنوں نے اپنی اپنی جگہ بہت خوب لکھا ہے۔ ان سب کو میری طرف سے مبارکباد کہہ دیں۔

آخر میں میری دعا ہے اللہ تعالیٰ جل شانہ اس خوبصورت رسالے کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ اللہ ان سب لکھنے والی بہنوں کو اتنا حوصلہ دے کہ اور بھی اچھا لکھیں۔ آمین۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔





سعادت محمود



ابنِ انشاء میرے بھائی جان



پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے مجھے اطلاع ملی کہ پندرہ تاریخ کو انشاجی کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ اس جلسے کے لئے میں بھی کچھ لکھوں۔ حامی تو بھر لی لیکن لکھنے بیٹھا تو کچھ بھی سمجھائی نہ دیا کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔

سنا ہے وہ شاعر تھے۔ مجھے اس بات کا علم ریڈیو۔ ٹی وی پر ان کے گیتوں غزلوں کے علاوہ رسالوں اور مطبوعہ کتب کے ذریعے ہوا۔ مجھے انہوں نے کبھی کوئی غزل یا گیت نہیں سنایا اور نہ کبھی اپنے شاعر ہونے کا احساس دلایا۔

یہ بھی کہ وہ مزاح نگار تھے۔ میں اخباروں اور رسائل میں ان کے مضامین پڑھتا تھا۔ اردو کی آخری کتاب سے متعلق مشتاق احمد یوسفی صاحب کا یہ تعارف اور خصوصاً اس کے یہ جملے بھی پڑھے کہ یہ خوش نصیب ہیں کہ اردو مزاح کے سنہری دور میں جی رہے ہیں۔ انھوں نے ابن انشا کو اس دور کی آنکھ کا تارا بھی کہا۔ لیکن مجھ سے وہ جب بھی ملے ایک پروقار سنجیدگی سے ملے۔ ہاں ایک سدا بہار سی مسکراہٹ آنکھوں اور لبوں پر ضرور ہوتی تھی، لیکن اپنی گفتگو میں مزاح کا استعمال کبھی نہیں کرتے تھے۔ ہاں وہ کالم نویس تھے۔ میں ان کے ہر کالم کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا لیکن جب کبھی ان کے کالم کا ذکر ان کے سامنے کیا تو وہ حسب معمول مسکرا دیتے لیکن بات کو آگے نہ بڑھاتے تھے۔ بدیں سبب ان کی یاد میں ہونے والے اس جلسے کے لئے کوئی علمی یادداشت میرے پاس ہرگز نہیں تھی۔

انشاجی عمر میں تو مجھ سے صرف چار سال بڑے تھے مگر ان کا شفقت بھرا رویہ مجھ سے جیسے صدیوں بڑا تھا۔ معاملات میں وہ کبھی کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات پر ان سے مشورہ کرنا اور ان کی رائے کے مطابق عمل پیرا ہونا ہم سب پر واجب ہوتا تھا۔ بھائی بہنیں ہی نہیں والدین بھی ان سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ بالیقین پس منظر میں یہی تھا کہ وہ ایک صائب الرائے شخصیت تھے۔ وہ خدا کے فضل کی شکل میں ہمارے راہنما ثابت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ایک نوٹ بک ملی ہے۔ اس میں اپنے خاندانی حالات اور اپنے علمی ذوق کا حال یوں لکھتے ہیں:

"میں حالات کو کم اہمیت دیتا ہوں اور تخلیقات کو زیادہ۔ حالات کے باب میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میرے بزرگ ایران یا توران سے نہیں آئے تھے۔ صاحب دیوان نہیں تھے۔ ہفت ہزاری نہیں تھے۔ مغلوں سے کوئی قبالہ یا انگریزوں سے کوئی جاگیر نہیں پائی۔ شاعری وراثت میں بھی نہیں ملی۔ زبان گھر کی لونڈی نہیں۔ گھرانے میں کوئی کسی فن کا جید عالم نہیں گزرا۔ اساتذہ بھی چنن سنگھ اور لالہ رام پرشاد قسم کے تھے۔ کوئی نامور استاد نہیں ملا۔ درس گاہیں بھی معمولی پائیں جو کچھ حاصل ہوا باکمالوں کی کتابوں کے ذاتی مطالعے سے ہوا۔ وہ محمد حسین آزاد ہوں۔۔ یا رتن ناتھ سرشار۔"

جس اسکول میں ہم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی وہ ہمارے گاؤں سے تقریباً تین میل دور ایک قصبے میں تھا۔ میں ان کے ساتھ اسکول آیا جایا کرتا تھا۔ ایک دن بھائی جان اور میں اسکول سے واپس آرہے تھے۔ شدید گرمی کے دن تھے۔ دوپہر کا وقت۔ راستہ کیا تھا ایک ریگزار تھا۔ ادھر اسکول میں میرے جوتے گم ہوگئے تھے۔ ایسے میں میرے لئے اس تپتی ریت پر چلنا ناممکن تھا۔ انھوں نے اپنا جوتا مجھے دے دیا۔ چونکہ ان کے جوتے میرے سائز سے بڑے تھے۔ اس لئے گرم گرم ریت جوتوں میں در آنے سے مجھے چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ میرے ساتھ چلتے رہے لیکن جب ریت کی حدت برداشت سے باہر ہوگئی تو بھاگنا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں گھاس کا کوئی ٹکڑا یا پودا نظر آتا تھا اس پر کبھی ایک پاؤں کے سہارے اور کبھی دوسرے پاؤں کے سہارے کھڑے ہو جاتے اور میرے وہاں پہنچنے کا انتظار کرتے۔

وہ اپنی شرافت اور علمی شوق کے باعث بچپن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنے بچوں کو ان کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم دوپہر کے وقت اپنے گھر کے قریب ایک برگد کے سائے میں چارپائیوں پر بیٹھے چھٹیوں کا کام کر رہے تھے۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور کچھ سو رہے تھے۔ اتنے میں ایک سکھ کوٹ پتلون پہنے ایک لڑکے کے ہمراہ وہاں آیا۔ سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بڑی حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ آنے والے سکھ نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریلوے میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ شبیر محمد کون ہے۔ سب نے یکبارگی بھائی جان کی طرف اشارہ کیا وہ سکھ بھائی جان کے قریب آیا اور انہیں گلے سے لگا کر کہنے لگا کہ بابو جی جب بھی میرے پاس جاتے ہیں تمہاری تعریفیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب کبھی بھی گاؤں جاؤں گا گھر میں قدم رکھنے سے پہلے تم سے ضرور ملوں گا۔ سو اب تک میں گھر نہیں گیا۔ بیٹے میرے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دو۔ شاید تمہارے طفیل اس کے دل میں بھی تعلیم کا شوق پیدا ہو جائے۔

بھائی جان کو مختلف زبانیں جاننے اور پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ عربی اور ہندی اسکول میں پڑھی۔ گورمکھی گاؤں میں سیکھی۔ فارسی پر تو جان دیتے تھے۔ نویں جماعت میں ہی سعدی، رومی اور حافظ کے دیوان پڑھ ڈالے۔ گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی نظم فارسی زبان کی تعریف میں ہی لکھی تھی۔ دوستوں سے خط و کتابت بھی فارسی میں ہی کیا کرتے تھے۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ان کے دو بچوں کے نام سعدی اور رومی ہیں۔

میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ سے کیا اور پنجاب بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس زمانے میں کسی مسلمان لڑکے کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اسکول میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت اس وقت کے پنجاب کے وزیر تعلیم عبدالحی صاحب نے کی۔ نوائے وقت کے مدیر جناب حمید نظامی صاحب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ اس جلسے میں بھائی جان نے "الوداع" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ اختتام پر عبدالحی صاحب اور حمید نظامی صاحب کے اصرار پر بھائی جان نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلے کے لیے حامی بھر لی۔

بی۔ اے کرنے کے بعد بھائی جان دہلی چلے گئے اور مجھے بعض حالات کے پیش نظر بمبئی جانا پڑا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور میں کراچی چلا گیا۔ اور جب وہ کراچی میں مقیم ہوئے تو مجھے لاہور میں رہائش اختیار کرنا پڑ گئی۔ ملاقاتیں تو گاہے گاہے ہوتی رہتیں۔ لیکن وہ اسکول کے زمانے کا سا ساتھ نصیب نہ ہوا۔ انہیں پاکستان سے بڑا پیار تھا۔ وہ ملک کی صورت حال سے بے اطمینانی کا اظہار یوں کرتے کہ پاکستان کے مشرق میں سیٹو، مغرب میں سینٹو۔ شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی ہے۔ جائے مفر کسی طرف نہیں۔

لندن میں پاکستان ایمبیسی میں بھائی جان کا عہدہ منسٹر کا تھا لیکن انہیں کئی مہینوں تک کوئی کمرہ نہ ملا۔ وہ کبھی کسی کے کمرے میں اور کبھی کسی کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے رہتے۔ چار مہینوں کے بعد ایک کمرہ نصیب ہوا لیکن وہ بھی کسی ایک کمرے کا حصہ تھا جس میں ان کے علاوہ ان کے پی۔ اے اور اسسٹنٹ بھی بیٹھتے تھے۔ اس کمرے کی سجاوٹ کے لیے کئی ہزار پونڈ کے فنڈ تھے مگر انہوں نے ضرورت کی چیزیں دوسروں سے حاصل کیں جو دوسروں کے پاس فالتو تھیں اور ناکارہ فرنیچر تہہ خانے سے نکلوا کر اپنے کام میں لائے۔ اس طرح انہوں نے ایک پیسہ بھی اپنے کمرے کی سجاوٹ پر خرچ نہ کیا۔

ان کے کاموں میں ایک کام انڈیا آفس لائبریری کی کتب کی مائیکرو فلمیں بنوا کر پاکستان بھیجنا بھی تھا۔ اس کام کے لیے گورنمنٹ نے پہلے سال کے لیے ایک لاکھ بہتر ہزار روپے کا فارن ایکسچینج منظور کیا تھا۔ بھائی جان نے انڈیا آفس لائبریری سے معاملات طے کیے کہ وہ ان کے بدلے میں پاکستان سے اپنی پسند کی فلمیں تیار کروالیں۔ اس طرح انھوں نے پاکستان کی ایک کثیر رقم زرمبادلہ کی صورت میں بچا لی۔

انشاجی کو سرکاری اخراجات پر علاج کی سہولتیں حاصل تھیں، لیکن انہوں نے ایک عام آدمی کی طرح اپنا علاج کرایا۔

زندگی کے سفر میں نہ جانے کتنی محرومیوں کا سامنا ہوا تھا۔ کتنے دکھ جھیلے تھے۔ لیکن کبھی زبان پر نہ لائے۔

کراچی میں دفتر سے نیچے اترے کہ ایک جیپ نے اٹھا کر پھینکا۔ ہسپتال لے جائے گئے۔ ڈاکٹروں نے داخلے کے لیے کہا۔ لیکن نہ مانے۔ بینڈیج کروائی۔ انجکشن لیا اور گھر چلے آئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ دفتر نہ جا سکے تو گھر والوں نے پوچھا تو بخار کا بہانہ کر دیا۔ وہ تو کسی جاننے والے نے چھوٹے بھائی ریاض سے فون پر خیریت دریافت کی اور ایکسیڈنٹ کا حال بھی انہیں صاحب سے معلوم ہوا۔ جب ریاض نے ان سے دریافت کیا تو مسکرا کر کہنے لگے۔ "میں نے سوچا کہ آپ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔"

آخری بار جب بیمار ہوئے تو گھر میں کسی کو خبر نہ دی۔ ایک شام ریاض نے کھانے کے دوران ان کے گلے پر نمودار ہونے والی گلٹی کے بارے میں دریافت کیا تو ٹال گئے اور دانت درد کا بہانہ کر دیا۔ انھوں نے کافی عرصے تک اپنی بیماری کو گھر والوں سے پوشیدہ رکھا تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔

انہوں نے کراچی میں دو آپریشن کرائے۔ ڈاکٹروں نے اس نامراد مرض کی نشان دہی کر دی تھی۔ اب عمر کی نقدی ختم ہوئی۔ نظم بھی لکھی لیکن مجھے اطلاع تک نہ دی۔

پچھلے سال لندن جانے سے پیشتر فروری میں لاہور آئے اور سب سے چھوٹی بہن کی شادی کا بوجھ سر سے اتارا۔

کراچی کو روانگی کے وقت گھر سے رخصتی کا منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ ہر کمرے میں گئے۔ ہر چیز کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ بھائی جان کیا بات ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے! انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور نیچے اتر گئے۔

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں ان کے جانے کے چند روز بعد ہی کراچی چلا گیا۔ وہ کافی کمزور نظر آ رہے تھے تین چار روز سامان کی پیکنگ وغیرہ میں لگ گئے۔ پھر وہ منحوس صبح آگئی جب ہماری آخری ملاقات ہوئی۔ کراچی ایر پورٹ پر مجھ سے ملے اور بولے:

"سردار گرمیوں میں لندن ضرور آنا۔ دیکھنا کنجوسی سے کام نہ لینا" پھر سب گھر والوں سے رخصت ہو کر اندر چلے گئے۔

لندن سے ان کے خطوط ملتے رہے جس میں انہوں نے ہمیشہ اپنی صحت کے بارے میں اطمینان بخش جواب دیا۔ اور لکھتے کہ تم میری صحت کا اندازہ میرے کالموں سے نہیں کر پاتے۔ لیکن ایک خوف تھا جو ہر وقت میرے دل پر طاری رہتا۔

ریاض ہفتے میں ایک دو بار کراچی سے لندن فون پر بات کر لیتا۔ ان کا آخری آپریشن ۱۹ اپریل کو ہوا۔ انہوں نے آپریشن سے دو چار روز پہلے مجھے اور ریاض کو خط لکھا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں پندرہ بیس دن کے لئے لندن سے باہر جا رہا ہوں۔ اس لئے مجھے فون نہ کرنا۔ لیکن اس آپریشن کی اطلاع شہاب اور عالی صاحب کو کر دی تھی۔ شہاب صاحب کو تو وہ اپنا پیر مانتے تھے۔ ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کراچی میں آپریشن کرائے تو ان سے اجازت لی۔ لندن میں آپریشن کرایا تو ان کے مشورے سے۔

یہ آپریشن بہت بڑا اپریشن تھا جس میں ان کی تلی نکال دی گئی۔ ریاض کو کسی نہ کسی طرح اس بات کا علم ہو ہی گیا اور وہ تیسرے دن لندن چلا گیا۔ اس کے ساتھ بھابی اور بچے بھی تھے۔ کیونکہ بھائی جان وہاں اکیلے ہی گئے تھے۔

۲۴ جولائی کو ریاض واپس آیا تو بھائی جان تندرست تھے۔ اس کے بعد ہمیں مختلف ذریعوں سے ان کی صحت کے بارے میں اچھی خبریں ملتی رہیں۔

دسمبر میں ریاض لاہور آیا ہوا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ کراچی سے نادرہ بہن کا فون آیا کہ عالی صاحب سے فون پر بات کر لیں۔ عالی صاحب کو فون کیا تو انہوں نے کہا شہاب صاحب سے بات کریں

شہاب صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ انشا کچھ ڈپریشن محسوس کر رہا ہے۔ ریاض تم فوراً لندن چلے جاؤ۔ ریاض تیسرے دن ہی لندن چلا گیا۔ لیکن مجھے ایک ایسے عذاب میں چھوڑ گیا۔ جو ناقابل بیان ہے۔ ٹیلیفون اور متضاد خبریں۔ ریاض وہاں سے کچھ خبریں دیتا اور بھائی جان کے دوست کچھ۔ کچھ بتاتے تھے کچھ دباتے تھے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ لندن جانے کے لئے کراچی پہنچا۔ وہاں بہنوں اور دوسرے عزیزوں کی حالت غیر تھی۔ ادھر ریاض نے کہا کہ لندن نہ آؤ۔ انہیں ہوش میں آجانے دو۔ پھر آجانا۔

رات کے تین بجے تھے۔ باہر گھنٹی بجی۔ دیکھا عالی صاحب ہیں۔ ماتھا ٹھنکا۔ چپ چاپ ان کے ساتھ اندر آگیا۔ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ اب سوچ رہا تھا کہ یہ بری خبر بہنوں کو کیسے سناؤں۔

دل نہیں مانتا۔ گھر میں جو کمرہ بھائی جان کے لئے مخصوص تھا جس میں وہ لاہور میں قیام کے دوران رہتے تھے۔ مجھے ان کی کمی کا شدت سے احساس دلاتا ہے۔ دکان پر بیٹھا چھت کو گھورتا رہتا ہوں۔ بھائی جان تیزی سے دکان میں داخل ہوتے ہیں۔ سلام دعا ہوتی ہے۔ الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی کوئی کتاب اٹھاتے ہیں اور پھر الماری میں رکھ دیتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں ٹھنڈا یا چائے۔ جواب ملتا ہے ٹھنڈا۔

کونسی بوتل منگواؤں؟

"گنے کا رس"

کراچی سے فون آتا ہے۔ ہاں بھئی کیا کر رہے ہو؟

"کچھ نہیں"

"کچھ کیا بھی کر"

"اچھا جی"

دوسرے دن پھر فون آتا ہے۔

"ہاں بھئی کیا کر رہے ہو؟"

"جی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"

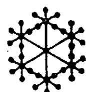
"بڑی اچھی بات ہے"

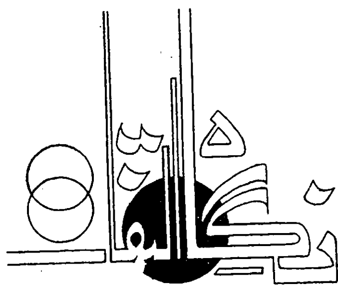
لیکن اب کیسا فون۔ کیسا پیار۔ کیسی نصیحت۔ کس کی رائے۔



(قسط ۱۳)

مُشرّف تمین





وہ ــــ جو صرف ایک محبت پر ایمان رکھتی تھی ــــ جس کے سہارے اس نے جینا سیکھا تھا۔ اور جس کے بل پر وہ بہت اونچا اڑا کرتی تھی۔ اس ایک ذراسی کھچاوٹ نے اس کا ایمان متزلزل کر دیا۔

اس نے ساری دنیا میں ــ سب سے بڑھ کر اپنے باپ کو چاہا تھا۔ اور اسے یقین تھا وہ بھی اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ مگر ــ اب ــ ان کے ایک چھوٹے سے جملے نے اس کی ساری ہستی کو مٹا ڈالا تھا۔ آن کی آن میں وہ اونچی پرواز سے اڑتے اڑتے زخم خوردہ پرندے کی مانند زمین پر آکر ڈھیر ہو گئی تھی۔

سیٹھ اورنگ زیب نے کئی گھنٹے کی مسلسل ناصحانہ گفتگو اور بحث و تکرار کے بعد بالآخر یہ کہہ دیا تھا۔

"تم نے میری محبت دیکھی ہے فیری۔ میری انا اور خودداری نہیں۔ جو اس سے ٹکراتا ہے میں اس سے محبت بھی نہیں کر پاتا۔

محبت بھی نہیں کر پاتا۔

محبت بھی نہیں کر پاتا۔

"یہ کیا کہہ دیا ابو نے؟"

وہ تنہا اپنے کمرے میں پڑی رو رو کر سوچ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب ــــ ابو کی محبت بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے؟؟ ــ ان کی محبت بھی شرطیہ تھی۔ ان کی محبت میں بھی خلوص نہیں تھا ــــ؟ نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں ــ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرے ابو ــ میرے ساتھ دھوکہ نہیں کر سکتے ــ وہ مجھے چاہتے ہیں ــ وہ مجھے اب بھی چاہتے ہیں۔ وہ ــــ مجھے ــ آئندہ بھی چاہیں گے ــ چاہتے رہیں گے ــــ مگر ــــ خدا جانے کیا ہو گیا ہے ان دنوں انہیں ــ کس نے انہیں الٹی سیدھی پٹی پڑھا دی ہے۔ کس نے ہماری محبت کو نظر لگا دی۔ کس نے ہمارے پرسکون گھر میں پریشانیوں اور بے چینیوں کی آگ لگا دی ــ کس نے؟ ــــ کس نے ــ؟

اور بڈھے کرنل توفیق کا عیار اور مکار وجود اس کی نگاہوں میں گھوم گیا ــ یہ ساری شرارت اسی کی تھی۔

ابھی فیری ناصر کی طرف سے ملنے والے ذہنی صدمے کو پوری طرح نہیں بھلا سکی تھی کہ سیٹھ اورنگ زیب نے اس پر ایک نئی افتاد ڈال دی۔

کرنل توفیق کی خواہش ہے کہ تم سے ان کے چھوٹے بیٹے حامد کی شادی ہو جائے۔ وہ ان کی کل جائیداد کا وارث ہوگا۔ ان کی خواہش ہے کہ ہمارے بچوں کے رشتے آپس میں ہو جائیں۔ تاکہ ہمارا کاروبار اور بھی چمک اٹھے۔

فیری نے شادی سے انکار کیا تو کہنے لگے

"ابھی شادی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ صرف انگوٹھی پہنانا چاہتے ہیں"۔

اس نے پڑھائی کا بہانہ بنایا تو بولے۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم زیادہ بڑا فنکشن نہیں کریں گے۔ تمہاری پڑھائی کا مجھے بھی خیال ہے۔ خود کرنل توفیق کو بھی تمہاری تعلیم سے خاص لگاؤ ہے۔ ہمیشہ پوچھتے رہتے ہیں کہ تم کیسی چل رہی ہو۔ کب تک امتحان سے فارغ ہو جاؤ گی۔ کب مکمل ڈاکٹر بن جاؤ گی"۔

وہ چیخ کر بولی۔ "انھیں میری تعلیم سے کیا مطلب؟ وہ کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دلچسپی لینے والے"۔

"بھئی انکی خواہش ہے کہ ان کی بہو ڈاکٹر ہو"۔

"کیوں ــ؟ وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ ان کا بیٹا فارمیسی کی تعلیم پا رہا ہے امریکہ میں"۔

"اچھا ــ تو یہ بات ہے ــ شادی کی آڑ میں وہ کاروبار چلا رہے ہیں آگے ــ"

سیٹھ اورنگ زیب نے جواب دیا۔

"تمہاری یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ مگر ــ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آجکل ہر بڑا بزنس مین اسی انداز میں سوچتا ہے کہ اسکی بزنس کو بھی فروغ ملے ــ اور دیگر معاملات بھی طے ہوتے رہیں"۔

"مجھے نفرت ہے ان باتوں سے۔" فیروزی نے تنفر سے کہا۔
"مگر تم ہر چیز سے نفرت نہیں کر سکتیں میرے بیٹے۔"
"بہرحال۔ مجھے کرنل توفیق کا فیصلہ قطعاً منظور نہیں۔" فیروزی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
"یہ میرا بھی فیصلہ ہے۔ صرف کرنل توفیق کا نہیں۔"
"مجھے اس میں سے اس کی بو آ رہی ہے۔ میں اپنے ابو کی پسند اور اسٹینڈرڈ کو خوب سمجھتی ہوں۔"
"ہاں۔ مگر تم اپنے باپ کی بعض مجبوریوں اور خامیوں کو نہیں جانتیں۔ تم کو نہیں معلوم کہ اس کاروبار کی ساری چمک دمک کرنل توفیق کے وجود سے ہے۔"
"یوں کہیئے کہ کرنل توفیق کے ناپاک وجود سے آپ کا سارا کاروبار بھی پاکیزگی کی عظمتوں سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔"
سیٹھ اورنگ زیب دھاڑے۔
"فیروزی — کس نے کی ہیں یہ سب باتیں تم سے —؟"
"کون کرتا؟ آپ نے کبھی بتائی ہیں کسی کو یہ باتیں جو کوئی مجھے بتاتا؟؟"
"یہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں — کہ جب میں اپنے کاروباری معاملات کو گھر تک نہیں لانا چاہتا تو تم کیوں دخل اندازی کر رہی ہو — کہیں یہ — اس نامعقول علی کی شرارت تو نہیں؟ مجھے سچ سچ بتاؤ فیروزی تاکہ میں اس کا ابھی سے قلع قمع کر کے رکھ دوں۔"
علی کے نام پر فیروزی کے کان کھڑے ہوئے اور شاید — اسے پہلی بار — علی سے سچی ہمدردی اور لگاوٹ محسوس ہوئی۔
جلدی سے بولی۔
"علی؟ علی کہاں سے آ گیا —؟؟"
"اس لئے کہ علی ہی ایک نیا وجود ہے جو میری کاروباری ذمہ داریوں میں ملوث ہوا ہے — اور اگر وہ اتنا ذلیل، درکمینہ ثابت ہو رہا ہے تو میں اسے ٹھکانے لگانا جانتا ہوں۔"
"جی نہیں ابو — میرا غصہ اس پر نکالنے کی ضرورت نہیں۔ میری سزا مجھے ہی دیجئے۔" وہ سانس لینے کو رکی اور پھر بولتی ہی چلی گئی۔
"اس لئے — کہ میں — بہت پہلے سے یہ خدشہ محسوس کر رہی تھی کہ — کہیں کوئی غلطی ضرور ہے آپ کے کاروبار میں — آپ کی اکثر و بیشتر ٹیلیفون پر ہونے والی گفتگو نہ چاہتے ہوئے بھی کان میں پڑ جاتی تھی — مگر — میں نے کبھی آپ سے کوئی باز پرس نہ کی — اس لئے کہ مجھے آپ سے اندھی محبت ہے — میں آپ کو اپنے سامنے شرمندہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی تھی — میں اپنے شعور اور اپنے ضمیر کی آواز کو دباتی رہی۔ اسلئے کہ مجھے وقت کا انتظار تھا — میں سوچ رہی تھی کہ میں جب ڈاکٹر بن جاؤں گی — تو — ہم اپنی ایک چھوٹی سی دنیا الگ بسا لیں گے — جہاں محبتیں ہوں گی — پاکیزگی ہو گی اور میری محنت کی کمائی ہو گی — مگر آپ کا یہ عیار پارٹنر — رفیق — آپ کی بیٹی کو بھی خریدنے کے درپے ہے اور آپ — آپ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ابو —؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟؟"
فیروزی نے سیٹھ اورنگ زیب کو جھنجوڑ ڈالا۔
اور — اب
اورنگ زیب نے بھی اسے سینے سے لپٹا لیا۔
"میری بیٹی۔ میری بچی۔ تو کتنے صبر اور کتنے ظرف کی مالک ہے۔ بالکل اپنی جنتی ماں کی طرح — مگر — میری جان — تو اتنا بہت جاننے کے باوجود بھی بہت کچھ نہیں جانتی — تو اپنے باپ کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتی۔ اور — میں — تجھے سب کچھ بتا کر پریشان کرنا بھی نہیں چاہتا۔"
مگر —
فیروزی کے اصرار پر آج سیٹھ اورنگ زیب نے اسے اپنا زخم خوردہ سینہ کافی حد تک کھول کر دکھا دیا۔ اور تب فیروزی کو معلوم ہوا کہ وہ کس دور سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ مقروض تھے۔ دوسری طرف کاروباری پیچیدگیوں میں اسطرح الجھے ہوئے تھے کہ بغیر کرنل توفیق کی اعانت کے آگے بالکل آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ کرنل توفیق نے ان کے مل میں اور فیکٹریوں میں — ہر طرف اپنے آدمی بھرتی کر لئے تھے — اور — ستم بالائے ستم یہ کہ پچھلے دنوں ان کا ایک باربردار جہاز جو سامان لیکر آ رہا تھا، سمندر میں ڈوب گیا تھا۔

اتنی ساری پریشانیاں اور پھر ان کی اکیلی ذات ۔ اور پھر ۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی تھی ۔ بلکہ کالا دھن، بلیک مارکٹنگ اور اسمگلنگ کا جو دھندا کرنل توفیق نے شروع کیا تھا ۔ اس میں صرف سیٹھ اور تنگ زیب ہی قانون کی گرفت میں آ سکتے تھے ۔

اور ۔

یہ وہ نکتہ تھا جس پر آ کر فیری کی ساری کی ساری قوت مدافعت سلب ہوتی نظر آ رہی تھی ۔

کرنل توفیق جیسے شاطر انسان کو سیٹھ اور تنگ زیب اپنے کاروبار کی مجبوریوں کے واسطے میں خوش رکھنا چاہتے تھے ۔ اور فیری کی ان کے بیٹے حامد سے شادی ہو جانے کی صورت میں ان سے بدی کی توقع کم ہو جانے کی امید تھی ۔

مگر ۔

کتنی بڑی تھی یہ قیمت ۔

کتنی کڑی تھی یہ آزمائش ۔

ساری زندگی کا سودا تھا یہ !

وہ رو رو کر سوچ رہی تھی ۔ اور ۔ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی ۔

"میں کیا کروں ؟ کیسے اپنی زندگی بیچ دوں ۔ ؟ ابو کی آن اور ۔ ساکھ یہ ؟ ؟ لیکن ۔ اگر میں انکار کرتی ہوں تو ابو پر کیا گزرے گی ۔ انہیں ۔ پہلے ہی ڈر ہے کہ کہیں یہ کاروباری بحران ان کا دماغی توازن نہ خراب کر دے ۔ اور نہ وہ کچھ خودکشی وغیرہ کا ذکر بھی تو کر رہے تھے ۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ۔ اگر کرنل توفیق چاہے تو خرد برد کے سارے الزامات ان کے سر لگا کر خود صاف بچ نکل سکتا ہے ۔ یہی نہیں ۔ وہ کاغذی کارروائی کی رو سے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگوا کر خود ایک کثیر رقم کا مالک بن سکتا ہے ۔

اور ۔ اور ۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو ۔ میں کچھ کھا کر سو رہوں گا ۔

وہ پھر رونے لگی

"تو میں کیا کروں ۔ خدایا ۔ میں کیا کروں ۔ تو مجھے موت دے دے ۔ مگر ۔ نہیں ۔ موت ان مسائل کا حل تو نہیں بن سکتی میرے بعد میرے ابو پر جانے کیا کیا بیت جائے گی ۔ نہیں ۔ مجھے اپنے ابو کو اس بھنور سے نکالنا چاہیئے ۔ ہاں ۔ کوشش تو کرنی چاہیئے ۔ کوشش ۔"

وہ جانے کب سوئی ۔

صبح اٹھی تو کالج جانے کو بھی دیر ہو چکی تھی ۔ ویسے بھی آجکل وہ کالج اور ہسپتال سے بہت غیر حاضر رہنے لگی تھی ۔

اور

اس کی اس غیر حاضری پہ نہ صرف گھر والے ۔ بلکہ کالج میں اس کی دوست اور استاد بھی حیران و پریشان تھے ۔

مگر جو بھی اسے کچھ کہتا ۔ وہ جواب میں یہی کہہ دیتی تھی ۔

"میں کیا کروں ۔ مجھے پڑھنے کا شوق نہیں رہا ۔"

"پڑھنے کا شوق نہیں رہا ۔" تو چلیئے ۔ کہیں گھوم آتے ہیں ۔"

پلٹ کر فیری نے دیکھا ۔ جیسے وہ گوشی سمجھ رہی تھی وہ گوشی نہیں ۔ علی تھا ۔

وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھنے لگی ۔ یہ کس بے تکلفی سے بول رہا ہے !

"آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب ۔ ؟ جانتی ہیں ۔ فائنل ایئر ہے یہ آپ کا ۔ اور آپ کو پڑھنے کی جگہ رونے کا شوق ہو گیا ۔ آخر کیوں ۔ ؟"

فیری کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں ۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ۔

"کیوں پوچھتے ہو ؟ تمہیں نہیں پتہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے ۔ ؟ ؟"

علی کا دل جیسے اس کے آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلا ۔ کہاں وہ چٹان جیسی مضبوط لڑکی فیری ۔ اور کہاں یہ بسور بسور کر رونے والی معصوم سی بے بس بچی ۔ اسے جانے کیا ہوا ۔

ایکدم اتنا جذباتی ہوگیا۔ کہ آگے بڑھا۔ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی جگہ سے اٹھایا اور ساتھ لیکر چل دیا۔

"آئیے ـــ ڈاکٹر صاحب ۔ آج ۔ میں آپ سے باتیں کروں گا۔ آئیے۔"

اس نے کار میں فیبری کو بٹھایا ۔ اور ہوا ہوگیا۔ گیٹ کے قریب گوشی کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اشارے سے پوچھا بھی کہاں جا رہے ہو۔ مگر علی نے صرف خداحافظ کہہ کر ہاتھ لہرا دیا۔ رُکا نہیں۔ نہ ہی گوشی کو ساتھ چلنے کے لئے دعوت دی۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب ـــ اب آپ مجھے بتائیے۔ آپ کو ہوا کیا ہے؟" علی نے نسبتاً ایک سنسان سی سڑک پر پہنچکر سوال کیا۔

وہ جل کر بولی۔

"اس گھر میں رہتے ہو۔ ایک ایک بات دیکھتے ہو۔ جو نہیں دیکھ پاتے ۔ وہ گوشی جا کر جڑ دیتا ہے ـــ اور پوچھتے مجھ سے ہو کہ کیا ہوا۔"

"آپ کی بات کسی حد تک صحیح ہے۔ تقریباً سبھی کچھ جانتا ہوں اور دیکھتا رہتا ہوں ـــ نہ کبھی آپ نے یہ حق دیا اور نہ میں نے مانگا کہ میں ـــ کچھ عمل دخل دوں۔ گوشی کا معاملہ اور تھا۔ اس نے شروع ہی سے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ پھر یہ کہ وہ چھوٹا تھا اور لڑکا تھا۔ اس سے دوستی بڑھاتے ہوئے مجھے محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اور مجھ سے؟"

"آپ سے؟ آپ سے دوستی تو دور کی بات ۔ بات کرتے بھی محتاط رہتا تھا ـــ مگر خیر۔ جانے دیجئے تب کی بات ـــ اب کی بات کرتے ہیں ـــ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کب تک رو رو کر خود کو ہلکان کریں گی؟"

"کب تک؟" وہ پھر رونے لگی "یہ تو ساری زندگی کا رونا گلے پڑ رہا ہے۔"

"ارے چھوڑیئے ڈاکٹر صاحب ۔ آج کل لوگوں کی شادیاں زندگی بھر کا بندھن ثابت نہیں ہوتیں۔ آپ آپ ایک معمولی سی انگوٹھی کو روگ بنا رہی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"صاف بات ـــ انگوٹھی تو آپ پہلے سے پہنے ہوئے ہیں ـــ وہی آپ کی ـــ پلاٹینم کی انگوٹھی ـــ یاد ہے۔"

"کیا۔ کیا ـــ؟؟"

"اوہ ـــ اچھا چلئے۔ فی الحال اس انگوٹھی کی بات نہیں کرتے ـــ مصیبت والی انگوٹھی کی بات کرتے ہیں ـــ ٹھیک ـــ؟"

"اس کا مطلب ہے گوشی نے تمہیں سب کچھ بتا رکھا ہے۔"

"جی ہاں سب کچھ۔ بلاکم و کاست ۔ اور آپ ۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ خود کو بھی اور اپنے سادہ لوح باپ کو اس تمام جھمیلے سے نکالتی ہیں۔"

"میں ـــ میں جو اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ ابّو کیلئے کیا کر سکتی ہوں ـــ ایک اپنی جان ہے۔ کاش جان دیکر میں اپنے ابّو کے کام آسکتی۔"

"لاحول ولا ـــ یہ تو آپ کبھی بھول کر بھی نہ سوچئے گا۔ آپ کی جان ان کے کس کام آئے گی؟ ہاں ـــ آپ کی زندگی ان کے لئے ایک بڑا اثاثہ ہے۔ بشرطیکہ آپ اپنی سوچ کا انداز بدل لیں۔"

"میں اتنی اہم ہوں نہ اتنی خوش نصیب ـــ تم میرا دل بہلا رہے ہو علی۔"

"جی نہیں ـــ میں آپ کو بہلا نہیں رہا ہوں۔ بلکہ آپ سے حقیقت بیان کر رہا ہوں ـــ آپ نے بدنصیبیاں اور محرومیاں دیکھیں ہی نہیں ـــ آپ جسے بہت بڑا دکھ سمجھ رہی ہیں یہ محض وقتی پریشانیاں ہیں ـــ اور بس۔"

"کسی کی ساری زندگی بھینٹ چڑھ رہی ہے اور تم اسے وقتی پریشانی کہہ کر ٹال رہے ہو۔ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"آپ کو سمجھا رہا ہوں ڈاکٹر صاحب ـــ کہ ـــ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ـــ کرنل توفیق کی چالبازیوں کا جواب یہ نہیں کہ آپ یا آپ کے والد صاحب ـــ خودکشی کرلیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آپ لوگ بھی اس کا مقابلہ ڈٹ کر کریں ـــ اور ـــ اسی شاطرانہ انداز میں ـــ جیسے وہ آپ سے کر رہا ہے ۔ میں نے ـــ چند روز آپ کے کاروباری معاملات کا جائزہ لیا ہے اور ـــ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ لوگوں کی سادگی کا کرنل توفیق نے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے اس نے ہر طرح سے آپ لوگوں کو گھیر رکھا ہے۔ آپ اس

تمام جھمیلے سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور بعد میں حل کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ: کرنل توفیق کا اعتماد قائم رکھا جائے۔ اسے ایک لمحہ کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیں کہ ہم نے اسکی کسی عیاری کو سمجھ لیا ہے۔"

"علی ــ تم تو اور بھی خوفناک انداز میں بات کر رہے ہو۔ بالکل اس طرح جیسے محکمۂ جاسوسی سے تعلق رکھتے ہو"

شاید کبھی کرنی بھی پڑ جائے یہ نوکری۔ آخر وہ لوگ بھی تو ہماری طرح کے ہی انسان ہوتے ہیں۔ جو ان محکموں میں کام کرتے ہیں۔"

علی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ مگر اس کی مختصر سی باتوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ فیڑی کے دل کو ایک ڈھارس سی بندھ گئی۔

بظاہر اس نے کرنل توفیق کے بیٹے حامد سے منگنی کی حامی بھر لی تھی۔ مگر ــ

اس کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ خود دل جمعی سے اپنی تعلیم حاصل کر سکے اور علی حسب وعدہ کاروباری پیچیدگیوں کو اپنی گرفت میں لے لے۔

اور ــ یہی وہ نکتہ تھا جس پر آ کر ــ علی نے فیڑی کے دل و نظر میں ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا تھا۔

O

وقت کا دھارا بہتا چلا جاتا ہے۔ کوئی خوشیوں کے جھولے جھولے تب اور کوئی غموں کی تہوں میں لپٹا چلا جائے۔ تب وقت کا کام آگے اور آگے ہی بڑھنا ہے۔

ماہ و سال نے ایک اور کروٹ لی تو گوشی کالج میں پہنچ چکا تھا۔ فیڑی نے ڈاکٹری کا آخری سال بھی پاس کر کے ہاؤس جاب شروع کر دیا تھا۔ اور علی اب اپنا ایم اے کلیئر کر کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

کرنل توفیق کی چالبازیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب اس کی خواہش تھی کہ فیڑی جلد از جلد اپنا پرائیویٹ کلینک شروع کر دے۔ مگر فی الحال جب تک اس کا ہاؤس جاب مکمل نہ ہوتا وہ نہ سروس کر سکتی تھی نہ پرائیویٹ پریکٹس۔

ادھر علی دن رات اس فکر میں لگا رہتا تھا کہ کسی طرح سیٹھ اور رنگ زیب کو نہ صرف کرنل توفیق کی چالبازیوں سے آگاہ کر دے۔ بلکہ انھیں اسکے شکنجے سے آزاد بھی کرائے۔

مگر ــ

قسمت تو سیٹھ اور رنگ زیب کے لئے ایک اور ہی دکھ لئے بیٹھی تھی ــ ان کی تو ابھی کمر ٹوٹنی تھی۔ ان کو تو ابھی اپنے جگر گوشے کا لاشہ اٹھانا تھا۔

گوشی

ان کا لاڈلا ــ

ان کا چہیتا ــ

ان کا دُلارا ــ

آنکھ کا تارا ــ

گوشی ــ

پلک جھپکنے میں ان کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔

ہنستا کھیلتا صبح کو کالج جانے کے لئے گھر سے روانہ ہوا۔

جاتے جاتے علی سے ہنستا بولتا گیا۔ فیڑی سے چھیڑ خانی کرتا رہا اور کالج پہنچ کر بولا

"استاد۔ تم مجھے لینے مت آنا ــ آج ــ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ میچ دیکھنے جاؤں گا ــ تم بس آپا کو ہسپتال سے لے لینا"

فیڑی آجکل ہسپتال میں ڈیوٹی پر زیادہ رہتی تھی۔ کبھی کبھار اپنی کسی دوست سے ڈیوٹی بدل کر یا پروفیسر سے کہہ کر گھر رہنے کو آ جاتی تھی۔

اور یہ ــ آج کا دن بھی انہی بدنصیب دنوں میں سے ایک تھا کہ فیڑی ہسپتال سے گھر آ رہی تھی۔

اس نے راستے میں ایک جگہ لوگوں کا مجمع بھی دیکھا۔ سڑک پہ خون کے دھبے بھی دیکھے۔ علی نے اتر کر دریافت بھی کیا کہ کیا

ہوا ہے۔ مگر وہ صرف اتنا جان سکا کہ ایک سوزوکی وین سے ایک اسکوٹر کی ٹکر ہو گئی اور لوگ زخمیوں کو ہسپتال لے جا چکے ہیں۔

گھر پہنچ کر کتنی ہی دیر بعد ہسپتال سے فون آیا کہ گوشی ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔

فون سٹر فونے اٹھایا تھا۔ اور بات فیری نے کی تھی ۔۔ مگر جیسے کوئی چیز اندر سینے میں "کھٹ سے علی کے ٹوٹ گئی تھی۔

کوئی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"گوشی زندہ نہیں ہے۔ گوشی زندہ نہیں رہے گا۔ تمہارا تین دن پہلے والا خواب سچا تھا ۔۔ سچا تھا ۔۔ یہ اس کی تعبیر ہے۔

علی نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی ۔۔ اور خود کو سنبھالا۔ روتی تڑپتی فیری ۔۔ اور لرزتے کانپتے اورنگ زیب کو لیکر جانے کیسے وہ کار چلاتا ہوا ہسپتال پہنچا۔

گوشی لٹھے کی طرح سفید۔ سامنے جیسے زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر کان شاید ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ تب ہی اس نے فیری کی آواز پر فوراً جواب دیا

"تم آگئیں آپا ۔۔ آپا ۔۔ تم نے بہت دیر کر دی۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں ۔۔ میں ٹھیک ہوں ۔۔ آپا ۔۔ مگر ۔۔ میں ۔۔ بچوں گا نہیں ۔۔"

"گوشی ۔۔!" فیری تڑپ اٹھی۔ اس وقت وہ اپنی ساری ڈاکٹری بھول چکی تھی اور صبر و تحمل کے تمام اصول اس نے پس پشت ڈال دیئے تھے۔ وہ گوشی سے لپٹ گئی۔

قریب کھڑے ڈاکٹروں نے اسے ہٹانا چاہا تو گوشی نے بھی ٹوک دیا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ میری بہن ہے ۔۔ اسے مجھ سے آخری وقت میں دور نہ کیجیے۔ آپا ۔۔ میں جا رہا ہوں۔ ابو کا خیال کرنا بہت

بے اختیار علی اور اورنگ زیب آگے بڑھے۔ اور گوشی نے ان کی سسکیاں پہچان لیں۔

"آپ بھی آئے ہوئے ہیں ابو؟ آپ مجھے پیار کیجیے ابو"

"میرے بیٹے۔ میرے بچے" اور اورنگ زیب نے گوشی کے خون آلود اور پٹیوں میں جکڑے ہوئے چہرہ کو جھک کر چوم لیا۔ اور ڈاکٹر انہیں وہاں سے ہٹانے لگے ۔۔ وہ اسے انجکشن پر انجکشن لگا رہے تھے۔

خون کی بوتلیں چڑھا رہے تھے۔

مگر ۔۔ اب ۔۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ خون بہت ضائع ہو چکا تھا۔ اور اب بھی ۔۔ رکا نہیں تھا۔ اس کا سارا جسم زخمی تھا۔ اور خاص طور پر ٹانگیں بری طرح کچلی جا چکی تھیں۔

اچانک گوشی نے آواز دی

"استاد۔ آپ کدھر ہیں ۔۔ میرے قریب آئیے۔"

بھرائی ہوئی آواز میں علی نے کہا

"میں یہیں ہوں گوشی میاں ۔۔ آپ کے پاس۔"

"استاد ۔۔ بہت دن میں نے آپ کو استاد اور آپ نے مجھے گوشی میاں کہا۔ آج مجھے چھوٹا بھائی کہیئے اور میں آپ کو بھائی جان کہوں گا۔"

"آپ میرے پیارے بھائی، عزیز ترین دوست اور بہت کچھ ہیں میرے چاند سے بھیا۔"

"ہاں۔ یہ بات ہوئی نا اور اب ۔۔ میں آپ کو بتاؤں بھائی جان ۔۔ میں ۔۔ میں بڑی سخت تکلیف میں ہوں بھائی جان ۔۔ مگر مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میں آپ پر ۔۔ اپنی ساری ذمہ داری ڈال کر جا رہا ہوں بھائی جان۔ آپ کو میرے ابو ۔۔ میری دادی اماں۔ اور میری آپا ۔۔ سب کا خیال کرنا ہوگا۔ مجھے پتہ ہے آپ کریں گے۔ اور ۔۔ اسی لئے ۔۔ میں اطمینان سے مر رہا ہوں بھائی جان آپ پر مجھے بہت بھروسہ ہے بھائی جان ۔۔ اور اگر میری آپا راضی ہوں ۔۔ تو ۔۔ تو ۔۔ آہ ۔۔ خدا ۔۔ خدا ۔۔ خدا ۔۔ یا ۔۔"

جیسے اس کے جسم کا آخری قطرہ خون بھی نکل گیا۔ اور زندگی کا ناطہ ایک لمحے میں ٹوٹ گیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

ہاں۔
پھر کیا ہوا ۔ ؟؟
ایک قیامت ٹوٹ پڑی !
ایک زلزلہ آ گیا !!
ایک پورا گھرانہ اُجڑ گیا !!!

نہ دادی اماں زندہ لوگوں کی طرح زندہ رہیں ۔ نہ سیٹھ اورنگ زیب اور نہ فہمیدہ ۔ حتیٰ کہ خود علی کو بھی جیسے جیتے جی موت آ گئی۔
ہر دم ۔ ہر گھڑی ایک ہی خیال، ایک ہی یاد ۔ ایک ہی تصویر ۔ ان کے تصور میں بسی رہتی تھی ۔ اور وہ تصویر تھی گوشی کی۔
ہنستا ۔ مسکراتا ۔ گوشی۔
دادی اماں کا چہیتا اور لاڈلا گوشی۔
ان کی زندگی سے کیا نکلا ان کو زندہ درگور کر گیا۔
اب ان کی زبان پر بس ایک ہی کلمہ تھا۔
"مرنے کے دن میرے تھے ۔ اور چلا گیا تو ۔ ہائے تو کہاں چلا گیا۔ تو کیوں روٹھ گیا۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا ۔ جواں مرگ کہ تجھ پہ جان فدا کرنے والی دادی اماں کیسے زندہ رہ لیں گی ۔ الٰہی! میری یہ سزا بخش دے ۔ مجھے اپنے پاس بلا لے ۔ اپنے پاس بلانے"
مگر مانگنے سے نہ زندگی ملتی ہے ۔ نہ موت آتی ہے۔
ہاں البتہ جیتے جی موت سے بڑھ کر موت کا سامنا کتنے ہی لوگوں کو کرنا پڑ جاتا ہے۔ اور ان ہی میں سے ایک تھے اورنگ زیب ۔ جو منہ سے کچھ نہیں کہتے تھے۔
مگر۔
جانے کیا ڈھونڈتے رہتے تھے خلاؤں میں۔
انہیں ایک چپ لگ گئی تھی ۔!
کاروبار سے بے نیاز
زندگی کی ہر دلچسپی سے لاتعلق
اور ۔ اپنے آپ میں گم !
گوشی کی موت نے واقعی ان کو جیتے جی مار ڈالا تھا۔
فہمیدہ ان کو سمجھانے کی کوشش کرتی ۔ یا علی ان کا غم غلط کرنا چاہتا تو ان کے پاس ہر ایک کی بات کا بس ایک ہی جواب ہوتا تھا ۔ "جس کا جوان بیٹا مر جائے ۔ بھلا وہ زندہ ہوتا ہے ؟"
بھلا وہ بھی زندہ ہوتا ہے ؟؟"
نہیں ۔ وہ زندہ نہیں ہوتا ۔ مگر ۔ اسے زندہ تو رہنا پڑتا ہے ۔ زندگی گزارنی تو پڑتی ہے ۔ علی ان سے کہتا۔
"ہاں ۔ تم ٹھیک کہتے ہو علی ۔ زندگی واقعی گزارنی پڑتی ہے ۔ تب ہی تو میں بھی گزار رہا ہوں ۔ تم دیکھتے نہیں ۔ میں زندگی گزار رہا ہوں ۔ گوشی چلا گیا ۔ وہ مر گیا ۔ اسے اس دنیا سے رخصت ہوئے کتنے سارے دن گزر گئے ۔ اور ۔ میں نے یہ دن اسی دنیا میں گزار دیئے ۔ تم دیکھتے ہو نا ۔ میں کتنے سارے دن گزار چکا ہوں ۔ اور ۔ ابھی نہ جانے کتنے اور دن گزارنے پڑیں گے۔
ان کی باتیں سن کر علی کا اپنا دل رو پڑتا تھا ۔ وہ لاجواب سا ہو جاتا مگر ۔ پھر ان کی کاروباری ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی عدم دلچسپی ہی سے کرنل توفیق کی ساری دلچسپیاں وابستہ تھیں۔ وہ کاروبار پر خود بھی چھاتا جا رہا تھا اور اپنے خاص الخاص آدمیوں کو بھی آگے بڑھا رہا تھا۔
مگر۔
مشکل یہ تھی کہ اب اورنگ زیب کسی کی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف

گوشی کی موت نے فیری کو ایک اور ہی انداز میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

اسے ساری دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ خود اپنے ہم پیشہ ڈاکٹروں سے بھی اس کی اَن بن رہنے لگی تھی۔ وہ خود بخود بیٹھے بیٹھے کبھی رونے لگتی۔ کبھی اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹنے لگتی اور پاگلوں کی طرح کہنے لگتی۔

"کس کام آئی؟ کس کام آئی میری ڈاکٹری؟؟"

اس کی دوست اگرچہ اس کا بیحد خیال رکھتی تھیں۔ وہ اکثر و بیشتر اس کے گھر آتی رہتی تھیں اسے تسلی دلاسہ دینے کی کوشش کرتیں۔

مگر ـــ فیری کی سوچ کا رُخ نہیں بدلتا تھا۔

"میں ڈاکٹری نہیں کروں گی ـــ نہیں کروں گی ـــ مجھے نہیں چاہیئے یہ ڈگری اور یہ پیشہ"

وہ اپنے ہسپتال کے فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی منحرف ہو گئی تھی۔

ابتدا میں اس کے پروفیسر اور ساتھی ڈاکٹر ہر طرح اس کا خیال کرتے رہے۔ اسے مراعات دیتے رہے۔ مگر ان کی نرمی سے فیری کی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ہسپتال کے ڈیوٹی کے اوقات بہت کم وہ کر سکی تھی۔ اور جب ہسپتال جاتی بھی تو سارا وقت رونے دھونے میں ہی گزار دیتی تھی۔

اور صرف فیری پر ہی کیا منحصر تھا ـــ گھر کے ہر فرد کو گوشی کی موت نے اُداسیوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔ فضلو جیسا پہاڑ سے دل والا بوڑھا ـــ اور شرفو جیسا لاپرواہ اور سنگدل انسان گوشی کے لئے ایک ہی انداز میں روتے تھے ـــ یہی حال ـــ مالی ـــ خانساماں اور اس کی بیوی زینب کا تھا ـــ کہ ہر دم ـــ ہر گھڑی ـــ گوشی کی یاد ان سے ٹھنڈی آہیں بھروایا کرتی تھی۔

مگر

علی کی کیفیت ـــ ان سب میں رہتے ہوئے بھی ان سب سے جدا تھی۔

وہ گوشی کو سب سے زیادہ یاد کرنے کے باوجود ـــ اس کے لئے بیٹھ کر رو نہیں سکتا تھا۔

اسے احساس ذمہ داری نے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

کبھی دادی اماں۔ کبھی اورنگ زیب۔

کبھی فیری اور کبھی وہ خود

کبھی آنے والے مہمان۔ کبھی گھر میں موجود نوکر چاکر۔ اس کی توجہ چہار طرف لگی رہتی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر ـــ کرنل توفیق ـــ اور اس کی سازشیں جن کی طرف سے اورنگ زیب اور فیری نے آنکھ بند کر لی تھی ـــ اور جو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔ کرے تو کیا کرے ـــ؟

کہے تو کس سے کہے ـــ؟؟

خصوصاً پچھلے چند روز سے تو اس نے ایک عجیب بات محسوس کی تھی ـــ جیسے ـــ کرنل توفیق ـــ اس کو اس گھر سے اڑوا دینے کے درپے ہوں۔

اور ـــ

یہ بات ایسی نہیں تھی جسے وہ نظرانداز کر دیتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر کرنل توفیق نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ علی کو اس گھر سے نکلوا دیں ـــ تو وہ ضرور اپنے اس ارادے کو عملی جامہ بھی پہنا کر رہیں گے ـــ اور پھر ـــ علی کے لئے ـــ سوائے اس کے اور کوئی مفر نہیں ہو گا کہ خاموشی سے اس گھر سے چلا جائے ـــ کیونکہ اورنگ زیب نے تو ان دنوں سارے معاملات کلی طور پر کرنل توفیق کے ہاتھ میں دے رکھے تھے۔

اب ـــ وہ کرے تو کیا کرے ـــ؟

فیری بھی ان دنوں اس سے دور رہتی تھی۔ اب زیادہ تر وہ خود ہی کار ڈرائیو کرتی تھی ـــ اور علی کا زیادہ وقت دفتر میں گزرتا تھا۔ جہاں اس کی آنکھوں کے سامنے سازشوں کے جال بکھیرے جا رہے تھے اور وہ ایک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

مگر ـــ کب تک ـــ

بالآخر اس نے یہ جمود توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔
اس نے فیری سے کھل کر اور دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔
"شرفو۔ فیری بی بی سے کہو۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"
"تو جی۔ آپ جا کر مل لیں ان سے۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہیں۔"
"نہیں بھئی۔ ایسے نہیں۔ تم ان سے اجازت لے کر آؤ۔ آج کل وہ مجھ سے بات نہیں کرتیں۔"
"اچھا جی ۔۔۔؟" شرفو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد آ کر بولا۔
"وہ پوچھتی ہیں کیا بات ہے؟"
"بہت ضروری بات ہے۔"
"تو جی آپ مجھے بتا دیں۔ میں ان سے کہہ دوں گا۔"
"ایسے کام نہیں چلے گا شرفو۔ بہت لمبی بات ہے۔"
اسی وقت فیری سامنے آ کھڑی ہوئی۔
"کیا بات ہے علی۔ تم نے مجھے بلایا تھا؟" غموں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری اور علی کا دل بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔
"جی ہاں ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ سرو قد کھڑا ہو گیا۔
"مجھ سے؟ ۔۔۔ نہیں علی ۔۔۔ میں تم سے بات نہیں کر سکتی۔"
"وہ کیوں ڈاکٹر صاحب ۔۔۔؟ وہ کیوں؟؟"
فیری کی آنکھیں ایکدم چھلک پڑیں۔
"تم نہیں جانتے؟ تم ۔۔۔ میرے بھائی کے پیارے ترین دوست رہے ہو ۔۔۔ علی ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ تمھیں دیکھتی ہوں ۔ تمہاری آواز سنتی ہوں ۔۔۔ تو ۔۔۔ گوشی ۔۔۔ کی یادیں ۔۔۔ گوشی کی باتیں ۔۔۔ گوشی کی شرارتیں ۔۔۔ سب ہی کچھ نظروں میں گھومنے لگتا ہے ۔۔۔ میرا گوشی ۔۔۔ میرا پیارا بھیا ۔۔۔ میرا گوشی۔
وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونے لگ گئی۔
علی کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبالب بھر آئیں ۔۔۔ مگر وہ جذبات کی کشمکش میں خاموش رہا۔
چند ثانیے بعد اس نے جیسے کنویں کی گہرائیوں سے آواز نکالی۔
"ڈاکٹر صاحب۔ گوشی کس کو پیارا نہیں تھا۔ کوئی ایک انسان بھی تو ایسا نہیں جسے وہ یاد نہ آتا ہو ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ آپ کا ۔۔۔ میرا تو اس سے رشتہ ہی اور تھا۔ آپ کا وہ خون تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ میری شاید وہ جان تھا۔"
علی ایک لمحے کو رکا۔ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔
"گوشی مجھے اتنا عزیز کیوں تھا؟ ۔۔۔ اور ۔۔۔ اس کی جدائی نے مجھ پر کیا قیامت ڈھائی؟ ۔۔۔ اگر آپ کو میں یہ بتا دوں تو شاید آپ کو اپنا غم اتنا ناقابل برداشت نہیں لگے گا۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم علی۔"
"میں آپ سے یہی بتا رہا ہوں ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے قبل کہ آپ سے بات کرنے کا موقع میرے ہاتھ سے جاتا رہے پلیز ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ مجھے کچھ وقت دیجئے۔"
فیری اپنا رونا دھونا بھول کر اسے تکنے لگی۔
"یہ کیسی خوفناک قسم کی باتیں کر رہے ہو تم؟
"میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا ۔۔۔ نہ ہی اس میں پریشانی کی کوئی بات ہے ۔۔۔ میرا وجود ۔۔۔ یا عدم وجود ۔۔۔ آپ کے اور آپ کے اس گھر کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا ۔۔۔ مگر ۔۔۔ خود ۔۔۔ میرے لئے ۔۔۔ یہ گھر اور اس گھر کے افراد ۔۔۔ بڑی اہمیت اور بڑی قیمت کے حامل ہیں۔"

"خدا کے لئے علی۔ کھل کر بات کرو۔۔ تم کس طرف اشارہ کر رہے ہو؟"

"میں آپ کو آپکی ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ آپ۔۔ اور آپ کے ابو۔ اپنے غم میں لگ کر یہ بھول گئے ہیں کہ دنیا میں رہنے کے لئے۔۔ بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے غم کے پہاڑ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ گوشی جیسا ہیرا چھن کر بھی یہ دنیا آپ کے بدخواہوں سے پاک اور مبرا نہیں ہو گئی۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ علی۔۔ صاف بات کرو۔"

"میں یہ بتا رہا ہوں کہ جیسے ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔ اسی طرح۔۔ ہر دوست دوست نہیں ہوتا۔ آپ کو اور سیٹھ صاحب کو۔۔ اپنا کاروبار اچھا پڑا۔۔ بہر حال خود ہی دیکھنا چاہیئے۔۔ ایک طرف سیٹھ صاحب نے سارا کاروبار دوسروں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔۔ دوسری طرف آپ۔۔ اپنی ہسپتال کی ڈیوٹی سے اس قدر غفلت دکھا رہی ہیں۔"

فیری کی آواز ایکبار پھر بھرا گئی۔

"ہاں۔۔ ہم اپنے حواسوں میں جو نہیں رہے علی۔ گوشی نے ہم سے دور جا کر۔ ہماری ساری صلاحیتیں مفقود کر دیں۔ ہمیں اس کے غم کے علاوہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔۔ کہ گوشی کا غم اپنی جگہ مگر۔۔ زندگی کی ذمہ داریاں بھی تو اپنی جگہ ہیں۔۔ اس دنیا میں کون ہے جسے غم و اندوہ کا کبھی سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔۔ کون ہے جس سے اس کا کوئی چاہنے والا نہ بچھڑا ہو؟ ۔ کوئی نہیں۔۔ کوئی نہیں۔۔!!"

"یہ درست ہے۔۔ مگر علی۔۔ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ تم نہیں جان سکتے کہ۔۔ ایک عام موت میں۔۔ اور گوشی کی موت میں کیا فرق ہے۔ وہ جن حالات میں۔۔ اور جس انداز میں مرا ہے علی۔ یہ میں ساری زندگی نہیں بھلا سکتی۔۔ یہ غم۔۔ یہ دکھ صرف میں جانتی ہوں علی۔۔ میں۔ جو اس کی بہن بھی تھی اور ڈاکٹر بھی۔"

"ڈاکٹر صاحب۔۔ آپ کا دکھ۔۔ درد۔۔ غم۔۔ سب کچھ بجا مگر۔۔ میں آپ سے یہ منوانے نہیں بیٹھا ہوں کہ گوشی کی موت پر افسوس کرنا غلط ہے۔۔ نہیں۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔ گوشی کی جدائی نے تو میرا اپنا سینہ شق کر دیا ہے۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ۔۔ جو ہو چکا۔۔ اسکا مداوا ممکن ہے یا نہیں۔۔"

فیری نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

"گوشی کا کوئی نعم البدل نہیں۔۔ اس کے غم کا کوئی مداوا نہیں۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا ہوں کہ جب آنسو بہانے سے وہ واپس نہیں آ سکتا۔۔ تو آپ کس لئے۔۔ روتی رہتی ہیں۔۔ کس لئے؟" پھر وہ ذرا رک کر بولا۔

"اپنے چاروں طرف نظر ڈالئے ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو۔۔ اپنی کیفیت بہت سوں سے بہتر نظر آئے گی۔"

"یہ نہ کہو علی۔۔ مجھ جیسا کم نصیب تو اس دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ماں کی دولت بچپن میں چھن گئی تھی اور لے دے کے ایک بھائی کی نعمت ملی تھی۔۔ سو جوانی میں لٹ گئی۔۔ رہ گئے ابو۔۔ تو ان کی حالت دیکھ کر دل کٹا جاتا ہے۔ ادھر دادی اماں کو دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ علی میں کیا کروں۔۔ میں کیا کروں۔" وہ گویا تڑپ رہی تھی۔

علی نے چند لمحے تک فیری کو دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"ادھر دیکھیئے ذرا میری طرف۔"

ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں نگاہوں سے فیری نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔ غم و اندوہ کی ایک چھاپ تھی۔ کہ جس نے علی کے چہرے پہ عجیب سی تاریکی کے سائے لہرا رکھے تھے۔

وہ مدھم سی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"آپ نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔ آج میں اپنے آپ کو دکھاتا ہوں۔ مجھے دیکھیئے اور پھر بتایئے۔ کس کا دکھ بڑا ہے۔ کون غم و اندوہ کا مارا ہوا ہے۔۔ میں۔۔ کہ آپ۔"

وہ چند ثانیے رُکا۔ پھر گہری سانس لیکر بولا۔

"آپ کو یہ گلہ کہ آپ اپنی ماں کی شفقت سے بچپن میں محروم ہوگئیں۔ اور مجھے ۔۔ مجھے یہ غم۔ کہ کاش میری ماں بھی میرے بچپن میں ہی مرگئیں ہوتیں۔ تب وہ ان کی اپنی قدرتی موت تو ہوتی۔

آپ کو یہ آرزو کہ آپ کے بہن بھائی زیادہ ہوتے

اور

میری یہ تمنا کہ کاش میرا کوئی بہن بھائی ہی نہ ہوتا!!

آپ کو یہ دکھ۔ کہ باپ کو دیکھتی ہیں تو آپ کا دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔

اور

میری یہ حسرت کہ دل ٹکڑے ہی کیوں نہ ہوجائے۔ باپ کی صورت تو دکھائی دے جائے کہیں۔

آپ کو یہ صدمہ کہ باپ حال سے بدحال ہے۔

اور۔

مجھے یہ ارمان کہ باپ کا حال ہی نامعلوم ہے۔

آپ کو یہ شکوہ کہ گوشی جو آپ کا اکلوتا بھائی تھا، ڈاکٹروں کی لاپرواہی اور ڈرائیور کی کوتاہی کا شکار ہوگیا۔

اور

میرا سینہ اس لئے چھلنی کہ میری بدنصیب آنکھوں نے اپنی ماں، اپنی بہنوں اور اپنے بھائی کے سینے کو دشمنوں کی گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا ہے۔

اور ۔۔ اور

پھر بھی میں زندہ ہوں۔ میں نہیں مرا۔ میں نہیں مرسکا۔"

فیری جو بھونچکا سی ہو کر علی کی باتیں سن رہی تھی۔ تڑپ کر آگے بڑھی۔

"علی۔ علی۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیا۔ کیا واقعی یہ سب سچ ہے؟"

علی نے اپنی اشکبار آنکھوں کو بازوؤں سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"یہ سچ نہ ہوتا ڈاکٹر صاحب۔ تو شاید میں نے اس قدر ٹوٹ کر گوشی سے محبت نہ کی ہوتی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو بیحد چاہتا تھا۔ اور ۔۔ گوشی کے روپ میں مجھے اپنا مرحوم بھائی مل گیا تھا۔ مگر ایکبار پھر۔ ایکبار پھر مجھ سے میرا بھائی چھن گیا ہے۔ بچھڑ گیا ہے۔"

فیری بے اختیار ہو کر پھر رونے لگی۔

"علی ۔ تم اتنے دکھی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ خدا کے لئے علی۔ مجھ سے جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں انہیں معاف کردو۔ خدا کے لئے معاف کردو علی۔"

اس نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ علی کے آگے جوڑ دیئے۔ گھبرا کر علی نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ اور ۔ اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"یہ کیا کرتی ہیں ڈاکٹر صاحب۔"

فیری بدستور روتی رہی۔

"میں بہت بری ہوں علی۔ بہت خراب۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ دکھ درد کیا ہوتے ہیں۔ اور ۔ یہ کہ تم۔ تم کن غموں کے پہاڑ تلے دبے ہوئے ہو۔ جبکہ گوشی۔ میرا معصوم۔ میرا پیارا بھائی کس قدر عظیم تھا کہ ۔ اس نے نہ صرف تمہارا درد بانٹا۔ بلکہ۔ مجھے بھی ۔ اپنی زندگی دے کر ۔ زندگی کے سب سے بڑے غم سے روشناس کرادیا۔ کتنا بڑا درس دے گیا وہ مجھے۔ آج ۔ آج مجھے احساس ہو رہا ہے۔ تم واقعی ۔۔ مجھ سے زیادہ دکھی ہو ۔۔ بہت زیادہ دکھی۔ برتر ۔ افضل اور عظیم تر بھی ۔ اور میں بہت ہی خود پرست ۔۔ خود پسند ۔۔ اور کمتر ۔ اور ۔۔"

علی نے اسے ٹوک دیا۔

"ہشت۔ کیسی باتیں شروع کردیں آپ نے۔۔۔ آپ اپنا مقام کبھی میری آنکھوں سے دیکھئے۔۔۔ ان آنکھوں سے۔"
شدت جذبات سے علی نے فیرُنی کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔



ناول نگاہ التفات جاری ہے۔ ناول اب اختتام کے قریب ہے۔ چودھویں قسط فروری کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

وقت کی کروٹ

رضیہ جمیل



اُس کے سامنے دو تین بنکوں میں جمع شدہ رقم کی ساری تفصیلات ایک صاف ستھرے کاغذ پر تحریر کی ہوئی موجود تھیں۔

کیش بھی کچھ کم نہیں تھا۔ نور بھائی ایک ایک نکتے کی وضاحت اچھی طرح کر چکے تھے۔ انھوں نے اسے اپنے بعض بہت قیمتی اور مخلصانہ مشوروں سے بھی نوازا تھا۔

انور بھائی چند منٹ قبل ہی اٹھ کر جا چکے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چیک بکس اور کیش رقم کو تکے جا رہی تھی۔

اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔

اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے بالکل ہی جواب دے چکی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ حالات کی اس کروٹ پر دل کھول کر قہقہے لگائے یا پھر۔۔۔

دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔

یوں اگر دیکھا جاتا تو بات واقعی خوش ہونے کی تھی۔

اس کے کتنے پرانے خواب کی تکمیل آج ہوئی تھی۔

کیسا پیارا سپنا تھا جو آج کہیں برسوں بعد جا کر پورا ہوا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس کا چہرہ فرط طرب سے گلنار ہو جاتا مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل جاتیں۔

آخر یوں ہر کسی کے خوابوں کی تکمیل تو نہیں ہو جاتی۔

یوں ہر ایک کے سپنے تو پورے نہیں ہو جاتے۔

دولت کی تمنا کسے نہیں ہوتی؟

روپے پیسے کی چاہ کسے نہیں ہوتی؟

چند ہی ایسے فقیر منش اور درویش صفت انسان ہوتے ہیں جنہیں مال و زر سے محبت نہیں ہوتی۔ ساری زندگی چند جوڑے کپڑوں میں اور روکھی سوکھی سے پیٹ بھر کے گزار دیتے ہیں۔

لیکن وہ تو نہ کبھی فقیر منش رہی تھی نہ درویش صفت لوگوں کی خو بو کو اس نے اپنایا تھا۔

پھر بھی روپے پیسے دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہوئی جا رہی تھی۔

اس دن کے انتظار میں تو اس نے برسوں گزار دیئے تھے۔

اور اب جب اس کی قسمت سے زندگی میں وہ دن آیا تھا تو اس کی آنکھیں پھیل کر جیسے پھٹ جانا چاہتی تھیں۔

عطیہ کی زندگی میں روپے پیسے کی بڑی اہمیت تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ ان لوگوں میں سے تو تھی نہیں جو منہ میں سونے کا چمچہ لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ دولت اس کے گھر کی باندی کبھی نہیں رہی تھی۔

برعکس اس کے عطیہ نے تو آنکھ کھول کر اپنے گھر میں روپے پیسے کی تنگی ہی دیکھی تھی۔ کبھی اماں، کبھی ابا میں روپے پیسے کے لئے تکا فضیحتی ہوتے دیکھی، کبھی اماں اور دادی اماں میں اسی بات کے پیچھے چخ چخ ہوتے دیکھی۔

مفلسی کتنی بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس بات کا احساس عطیہ کو بڑی کم عمری میں ہو گیا تھا۔

لڑائی جھگڑے، فساد، تو تکار، خود غرضی، حسد، احساس کمتری۔۔۔ یہ سب اسی مفلسی کی کوکھ سے جنم لے کر اس کی گود میں پروان چڑھتی ہیں۔

اماں، ابا ہر وقت ایک دوسرے سے بیزار اور ہر وقت ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

دادی اماں اپنی بہو کو صلواتیں سنانے کے لئے تیار بیٹھی رہتی تھیں۔ اور ہر ایک کے غصے کی تان آ کر ٹوٹتی تھی بچوں پر۔۔۔ جو کہ بعد دیگرے پیدا ہونے کے بعد بس کسی نہ کسی طرح پلے جا رہے تھے۔ دادی اماں کی صلواتیں بھی سن رہے تھے۔ اماں کی پھٹکار بھی سن رہے تھے اور ابا کی ڈانٹ ڈپٹ سے بھی نوازے جا رہے تھے۔

ڈانٹیں کھا کھا کر جھڑکیاں سن سن کر چکنے گھڑے ہو گئے تھے اور کچھ کھانے پینے کو تھا یا نہیں تھا، ڈانٹ پھٹکار اور مار کی تو کمی نہیں تھی۔ صبح آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی وقفے وقفے سے جو یہ سلسلہ جاری ہوتا تو سارا دن بلکہ رات کو سونے کے وقت تک جاری رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہی ڈانٹ پھٹکار اور مار ان کا راشن پانی تھا۔ اس کو کھا پی کر دن بدن قد کاٹھ نکال رہے تھے۔ بس ایک بڑے بھیا ہی کچھ منحنی سے تھے یا پھر عطیہ خود تھی۔ سوکھی مرگھلی سی۔ بڑے [illegible] نے ہر وقت رو رو کر اور بسور بسور کر اپنی صورت ہی بگاڑ لی تھی اور بچپن میں اس کی اپنی وضع قطع تو بہت ہی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ہوا کرتی تھی۔ مٹکا سا پیٹ تھا۔۔۔ جسے بھوک بھوک چلا کر وہ ہر وقت پیٹا ہی کرتی تھی۔ منہ سے رال اور نتھنوں سے ناک وقت بے وقت بہا کرتی تھی۔ ٹھوڑی ہنسلی کی ہڈی کے ساتھ چپکی ہوئی۔ کچھ لمبوتری سی ہو گئی تھی۔ مکھی کی طرح بھنبھناتے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

تھی دو لول بہنیں۔۔۔ ربیعہ اور سمیعہ آپا روکھی سوکھی کھا کر [illegible] مست مگن تھیں۔ یہی حال دونوں بھائیوں ارشد اور افسر کا تھا۔ یا تو یہ وجہ تھی کہ یہ چاروں بہن بھائی اپنے حال پر قانع

تھے یا پھر وقت اور حالات کی چیرہ دستیوں نے انہیں [illegible] بنا دیا تھا۔ البتہ عطیہ اور بڑے بھیا (اطہر) شاید کچھ زیادہ [illegible] اور زود رنج تھے کہ اپنی اپنی قسمتوں کی کڑوی گولیوں کو [illegible] کے لئے عذاب جان تھا۔

ربیعہ اور سمیعہ آپا لوکی لکڑی کی بیل کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور اماں انہیں دیکھ دیکھ کر ہول کھائی رہتی تھیں۔

کچھ مخصوص قسم کے جملے تھے جو عطیہ نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اکثر اپنے گھر میں سنے تھے۔

اماں جب روزمرہ کے خرچوں سے بہت زیادہ ہی عاجز آجاتیں تو جھلا کر برس پڑتیں۔

"آپ خود ہی سنبھالیں خرچہ۔ مجھ سے نہیں چلتا یہ گھر آپ کی دی ہوئی ان روپلیوں میں۔"

ابا چراغ پا ہو کر کہتے

"دو کما کر ادھ موا ہوا جا رہا ہوں، اب تم یہ ذمہ داری بھی میرے سر ڈال دو۔"

اماں چمک کر کہتیں۔

"ہاں ذرا آپ کو بھی تو معلوم ہو آٹے دال کا بھاؤ۔ کما کر لانا تو پھر آسان ہے۔ اس تنگ بندھی آمدنی میں اتنی بہت ساری جانوں کا دوزخ بھرنا کس جگرے کا کام ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔"

ایسے میں دادی اماں گھر کے کسی نہ کسی کونے کھدرے سے ضرور نکل آتیں اور الٹا اماں پر ہی برس پڑتیں۔

"لے تو لے آئی ہوتیں نا اپنے اماں باوا کے گھر سے روکڑ ڈھنگ کے گہنے لتے تو دیتے نہیں تمہارے اماں باوا نے۔"

اماں بھلا کیوں چوکتیں، فوراً پلٹ کر جواب دیتیں۔

"میرے اماں باوا نے کوئی چھل فریب نہیں کیا تھا آپ لوگوں کے ساتھ۔ جیسے بھی تھے جس حال میں بھی تھے، سب کچھ آپ لوگوں کے سامنے تھا۔ لے آتیں کسی رئیس کی بیٹی کو بہو بنا کر۔"

ایسے موقع پر ابا فوراً اماں کو ڈپٹ دیتے۔

"اچھا بس! خاموش ہو جاؤ۔ کوئی ادب لحاظ ہے تمہیں بزرگوں کا یا نہیں؟"

اماں کی زبان پھر بھی نہ رکتی۔

"بزرگ ایسی بات کریں ہی کیوں۔ سوچ سمجھ کے بات کرنا چاہیئے انسان کو۔"

اس کے بعد بحث بڑھتی ہی چلی جاتی۔ تینوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد آخر کار چپ ہو جاتے۔

لیکن مہنگائی کے اس زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اتنا دشوار تھا کہ ہر دو چار روز بعد اماں پر جھلاہٹ سوار ہونا ضروری تھا۔ پھر کسی دن اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے اماں ابا میں چخ چخ شروع ہو جاتی۔

اماں بڑبڑانا شروع کر دیتیں۔

"میری تو عقل کام نہیں کرتی، کیسے سب کا بھرنا بھروں؟ پیٹ کا دوزخ بھر لو تو تن ڈھانپنے کی فکر سوار ہو جاتی ہے۔ تن کے لئے چار لتے بناؤ تو پڑھائی کے خرچے کہاں سے پورے کروں۔"

دادی اماں کا کہیں نہ کہیں سے آکر لقمہ دینا ضروری ہوتا۔

"کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ بڑی اور منجھلی کو گھر بٹھالو۔ کچھ تو خرچہ کم ہوگا۔ مگر تمہیں تو خبط ہے کہ لڑکیاں پڑھیں گی ضرور۔"

اماں فوراً بولتیں۔

"جہاں تک بھی میری استطاعت ہوگی لڑکیوں کو پڑھاؤں گی ضرور۔ جاہل رہ گئیں تو کوئی پوچھنے بھی نہیں آئے گا۔"

"پڑھی لکھی لڑکیوں کو کون سے پر لگ جاتے ہیں۔ دیکھ لو کتنے ہی گھروں میں پڑھ لکھ کر بھی لڑکیاں ماں باپ کے سینے کا بوجھ بنی بیٹھی ہیں۔"

اماں ان کی بات کی مخالفت کرتے ہوئے کہتیں۔

"ٹھیک ہے شادیاں نہیں ہوئیں لیکن وہ گھر والوں کے لئے بوجھ بھی نہیں ہیں۔ دوسروں کا سہارا ہی بنی ہوئی ہیں۔"

دادی اماں نے تنک کر کہا۔

"لیکن ہمیں اپنی لڑکیوں سے نوکریاں نہیں کروانی ہیں۔"

"نہ کروائیے نوکریاں۔ لیکن برے بھلے وقت میں کام تو آتی ہے تعلیم۔" اماں نے کہا۔

پھر گویا شکوہ آمیز انداز میں بولیں۔

"ہمارے اماں باوا نے ہمیں جاہل رکھا جبھی تو آج بھگت رہے ہیں۔"

"لے ہے! پڑھ لکھ جاتیں تو کیا کر لیتیں؟"

دادی اماں کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔

اماں نے بات سنی ان سنی کر دی۔

ربیعہ اور سمیعہ آپا نے میٹرک پاس کیا تو دادی اماں نے اٹھتے بیٹھتے وظیفہ گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"میں کہتی ہوں بہت ہو چکی پڑھائی۔ بڑی اور منجھلی کو اب گھر بٹھاؤ۔"

اماں اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہتیں۔

"کیوں، گھر بیٹھ کے کیا کریں گی؟"

"کچھ ڈھنگ ہنر سکھاؤ انہیں۔ آخر گھرداری بھی تو آنی چاہیے"

"گھرداری تعلیم جاری رکھ کر بھی سکھائی جا سکتی ہے!"

اماں کا جواب ہوتا۔

دادی اماں طیش میں آکر کہتیں۔

"تم نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ میری کسی بات کو سمجھ کر نہ دو گی۔"

"آپ ٹھیک سے سمجھائیے بھی آخر سمجھ کے کیوں نہ دوں گی؟"

دادی اماں مصالحانہ انداز سے کہتیں۔

"جو پیسے تم ان کی پڑھائی پر خرچ کر رہی ہو، وہی بچا کر رکھو گی تو جہیز کی چار چیزیں ہی جمع کر لو گی ان دونوں کے لئے۔"

اماں اپنی اسی لاپرواہی سے کہتیں۔

"اونہہ! جہیز بھی بن جائے گا جب وقت آئے گا۔ پہلے پیٹ بھر کے کھانے کو تو ملے!"

اور دادی اماں اپنے قیمتی مشورے کو اس بے نیازی سے رد کئے جانے پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتیں۔

غرض یہ کہ زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طور گھسٹتی ہی جا رہی تھی۔ دادی اماں اپنی جھک جھک سے باز نہ آتیں۔ اماں ان کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتیں اور اپنی سی کیے جاتیں۔ ابا وقت بے وقت غرا کر، دھاڑ کر اپنی جھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے پر تلے بیٹھے رہتے۔

اتنا گھٹا گھٹا سا ماحول تھا گھر کا کہ بعض اوقات تو عطیہ کو سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا۔ بچپن تو خیر جیسے تیسے گزر ہی گیا تھا لیکن اب بڑے ہونے پر صبح سے لیکر شام تک کی چخ چخ عطیہ کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ بات بات میں ڈانٹ پھٹکار سن سن کر کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جائے۔ کبھی وہ سوچتی کہ پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے۔ اس پڑھائی کی خاطر کتنے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ آج قلم نہیں ہے تو کل پنسل نہیں ہے کبھی سلائی کی چیزیں نہیں ہیں تو کبھی ڈرائنگ کا سامان نہیں ہے اب کے کوئی کتاب نہیں ہے تو کبھی کاپیوں کے لئے ذہن پریشان ہے۔ اور ہر مہینے فیس ادا کرنے کے لئے تو گویا پل صراط پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ کیسی جان سوکھتی تھی فیس ادا کرنے کی فکر میں۔

اماں کا حکم تھا کہ پڑھائی کسی قیمت پر نہیں چھوڑنی ہے، چاہے دو وقت کے بجائے ایک وقت کھانے کو ملے۔ چاہے پورا سال دو جوڑے کپڑوں میں گزارنا پڑے۔ اسکول پہنچنے کی خاطر میلوں پیدل چلنے کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اماں کسی کی زبان سے یہ جملہ نہیں سننا چاہتی تھیں کہ مجھے اب آگے نہیں پڑھنا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ ابا نے بھی مالی پریشانیوں سے تنگ آکر ربیعہ اور سمیعہ آپا کی پڑھائی ختم کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ دادی اماں تو یہ سن کر مارے خوشی کے نہال ہو گئیں۔ کوئی تو اپنا حمایتی ملا تھا انھیں۔ لیکن اماں کا ارادہ ان دونوں کے فیصلے کے آگے چٹان بن کر کھڑا ہوا تھا۔ ابا اور دادی اماں کے فیصلے کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں سلائی کروں گی۔ اس موقع پر اماں کا سینے پرونے کا ہنر بہت کام آیا۔ لیکن اولاد جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی، پڑھائی کے خرچے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ اماں کی سلائی سے کچھ سہارا ہوا مگر اتنا بھی نہیں کہ بالکل ہی بے فکری ہو جاتی۔

اماں کو محلے داری نبھانی بہت آتی تھی۔ یہی محلے داری اس وقت ان کے کام آئی۔ ربیعہ اور سمیعہ آپا کو ابتدائی جماعتوں کے پانچ چھ بچوں کی ٹیوشنیں مل گئیں۔ ربیعہ آپا بی۔ایڈ کر رہی تھیں اور سمیعہ آپا بی۔ایس سی کے آخری سال میں تھیں۔ اب کیا اتنا پڑھ جانے کے بعد وہ چھ بچوں کو ٹیوشن بھی نہیں پڑھا سکتی تھیں۔

جب پہلے روز بچے پڑھنے آئے تو اماں نے ایک شانِ تفاخر سے دادی اماں کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔

"کیوں؟ میں نہ کہتی تھی کہ یہ تعلیم رائیگاں نہیں جائے گی؟"

دادی اماں نے بیزار ہو کر منہ گھما لیا اور جلدی جلدی تسبیح کے دانے گھمانے لگیں۔ انہیں تو سرے سے یہ چکر ہی ناپسند تھا۔ بہو کے آگے۔ ان بیچاریوں کی چلتی بھی تو نہیں تھی۔

اور جب ربیعہ آپا اور سمیعہ آپا کو اسکول میں ملازمتیں مل گئیں تو اماں نے دادی اماں کو یہ خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔

"اماں! اب آپ دیکھئے گا، یہ لڑکیاں اپنا جہیز خود بنائیں گی"

دادی اماں بپھر کر بولیں۔

"کون سی بڑے فخر کی بات ہے۔ یہ تو نری بے حیائی ہے۔"

اماں مطمئن انداز سے بولیں۔

"آپ کا سوچنے کا انداز غلط ہے۔ یہ بے حیائی نہیں ہے وقت کی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا ہے۔"

دادی اماں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"تم سے تو بحث کرنا ہی بے کار ہے۔ اپنے آگے تم کسی کی چلنے کب دیتی ہو۔"

اماں گردن مٹکا کر دوسری طرف چل دیں۔

ربیعہ آپا اور سمیعہ آپا کمانے کے قابل ہوئیں تو عطیہ کو ان دونوں پر رشک آنے لگا۔ اس کا بھی دل چاہنے لگا کہ وہ اپنی تعلیم جلد از جلد مکمل کر کے کہیں ملازمت کرنا شروع کر دے۔

وہ تصور ہی تصور میں ڈھیر سارے روپوں سے اپنا پرس بھرا ہوا دیکھتی اور ان خوش آئند لمحات کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ بکھر جاتی۔

تنگ دستی بھی کیسی لعنت ہے۔

معلوم نہیں اللہ میاں نے انسان انسان کے درمیان دولت کی اتنی زبردست تفریق کیوں رکھی ہے؟

کوئی ہے تو پیسے پیسے کے لئے محتاج ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لئے ترس رہا ہے۔

مفلسی نے اس میں اتنا زبردست احساس کمتری پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے سامنے والے سے نگاہ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتا۔

اور کسی کے پاس روپے پیسے کی اتنی فراوانی ہے کہ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہے کہ وہ ان روپوں کو خرچ کہاں کرے۔

اللہ میاں کے کھیل بھی بس نرالے ہیں۔

وہ سوچتی۔

اور پہلے سے زیادہ لگن اور شوق سے اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

اور وہ جو دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ اتنا پڑھا لکھا کر لڑکیوں کے دیدے ہوائی کئے دے رہی ہو تو بر نہیں جڑے گا ان میں سے کسی کو۔

ان بیچاریوں کا یہ خیال بھی غلط ہی ثابت ہوا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک کو نہیں بلکہ دونوں کو بر جڑ گئے اور اچھی خاصی متمول جگہوں پر دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔

عطیہ ان دنوں بی اے میں پڑھ رہی تھی اور مالی طور پر خود کفیل ہونے کی آرزو ایک جنون بن کر اس کے دل و دماغ میں سمائی جا رہی تھی اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح اپنی زندگی میں اس سنہری دن کو لے آئے جس دن وہ اماں کو یہ خوشخبری سنا سکے کہ ——

"اماں! مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

اس کا دل چاہتا تھا کہ شب و روز پر لگا کر اڑ جائیں۔

وہ حساب لگا کر سوچتی کہ بس فلاں سال تک میں بی۔ ایڈ کر لوں گی۔ پھر تو مجھے ملازمت مل جانا یقینی بات ہے۔ یہ ڈھیر سارے روپے ہوں گے میرے پاس۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی۔ اماں بیچاری بھی اگر تعلیم یافتہ ہوتیں تو یوں محتاجگی میں تو زندگی نہ بسر کرتیں۔ اب تک کی زندگی تو تنگ دستی کا رونا روتے گزاری ہے بیچاریوں نے۔ کبھی دادی اماں کے طعنے سن لئے۔ کبھی ابا کی جھڑکیاں برداشت کر لیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی؟

ایک آس، ایک امید پہ عطیہ کے دن گزرے جا رہے تھے۔

بی۔ اے کے بعد جب عطیہ نے بی۔ ایڈ کرنا چاہا تو اماں نے منع کر دیا۔

"تم بی۔ ایڈ نہ کرو عطیہ! ایم۔ اے میں داخلہ لے لو۔"

"کیوں اماں؟" عطیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس میری خواہش ہے کہ تم ایم۔ اے کے بعد پی ایچ۔ ڈی کرو۔"

"لیکن میں تو بی۔ ایڈ کے بعد جلد از جلد ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔"

عطیہ کی دلی تمنا اس کے ہونٹوں تک آ گئی۔

اماں نے مطمئن انداز سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں ہیں۔ تم ملازمت کئے بغیر بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہو۔"

"مگر اماں! آپ مجھے ملازمت کرنے سے نہ روکیں، میری تو بڑی پرانی خواہش ہے یہ۔"

عطیہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

اماں اپنی کہے گئیں۔

"تم تعلیم ختم کر لو۔ اس کے بعد دیکھنا اچھی سے اچھی ملازمت مل جائے گی تمہیں۔"

عطیہ نے اپنی بات منوانے کے لئے ہر کوشش کر ڈالی، لیکن اماں بضد تھیں کہ

"نہیں، تمہیں پہلے ایم۔ اے اور اس کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ہے۔"

عطیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"ربیعہ آپا اور سمیعہ آپا کو تو آپ نے نہیں منع کیا تھا۔"

"وہ تو وقت اور حالات کی مجبوری تھی۔ ورنہ میں تو ان سے بھی ملازمت نہ کرواتی۔ انہیں اور تعلیم دلواتی۔"

عطیہ نے مصالحانہ انداز سے کہا

"اچھا! پھر میں ایسا کرتی ہوں کہ ملازمت بھی کرتی رہوں گی اور ساتھ ساتھ پڑھتی بھی رہوں گی۔"

"آخر ضرورت کیا ہے ملازمت کی؟"

اماں کچھ چڑ کر بولیں۔

پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

"اب تو ماشاء اللہ اطہر (بڑے بھیا) بھی برسر روزگار ہے، ارشد کو بھی عنقریب ہی انشاءاللہ کوئی نہ کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔"

عطیہ نے سوچا۔

وہ اماں کو کیسے بتائے؟

اس کی وہ دیرینہ خواہش پوری ہونے کا اب ہی تو وقت آیا تھا۔

وہ ڈھیر سارے روپوں سے بھرا ہوا پرس۔

وہ اپنا ذاتی اکاؤنٹ۔

وہ ایک احساس۔

دل خوشی اور طمانیت سے بھرپور۔

کہ ان روپوں کی مالک وہ ہے۔

وہ خود۔

وہ اس کی اپنی ذات ان روپوں کی تنہا حقدار ہے۔

وہ جس طرح چاہے انہیں خرچ کر سکتی ہے۔

اپنی مرضی سے جسے چاہے دے سکتی ہے۔

اپنے اس خواب کے پورا ہونے کے لئے اب وہ مزید تین سال انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے اماں کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن اماں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس موقع پر اسے دادی اماں بہت یاد آئیں جو پچھلے سال ہی اللہ میاں کو پیاری ہو گئی تھیں۔

اس نے سوچا

اگر دادی اماں زندہ ہوتیں تو شاید انہی کی حمایت کے بل بوتے پر اس کا کچھ کام بن جاتا۔

اس نے ابا کو اپنا ہمخیال بنانا چاہا تو اس میں بھی منہ کی کھائی اس معاملے میں وہ خود اماں کے حمایتی تھے۔

انھوں نے صاف صاف کہہ دیا

"جس طرح تمہاری اماں کہہ رہی ہیں ویسے ہی کرو۔ ان کی سوچ غلط نہیں ہے۔"

عطیہ نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ابا! میں ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھوں گی۔"

ابا نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ دیا۔

"اس طرح یکسوئی سے پڑھ نہیں سکو گی۔"

اس نے اپنے بھائیوں کو اپنا حمایتی بنانے کی کوشش کی تو وہاں بھی اسے سراسر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

تنگ آکر اسے اماں کی خواہش کا احترام کرتے ہی بن پڑی۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ ایم۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اس کے لئے یکے بعد دیگرے چند اچھے رشتے آئے اماں نے اس موقع پر عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے صاف صاف اپنا فیصلہ سنا دیا کہ

"بس! اب پڑھائی ختم۔ میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوا سکتی۔"

عطیہ کہتی رہ گئی۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ ایم۔ اے کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کر لینا!"

اماں کا جواب یہ تھا کہ

"وقت اور حالات کے مطابق انسان کو اپنے فیصلے میں لچک پیدا کرنی چاہیئے۔ اس وقت یہی فیصلہ تمہارے اور ہم سب کے لئے بہتر ہے۔"

عطیہ خاموش ہو گئی۔

جہاں تک شادی کا معاملہ تھا، اس کے گھریلو حالات نے اس کے ذہن میں یہ سوچ پیدا کی تھی کہ شادی کسی ایسے آدمی سے کرنی چاہیئے جس کے پاس خوب بہت سارے روپے ہوں، یا دوسرے معنوں میں وہ کسی دولت مند آدمی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اپنے بچپن میں گھر کی تنگ دستی کا جو نقشہ اس نے دیکھا تھا۔

جس احساس کمتری کا شکار وہ خود اور اس کے بہن بھائی رہے تھے۔

اماں، ابا اور دادی اماں کے درمیان ہونے والی تلخ ناخوشگوار باتیں۔

ان سب باتوں کی وجہ سے اس کے دل و دماغ میں کچھ ایسا خوف سمایا ہوا تھا کہ اس کو مفلسی اور غربت سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی شادی اچھی جگہ ہی ہوئی تھی

اس کی سسرال مختصر سی تھی۔ کوئی لمبی چوڑی فیملی نہیں تھی۔

وہ بیاہ کر سسرال آئی تو اسے کم عمر اور بچہ سمجھ کر اس پر ذمہ داریوں کا کم سے کم بوجھ ڈالا گیا۔ گھر کا خرچہ اس کی ساس کے پاس رہتا تھا۔ وہ جیسے دل چاہتا تھا خرچ کرتی تھیں۔ اس کی دو جیٹھانیاں بھی ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن گھر کی مالکہ کی حیثیت ساس کو ہی حاصل تھی۔ عطیہ کی تمام ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔

بظاہر وہ خوش تھی، مطمئن تھی۔

لیکن اندر ہی اندر ایک بے چینی ایک بے کیفی سی تھی۔

وہ اس کی دبی دبی سی تمنا اب بھی کبھی کبھی بیدار ہو کر اس کے سارے وجود پر چھا جاتی تھی۔

اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ وہ ڈھیروں ڈھیر روپے اسے مل جائیں۔

معلوم نہیں کب اس کی زندگی میں وہ لمحات آئے تھے وقت چپ چاپ گزر رہا تھا۔

اس کے ایک جیٹھ سعودی عرب چلے گئے۔ ان کے بیوی بچے بھی کچھ عرصہ بعد ان کے پاس چلے گئے۔ اس کے دوسرے جیٹھ کا تبادلہ بھی اسلام آباد ہو گیا۔ اب گھر میں عطیہ، اس کے شوہر سرفراز، اس کے دو بچے سارہ، یاسر اور اس کی ساس رہ گئی تھیں۔

عطیہ کا تیسرا بچہ عامر جب چند ماہ کا تھا تو اس کی ساس کا انتقال ہو گیا۔ ساس کے انتقال کے بعد گھر کا خرچہ اس کے شوہر سرفراز کے ہاتھ میں آ گیا۔ بس عطیہ کو تو ہر چیز مل جایا کرتی تھی

یوں دینے کو سرفراز اس کے ذاتی خرچ کے لئے کچھ رقم بھی دیا کرتے تھے۔ مگر وہ رقم اتنی تھوڑی ہوتی تھی کہ وہ اپنا بینک بیلنس بنا لیتی۔

عطیہ نے کئی دفعہ دبی زبان سے سرفراز سے کہا بھی کہ آپ میرے نام سے بھی کوئی اکاؤنٹ کھول دیں۔

مگر سرفراز نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ذاتی اکاؤنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ تمہارا اور بچوں کا ہی تو ہے۔

سرفراز کی یہ بات سن کر عطیہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ سرفراز کا خیال تھا عورتیں چونکہ کچھ زیادہ ہی فضول خرچ ہوتی ہیں۔ عطیہ کے نام سے ذاتی اکاؤنٹ کھولنے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ جا اور بیجا خرچ کرنا شروع کر دے گی۔

سرفراز سوچتے تھے۔

آخر اسے کیا ضرورت ہے ذاتی اکاؤنٹ کی؟

اسے کس چیز کی کمی ہے؟

گھر میں سجاوٹ و آرائش کی ہر چیز موجود ہے۔ اس قسم کی چیزیں میں خود دلچسپی سے خریدتا ہوں۔

اس کے پاس کپڑوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کے لئے کچھ بنانے اور خریدنے میں میں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

میں بچوں کو بھی کسی چیز کے لئے نہیں ترساتا۔ بس یہ الگ بات ہے کہ میں خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

عطیہ کو تو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں میں نے اپنے سر لے رکھی ہیں۔ ورنہ مرد تو عموماً یہ کرتے ہیں کہ مہینے کے شروع میں ایک لگی بندھی رقم عورت کے ہاتھ پہ رکھ کر ہر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔

سرفراز کو یہ بات کب معلوم تھی کہ عطیہ نے آنکھ کھول کر جس تنگ دستی اور مفلسی کا سامنا کیا تھا اس نے عطیہ کے دل و دماغ میں کون سی خواہش کو جنم دیا تھا۔

عمر بھی کہ گزرتی جا رہی تھی اور ابھی وہ دیرینہ تمنا پوری ہونے کا وقت نہیں آ رہا تھا۔

زندگی کے دن ایک کے بعد ایک کر کے کم ہوتے جا رہے تھے اور اس کی وہ ایک آرزو کسی طرح پوری ہو ہی نہیں رہی تھی۔

ربیعہ آپا اور سمیعہ آپا اب تک سروس کر رہی تھیں اور مزے میں تھیں۔ اپنی مرضی اور خواہش سے جو دل چاہتا تھا خریدتی تھیں اور بناتی تھیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی نکل آتا تھا کہ کس کے اکاؤنٹ میں کتنا روپیہ ہے؟

عطیہ دل ہی دل میں ان لوگوں پر رشک کرتی تھی۔

روپے پیسے سرفراز کے پاس بھی کچھ کم نہیں تھے۔ آخر ذاتی گاڑی تھی۔ گھر میں ٹیلیفون بھی لگا ہوا تھا۔

عطیہ سوچتی تھی کہ کیا حرج ہے اگر وہ کچھ رقم میرے نام سے جمع کروا دیں یا چند ہزار کیش رقم ہی میرے پاس رکھوا دیں۔

گھر میں سکون بھی تھا، اطمینان بھی تھا۔ سرفراز کو عطیہ سے محبت بھی بہت تھی، لیکن وہ اپنی اس بے چینی کا کیا کرتی؟ اپنی زندگی میں محسوس ہونے والے اس خلا کا کیا کرتی جو کبھی کبھی اس کے لئے بڑا اذیت ناک ہو جاتا تھا۔

پھر وقت نے ایک کروٹ لی۔

عطیہ کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔

وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے چپ چاپ ایک دیرینہ

آرزو پوری ہو جائے گی۔

اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر اچانک اس کی برسوں پرانی خواہش کی تکمیل ہو جائے گی۔

اسے تو کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ بچپن سے اس کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی یہ تمنا جو اب حسرت بن کر اس کے وجود میں زندہ تھی، اب ایک دم اس انداز سے پوری ہو جائے گی۔

سرفراز کو کچھ خاص تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ بس یہی موسمی بخار آیا ہوا تھا۔ دوا علاج کے معاملے میں سرفراز ہمیشہ سے ہی لاپرواہ تھے۔ پرہیز کرنا بھی ان کی عادت میں شامل نہیں تھا۔ یہ موسمی بخار بگڑ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھے بھلے صحت مند، تندرست سرفراز چٹ پٹ ہو گئے۔

کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔

یہ سب کیسے ہو گیا؟

کیوں ہو گیا؟

عطیہ کی دنیا اندھیر ہو گئی۔

جانے والا چلا گیا۔

پلٹ کر یہ دیکھے بغیر کہ اس کے پیچھے رہ جانے والوں پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

سرفراز کے دونوں بھائی اسلام آباد اور سعودی عرب سے آ گئے تھے۔

سوئم، دسواں، بیسواں اور آخر کار چالیسواں بھی ہو گیا۔

عطیہ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ صبح کس طرح ہوتی ہے؟

اور رات کس طرح گزر جاتی ہے؟

اس کے بچے کس حال میں پھر رہے ہیں؟

اور گھر کی کیا حالت ہے؟

انور بھائی کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ وہ عنقریب ہی واپس جانے والے تھے۔ نواز بھائی تو چالیسویں کے موقع پر تین چار روز کی چھٹی لے کر آئے تھے اور اب واپس جا چکے تھے۔

پھر ایک روز انور بھائی نے اسے پاس بٹھا کر بڑی ایمانداری اور رازداری سے اس تمام روپے پیسے کا حساب کتاب سمجھایا جو سرفراز چھوڑ کر مرے تھے۔

سرفراز نے بڑی تفصیل اور باقاعدگی سے لکھا تھا کہ کون سے بنک اکاؤنٹ میں ان کا کتنا روپیہ ہے، انشورنس کمپنی کی کتنی رقم ملنی ہے۔ کیش رقم کتنی ہے اور کہاں رکھی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ یہ سب کچھ ان کی بیوی عطیہ اور تینوں بچوں کے نام منتقل کر دیا جائے۔ ان کے فنڈ کی جو رقم ملی تھی وہ بھی کچھ کم نہیں تھی۔

انور بھائی نے سرفراز کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے بڑی ایمانداری سے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ تمام چیک بکس اور سارے ضروری کاغذات، رسید وغیرہ جو اب عطیہ کے نام تھے، اس کے حوالے کر کے گئے تھے۔

اور عطیہ وقت کی اس انوکھی کروٹ پر حیران، ششدر بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔

زندگی کے اس انقلاب کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں کھنچی جا رہی تھیں۔

اپنی ایک خواہش، ایک تمنا، ایک آرزو کے یوں اس انداز سے پورا ہو جانے پر اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت کی اس ستم ظریفی پر دل کھول کر قہقہے لگائے یا پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔

اس نے سوچا۔

میں نے یہ تو کبھی نہیں چاہا تھا کہ زندگی کی سب سے قیمتی پونجی سے بیش بہا سرمایہ چھن کر میری خواہش کی تکمیل ہو جائے۔

یہ کیسا مذاق ہے خداوندا!

اذیتوں کی کس سولی پہ لٹکا دیا ہے تو نے مجھے؟

درد کی کون سی منزل پہ لا کر کھڑا کر دیا ہے تو نے مجھے؟

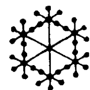
اپنی زندگی کے اس انجام پر اس کی آنکھوں میں وحشتیں سما گئی تھیں۔

آنکھیں خوفناک حد تک پھیل گئی تھیں۔



بند آنکھوں کے ادھورے خواب

ریحانہ زیدی



گاڑی سے اتر کر وہ تیر کی طرح اندر آئیں۔
اماں جانی ظہر کی نماز پڑھ کے چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔
آہٹ پا کر انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا
سامنے نجمہ کھڑی تھیں۔
اترے ہوئے چہرے پر زرد رنگ کی پرچھائیاں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ سخت کرب کے عالم میں مبتلا ہیں۔
"کیسا ہے اب وہ؟" نجمہ نے اماں جانی کو متوجہ پا کر آہستہ سے پوچھا۔
"وہی حالت ہے۔ ڈاکٹر نیند کا ٹیکہ لگا کر گئے ہیں۔ مگر تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ اگر شفاعت کو گن سن مل گئی تو اس عمر میں اور جگ ہنسائی ہوگی۔ کھانا کھایا تھا؟" اماں جانی نے ڈانٹتے ڈانٹتے اچانک پوچھ لیا۔
"ہاں کھا لیا تھا۔ جیسے ہی شفاعت واپس آفس گئے۔ میں ادھر آگئی۔" نجمہ گہری سانس لے کر بولیں۔
"بچے کہاں ہیں؟" اماں جانی نے پھر پوچھا۔
"اوہو اماں جانی۔ آخر آپ بھول کیوں جاتی ہیں کہ بچے دوپہر کی شفٹ میں اسکول جاتے ہیں؟" انھوں نے جھنجلا کر جواب دیا۔
"اے ہے میری بھی مت ماری گئی ہے۔" اماں جانی نے ماتھا پیٹا۔
وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"جاؤ دیکھ آؤ اسے جا کر پھر جلدی واپس چلی جانا تاکہ کسی کو خبر نہ لگ پائے۔" اماں جانی انہیں اوپر جاتے دیکھ کر بولیں۔
وہ دبے پاؤں اوپر آگئیں۔
سینڈل برآمدے میں اتار کر کمرے تک پنجوں کے بل چلتی ہوئی آئیں۔ کھڑکی کا پردہ اٹھا کر انھوں نے اندر جھانکا۔
اپنی مسہری پر وہ اوندھا سو رہا تھا۔
منہ ان کی طرف تھا۔
سیدھے اور خشک بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے
ہونٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے
جیسے کچھ کہتے کہتے رک گیا ہو۔
یا پھر رکتے رکتے کچھ کہنا چاہتا تھا۔
ان ادھ کھلے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔
لگتا تھا مدت کا پیاسا ہو۔
اس کی اس بے ترتیبی میں بھی معصومیت تھی۔
بچپن تھا۔
انہیں خبر ہی نہ لگی۔ کب آنکھوں میں آنسو آئے اور کب بہہ نکلے۔ سسکتے ہوئے ہونٹوں پر سے پھسل کر نمکین پانی کے قطرے زبان سے ٹکرائے تو احساس ہوا کہ وہ رو رہی تھیں۔
اپنی ہچکیوں کو حلق میں روکے روکے وہ جلدی سے پلٹ آئیں مبادا کہ اس کی آنکھ کھل جائے۔
اور وہ ان سے چھپ کر دیکھتے ہوئے رونے کا سبب پوچھ بیٹھے۔
تو وہ کیا بتائیں گی۔
داستان کہاں سے شروع کریں گی۔
جبکہ اس کہانی کے سارے تار ایک دوسرے سے امر بیل کی طرح لپٹے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔
"اماں جانی میں جا رہی ہوں۔" انھوں نے نیچے آکر آہستہ سے کہا۔
"اے ہے ذرا دو چھینٹے پانی کے مار لو منہ پر کیسی لال آنکھیں ہو گئی ہیں۔" اماں جانی نے ان کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مشورہ دیا۔
برآمدے میں لگے واش بیسن پر انھوں نے کھڑے کھڑے منہ پر پانی ڈالا۔ اسٹینڈ سے تولیہ اتار کر منہ پونچھا اور اماں جانی کو خدا حافظ کہے بغیر باہر آگئیں۔
گاڑی بار بار ان کے قابو سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔
آج عکرمہ کی جو حالت ہے اس کا ذمہ دار کون تھا۔
دل کو کچھ کہتے ہوئے اس سوال کو نظر انداز کرنے کی خاطر انھوں نے خود کو بیڈ پر گرا لیا مگر یادیں تھیں کہ بلا اجازت آنکھوں میں اترتی چلی آرہی تھیں۔

○

وہ موسم بہار کے آخری دونوں کی شام تھی۔
بادام کے قطار در قطار گرنے والے پتوں سے بچ کر وہ لوگ لان کے دوسرے کونے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔
برابر والی مسز ناہید فضل اور سامنے والی بیگم شاہدہ مرزا اپنی اپنی آخری اولادوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔
دراصل یہ لوگ اسی ہفتہ دستگیر سے گلشن شفٹ ہوئے تھے۔ دستگیر میں اچھا بھلا مکان تھا۔
مگر بھیا کی ضد کے آگے مکان کے ساتھ ساتھ اماں جانی کا سارا زیور بھی بک گیا۔ جب کہیں جا کر گلشن میں یہ ادھورا بنگلہ

ہاتھ آسکا

ابا جانی نے شفٹ ہونے سے پہلے مارا مارا سے رہنے کے قابل بنوایا۔ مگر اب بھی پچھلے حصے کی فنشنگ باقی تھی۔

لان میں بس چاروں طرف درخت ہی درخت کھڑے تھے گھاس کی جگہ پر اونچے نیچے گڑھے تھے جنہیں برابر کرنے میں سب ہی لست ہو گئے تھے۔

ان تمام کاموں میں سب سے زیادہ سلمہ بڑبڑاتی رہی تھی۔ وہ شروع ہی سے دستگیر والے مکان کو چھوڑ دینے کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا اب تک جو ہوا اس کی سزا سب کو کیوں ملے مگر بھیا سر اٹھا کر چلنا چاہتے تھے۔

اسی لئے سب کو بھرا پرا گھر چھوڑ کر اس ادھورے بنگلے میں آنا پڑا۔

بلا سے جگہ ادھورا تھا تو کیا ہوا؟

یہاں پہ دستگیر والے مکان کی طرح برابر والی مسز ناہید فضل چارپائی کھڑی کرکے دیوار سے جھانکتی تو نہ تھیں۔

سامنے والی بیگم شاہدہ مرزا کا بچہ اتنا اونچا تو نہ تھا کہ دوسرے کے گھر میں پکنے والی ہانڈی میں دیکھ کر بتا سکیں کہ ادھر کی دال میں بگھار کس چیز کا ہونا چاہیئے۔

یہ دستگیر کی نسبت بڑے لوگوں کا محلہ تھا۔

یہاں پر لوگ اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا ہی راگ بجایا کرتے تھے۔

ان لوگوں کو آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو گیا۔ مجال ہے جو کسی نے پلٹ کر سن گن لینے کی کوشش کی ہو۔

آج اماں جانی اور بھیا کے کہنے پہ سلمہ خود ہی برابر والی مسز ناہید فضل اور سامنے والی بیگم شاہدہ مرزا کے گھر شام کی چائے کا کہہ آئی تھی تو یہ لوگ آج اکٹھی ہو گئیں ورنہ اب تک تو کالج آتے جاتے ان لوگوں کو سبزی لیتے ہی دیکھ پائی تھی۔

"بس آپ کے دو ہی لڑکیاں ہیں؟" بیگم مرزا نے پوچھا۔

"نہیں۔ بڑی ایک اور ہے۔ پچھلے سال تو شادی کی ہے اس کی۔ آجکل امریکا میں ہے۔ اس کا شوہر بھی وہیں رہتا ہے۔" اماں جانی نے آپا کی یاد میں کھو کر جواب دیا۔

"اور لڑکے کتنے ہیں؟" ابکی ناہید فضل بولیں۔

"لڑکا بھی ایک ہے۔" اماں جانی نے ٹھنڈی یخ آہ بھر کے جواب دیا۔ دروازہ مخصوص انداز میں بجا۔

"ابا جانی آگئے۔"

نجمہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بیٹھو۔ میں کھولتا ہوں۔ بھیا نے اٹھ کر گیٹ کھولا۔

ابا جانی ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل سا اٹھائے اندر آئے۔

"یہ کیا اٹھا لائے؟" اماں جانی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"بیگم یہ وہی بچہ ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" ابا جانی وہیں کھڑے کھڑے بولے۔

"آجائیے آجائیے یہ برابر والے فضل صاحب کی بیگم ہیں اور وہ سامنے والے مرزا صاحب کی۔" اماں جانی نے کہا تو ابا جانی سلمہ کی خالی کی ہوئی کرسی پہ آکر بیٹھ گئے۔

"کونسا بچہ؟" بیگم مرزا نے کریدا۔

اُن کے دفتر میں ایک لڑکا کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی بچے کی پیدائش پر ختم ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں وہ غریب بھی ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر ختم ہو گیا۔ مرتے وقت انھوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بچے کو اپنے گھر میں پال لیں گے۔ حالانکہ آفس والوں نے بہتیرا کہا کہ یتیم خانے میں ڈلوا دو۔ مگر میرا جی نہ مانا۔ سو آج یہ لے ہی آئے۔ اماں جانی نے ہاتھ بڑھا کر بچہ گود میں لے لیا۔

سب نے دیکھا۔

ایک دبلا پتلا بے رونق چہرے والا بچہ اماں جانی کی گود میں سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے تیوری پر بل تھے اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

"نجمہ جاؤ ابا جانی کے لئے چائے لے آؤ۔" بھیا نے نجمہ کو اٹھا کر خود اس کی کرسی پر قبضہ جما لیا۔

"نام کیا ہے اس بچے کا؟" مسز فضل نے پوچھا۔

"ماں باپ نے تو ابو عبیدہ رکھا تھا مگر ہماری بیگم کہتی ہیں کہ نام بدل دیں گے۔" ابا جانی نے نجمہ سے چائے کا کپ لے کر جواب دیا۔

"آپ لوگ کیا نام رکھیں گے؟" بیگم مرزا نام سے بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔

"اماں جانی۔ عکرمہ نام کتنا پیارا ہے!" نجمہ بے ساختہ بول دی۔ تو بھیا نے اسے اتنی زور سے گھورا کہ وہ گڑبڑا کر میز پر پڑے خالی برتن اٹھانے لگی۔

اس کے بعد بھی کافی دیر تک یہ بچہ باتوں کا موضوع بنا رہا۔ مگر نام اس کا عکرمہ ہی ٹھہرا۔

بچے کی ساری ذمہ داری اماں جانی پر تھی۔

سلمہ اور نجمہ کالج جاتی تھیں۔ پڑھائی سے انہیں اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ بچے پر توجہ دے سکیں۔

سلمہ تو ویسے بھی بچے سے الرجک تھی۔
جہاں وہ رویا اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔
نجمہ اگر کبھی ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کرتی تو اماں جانی اسے گھڑک دیتیں۔
ہر ماہ فیس بکس اور دودھ کے ڈبے لا کر دینے کے بعد بھیا بھی بچے سے دستبردار ہو جاتے تھے۔
یوں عکرمہ اکو بن کر گھسٹ گھسٹ کر بڑھتا رہا۔
وہ تھا بھی مریل سا بیمار بچہ
ہر وقت کوئی نہ کوئی روگ اس کی جان کو لگا رہتا۔
کھانسی ختم ہوتی تو زکام آن گھیرتا۔ ہاضمہ تو اس بے چارے کا ہمیشہ ہی خراب رہتا تھا۔ دراصل ڈبے کا دودھ اسے موافق نہیں آتا تھا۔ تنگ آ کر اماں جان کو محض اس کے لئے ایک بکری پالنی پڑی۔ تب کہیں جا کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے کب گھسٹنا سیکھا اور کب اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا کسی کو خبر ہی نہ لگی۔
سلمہ کی شادی پہ وہ چار سال کا تھا۔
عام بچوں سے بالکل مختلف۔
جہاں اماں جانی نے بٹھا دیا بیٹھ گیا۔
جو پہنا دیا پہن لیا
جو کھلا دیا کھا لیا۔
بھوک لگنے پر بھی کبھی منہ سے کچھ نہ کہتا۔ بس مُڑ مُڑ ایک ایک کا منہ دیکھا کرتا۔
اماں جانی خود ہی ترس کھا کر کچھ کھلا دیتیں۔
زبان کا استعمال تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔
سلمہ کی شادی پر خاندان بھر کے بچے اودھم مچاتے پھر رہے تھے اور یہ ایک کونے میں بیٹھا سب کو دیکھتا رہتا۔
ایک دن رشو خالہ کے بیٹے کو نہ جانے کیا سوجھی کھیلتے کھیلتے اکو کے کاٹ لیا۔
آخر کو انسان تھا بلبلا کر رو دیا۔
نجمہ ولیمہ پر پہننے والے کپڑوں پہ استری کر رہی تھی۔ اسکے رونے کی آواز سن کر باہر جھانکا تو کیا دیکھا کہ اکو کے ہاتھ سے لپ لپ خون بہہ رہا ہے۔ استری بند کئے بغیر باہر بھاگ کر آئی۔
اکو کو اٹھا کر اماں جانی کے کمرے میں لے گئی۔ وہاں سب ہی جمع تھے۔
کسی نے خون پونچھا۔
کسی نے دوائی لگائی۔
تو کوئی پٹی باندھنے دوڑا۔
اکو بے چارے کو پہلی بار توجہ ملی تھی
وہیں نجمہ کی گود میں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔
اتنے میں صابر ماموں کی بیٹی بھاگی آئی۔
"نجمہ باجی۔ آپ جس سوٹ پہ استری رکھ آئی تھیں وہ تو سارے کا سارا جل گیا۔"
اتنا سننا تھا کہ نجمہ نے اکو کو وہیں پھینکا اور خود اندر بھاگی۔
وہ بے چارہ چپچپاتی آنکھوں سے صورت حال سمجھتا ہی رہ گیا۔
ہزار روپوں کے بنے بنارسی غرارہ سوٹ کا ستیاناس ہو کر رہ گیا تھا۔ جلا بھی اس بے تکے پن سے تھا کہ ٹھیک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خبر اماں جانی کو بھی پہنچ گئی۔ انھوں نے تو وہ لتے لئے کہ نجمہ روتے روتے بے حال ہو گئی۔
کچھ تو سوٹ کے جل جانے کا غم۔
کچھ اکو پر چڑھ آنے والے بخار کی فکر"
وہ جل بھن کر ولیمے ہی میں نہ گئی۔
اماں جانی پر مطلق اثر نہ ہوا۔ چلتے وقت انھوں نے اکو کے پاس جانے پر پابندی لگا دی اور اسے برابر والی مسز ناہید فضل کی آپا کے سپرد کر گئیں

○

وہ اسکول سے بہت ساری خوشیاں سمیٹے گھر واپس آیا تو ابا جانی کو برآمدے میں اخبار پڑھتے پایا۔
اماں جانی غالباً کچن میں تھیں۔
بھیا اور بھابی بدستور کہیں گئے ہوئے تھے۔
لان میں نجمہ آپا کے بچے بھیا کے مراد کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ننھے مراد میاں ڈگمگ ڈگمگ چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔
آصفہ اور عمیر تالیاں بجا بجا کر اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔
وہ وہیں برآمدے اور لان کی درمیانی حد میں کھڑے ہو کر یہ کھیل دیکھنے لگا۔
مراد کی ادھ کھلی آنکھوں اور گل گوتھنا جیسے گالوں پہ پھیلی ہوئی خوشیوں کی لہریں اسے بہت اجنبی لگیں۔
میں جب اتنا بڑا ہوں گا تب میرے ساتھ کون اس طرح کھیلتا ہو گا۔
وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا
"یہاں کیا کر رہے ہو اکو؟" اماں جانی نجانے کب کچن سے نکل کر آ گئی تھیں۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔
وہ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔
"کچھ نہیں اماں جانی۔" اس نے آہستہ سے کہا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں پر مڑ گیا۔
کمرے میں آکر اداسی اور بھی بڑھ گئی۔
میں اتنا اداس کیوں رہتا ہوں۔
میں اس قدر اینڈی بینڈی باتیں کیوں سوچا کرتا ہوں۔
سچ کہتے ہیں ماسٹر صاحب میں ذہنی طور پر اپنی عمر سے زیادہ بڑا ہو گیا ہوں۔
ان میں سے کوئی بھی تو میرے ساتھ برا سلوک نہیں کرتا
اماں جانی - ابا جانی - بجیا - بھابی - کسی نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا۔
کبھی کسی چیز کی تکلیف نہیں ہونے دی۔
رہنے کو الگ کمرہ ملا ہوا ہے۔
اسکول کا سارا خرچہ بھی یہی لوگ برداشت کرتے ہیں۔
کسی کے ماتھے پر بل نہیں آتا۔
ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ اس سے اچھا سلوک اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں اداس رہتا ہوں۔
اپنے خول میں بند رہتا ہوں
کبھی نجمہ آپا اور سلمہ آپا کے بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش ہی نہیں کی۔
ایک مراد ہی تو ہے جسے کبھی کبھی باہر گھما لاتا ہوں۔
بس یہی ایک کام، یہی ایک ذمہ داری میں نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ اس پر بھی انجانے کاموں کی تھکن سوار رہتی ہے
وہ بہت بے چین ہو کر کھڑکی میں آکر کھڑا ہو گیا
آصفہ کے بے ساختہ قہقہے اوپر تک آرہے تھے۔
عمیر مراد کو کمر پہ لاد کر گھوڑا گھوڑا کھیل رہا تھا۔
میں ایسا کیوں نہیں کرتا۔
میں اسی طرح کیوں نہیں کھیلتا۔
کیا کسی طرح کی پابندی ہے مجھ پر
تنگ آکر اس نے الماری سے کپڑے نکالے اور نہانے چلا گیا۔
آج اسکول میں لیے ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر بہت شاباش ملی تھی۔
اسی لئے وہ اتنا اداس ہو رہا تھا۔
گھر میں آکر اگر وہ سب کو ٹیسٹ کی کاپی دکھاتا تو یقینی شاباش ملتی۔ مگر گھر آکر ان بچوں کو یوں خوش ہوتے دیکھ کر اس کا دل نہ چاہا کہ اپنی کاپی دکھائے
نہ جانے شاید وہ غیر شعوری طور پر ان کے چہکنے سے جل گیا تھا۔
اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔
وہ اسکول سے خوش خوش گھر واپس آتا اور گھر میں گونجتے قہقہے اسے اداس کر دیتے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ اسے وہ آج تک نہ سمجھ پایا تھا۔
اسے اس گھر کے مکینوں سے
ان چہکتے ہوئے بچوں سے
کسی قسم کی کوئی پرخاش نہ تھی۔ پھر بھی وہ انہیں ہنستے دیکھ کر بجھ جاتا تھا۔ اداسی اس کے رگ و پے پر چھا جاتی تھی۔ اسی لمحہ سے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا تھا۔ جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی تھی۔
مگر ان تمام باتوں کا علاج بھی نہ تھا اس کے پاس۔
ڈوبتی شام کے سائے سرک سرک کر کھڑکی سے اندر آرہے تھے۔ نیچے لان میں شفاعت بھائی کسی بات پر نجمہ آپا سے لڑ رہے تھے۔ اسے شفاعت بھائی کبھی اچھے نہ لگے۔
نجانے انہیں نجمہ آپا سے کیا پرخاش تھی۔ اچھی بھلی خوب صورت اور سلیقہ مند ہونے کے باوجود ان کا طرز عمل کبھی بھی نجمہ آپا سے اچھا نہ رہا۔ ان کی بات بات پر شک کرتے تھے۔ کبھی انہیں اکیلا کہیں آنے جانے بھی نہ دیتے تھے۔
بچے ان کے طرز عمل کی وجہ سے الگ سہمے سہمے رہتے
نجانے کس بات کا زعم تھا انہیں۔
چھوٹے سے قد اور افریقیوں جیسی رنگت کے باوجود نجمہ آپا سے اچھا سلوک نہ کرتے تھے۔
نیچے لڑائی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اس وجہ سے اس نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔
اماں جانی کے بیچ میں پڑنے سے بات کچھ رکی، مگر شفاعت بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ نجمہ آپا بھی ان کے پیچھے سر جھکائے چل دیں۔ ہنستے مسکراتے آصفہ اور عمیر بھی سوکھا سا منہ لئے چلے گئے تو اسے بہت سکون ملا۔ اس نے نیچے آکر روتے ہوئے مراد کو گود میں اٹھا لیا اور باہر چلا گیا۔
وہ کہاں کہاں گھومتا رہا۔ اسے کچھ یاد نہیں۔ ہاں البتہ جب واپس آیا تو مراد اس کے کندھے پر سر رکھ کر سو گیا تھا اور خود

اس کے پاؤں تھک کر بیدم ہو گئے تھے۔ بھیا اور بھابی ڈنر سے واپس آ گئے تھے۔ ابا کو ان کے پاس چھوڑ کر اماں جانی کے کہنے پر وہ کھانا کھانے چلا گیا۔

اس رات اسے بہت سکون سے نیند آئی۔

میٹرک کے بعد اس نے سوچا تھا کہ کوئی نوکری کرے گا مگر ابا جانی نے کالج کا فارم لا کر سامنے ڈال دیا۔

لوگ کالج میں داخلے کی خاطر ایک ایک کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ ایک وہ تھا بہت بے دلی سے کالج جاتا۔

دراصل اللہ میاں کسی کو بن مانگے دے دیتا ہے اور کوئی تمام عمر پیاسا کا پیاسا رہ جاتا ہے۔

اتنی بے زاری سے کلاسیں اٹینڈ کرنے کے باوجود انٹر میں اچھے نمبر آنے پر ایک بار پھر ابا جانی نے اس کی مرضی معلوم کیے بغیر انجینئرنگ میں داخلہ دلوا دیا۔

وہ تھرڈ ائیر میں تھا جب ایک رات ابا جانی ایسے سوئے کہ صبح اٹھ نہ پائے۔

یہ بھرے پرے خاندان کی پہلی موت تھی۔

بچہ بچہ لگتا تھا انگاروں پر کھڑا کر دیا گیا ہو۔

اب تک وہ اپنے کو نے پالک لڑکا سمجھ کر ابا جانی سے دور دور رکھتا تھا۔ ان کی موت کے بعد احساس ہوا کہ یہ ابا جانی ہی تو تھے جو اس کے سب سے نزدیک تھے۔

نغمہ آپا جو بہنوں اور بھائی کی شادی پر نہ آ پائیں تھیں باپ کی موت پر روتی پیٹتی امریکہ سے آن پہنچیں۔

اس وقت گھر میں ہر طرف اسی کی پکار پڑ رہی تھی

نغمہ آپا نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

وہ اماں جانی کے لیے دودھ میں گلوکوز گھول رہا تھا جب ہی نغمہ آپا نے آہستہ سے نجمہ آپا سے پوچھا۔

”یہ وہی ہے نا؟“

”ہاں یہ“ نجمہ آپا نے گہرا سانس لیکر جواب دیا۔

”کمال ہے۔ تم دونوں میں بہت کم فرق لگتا ہے۔ بالکل تلے اوپر کے بھائی بہنوں جیسا۔ ویسے بھی تم ان دنوں کل تیرہ سال ہی کی تو تھیں۔ ہائے کچی عمر کی لڑکی بھی کتنی معصوم ہوتی ہے آنکھیں بند کر کے چلنے کی عادی۔ آہ۔ ہائے“ نغمہ آپا کی ٹھنڈی سی آہ پر اسکے ہاتھ سے دودھ چھلک پڑا۔

یہ کیا کہہ رہی تھیں نغمہ آپا۔ وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ مگر یہ گتھی حل ہونے میں نہ آئی۔ اور حل ہوتی بھی تو کیسے۔ اس میں کسی

لینے کی ہمت نہ تھی۔

کسی کو کیا غرض تھی جو ایک نے پالک لڑکے کو سوچوں میں دیکھ کر اسکے یوں گم سم رہنے کا سبب پوچھتا۔

ذہن پہ بوجھ لیے وقت کے لمحوں کو پیچھے دھکیلتا رہا۔

ایک دن وہ ہمیشہ کی طرح کالج سے واپس آ رہا تھا۔ ہوا خاصی تیز چل رہی تھی کہ اچانک اسے لگا جیسے کوئی پردہ سا آ کر آنکھوں پہ پڑ گیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اسکوٹر روک لی۔

یہ دوپٹہ تھا جو اڑ کر سیدھا اس کے منہ پر لپٹ گیا تھا

اس نے دوپٹہ ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر دیکھا

دوپٹے والی لڑکی کتابوں کو سینے سے لگائے شرمندہ شرمندہ سی اسکے نزدیک دوپٹہ لینے آئی۔

یہ ڈھنگ سے اوڑھنے کی چیز ہے۔ سڑکوں پہ اڑانے کے لیے نہیں۔ عکرمہ نے جل کر لڑکی سے کہا اور دوپٹہ دے کر اس کا جواب سنے بغیر ایک زوردار کک سے اسکوٹر اسٹارٹ کر کے چل دیا۔

دوسرے دن غیر ارادی طور پر اس نے کل والی جگہ سے گزرتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

وہی لڑکی سر سے دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔

عکرمہ کے دل میں عجیب سے جذبات مچل اٹھے۔

لڑکی کے یوں دوپٹہ اوڑھنے سے خوشی تھی تو ساتھ ساتھ شرمندگی بھی کہ کل اس نے اتنے سخت الفاظ میں لڑکی کو تنبیہہ کی۔

وہ جو کوئی بھی تھی۔

پہلی لڑکی تھی جسکو اس نے غور سے دیکھا۔

ورنہ اب تک نجمہ آپا کی آصفہ اور کاشفہ کو دیکھتا آیا تھا یہ دونوں لڑکیاں اسے اپنی اولاد جیسی لگتی تھیں۔ ان پر غلط نظر ڈالنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھیا کی عاشی بہت چھوٹی تھی۔ صرف سال بھر کی اور ہر وقت اس کی گود میں چڑھی رہتی تھی۔ یہ دوپٹہ والی لڑکی اچھی بھلی ڈسٹرب کر دینے والی شخصیت تھی۔ ساری رات عکرمہ کی آنکھوں کے سامنے شرمندہ شرمندہ سی کھڑی رہی۔

درمیانے قد کی نازک سی بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی عکرمہ صرف اس کی آنکھیں ہی غور سے دیکھ پایا تھا۔

آنکھیں جن میں ندامت تھی۔

پریشانی تھی۔

ان جذبوں سے مل کر چھلکی ہوئی آنکھیں۔
جن پر لمبی لمبی پلکوں کی جھالریں تنی ہوئی تھیں۔
بس یہی وہ آنکھیں تھیں جو عکرمہ کے ذہن پر چپک کے رہ گئی تھیں۔
آنکھوں کے راستے دل میں اتر آئی تھیں۔
لہو بن کے جسم میں گردش کرنے لگی تھیں۔
ہر لمحہ اسکے ساتھ رہتی تھیں۔
وہ روز واپسی پر اس تصویر کے تصور میں اور بھی رنگ بھر لیتا تھا۔
اس لڑکی کو بھی شاید عکرمہ کے روز یوں پلٹ پلٹ کر دیکھنے کا احساس ہو گیا تھا۔
جبھی تو اس کی آمد پر سنبھل جاتی تھی۔
دوپٹہ البتہ روز ہی سر پہ ہوتا تھا۔
اب تو سہیلیاں بھی دبے دبے لفظوں میں چھیڑنے لگی تھیں۔
عکرمہ روز ہی ان کی مسکراہٹوں کے عکس کو آئینے میں محسوس کیا کرتا تھا۔
ایک دن نہ جانے اس کی دعاؤں کا اثر تھا یا لڑکی کی۔
ایکا ایکی اسکوٹر کے بریک خراب ہو گئے۔
لاکھ ٹھونکا پیٹی کے باوجود نہ ٹھیک ہوئے تو تنگ آکر اس نے سروس کے لئے دیدیا۔
صبح آفس جاتے ہوئے بھیا اسے چھوڑ گئے۔
مگر واپسی میں بھیا کا آفس چار بجے چھوٹتا تھا۔
اس وجہ سے مدت بعد اسے بس میں جانا پڑا۔
اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اسی بس میں وہ لڑکی اپنے گروپ کے ساتھ چڑھی۔
بس میں رش کافی تھا۔ وہ سیٹ پر بیٹھے ہونے کے باوجود لوگوں کے ہجوم میں چھپ کر رہ گیا تھا۔
پروین۔ آج وہ نہیں آیا تیرا دوپٹے والا۔ بلاوجہ ہی دو بسیں چھوڑیں۔ اس کی ساتھی لڑکی نے اتنے زور سے کہا کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔
تو یہ لڑکی محض میرے انتظار میں کھڑی رہتی تھی۔
اور میں دوستوں سے خوب گپیں لڑانے کے بعد واپس جاتا تھا۔ کتنا برا ہوں میں۔ اسے افسوس ہونے لگا۔
کچھ اسٹاپ کے بعد پروین اتر گئی۔
اور وہ لوگوں کے ہجوم میں پھنسا اترنے کا سوچتا ہی رہ گیا۔

دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر بس میں آیا۔ آج بھی اس نے محض پروین کی وجہ سے اسکوٹر ورکشاپ سے واپس نہ لی تھی کل اس نے پروین کا اسٹاپ ذہن نشین کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے آج اترنے میں آسانی ہوئی۔
بازار کے بعد راستہ نسبتاً سنسان تھا۔
گلی میں مڑتے ہوئے پروین نے اسے دیکھا اور حیران ہو کر رک گئی۔
"آپ یہاں کیسے؟"
اس نے بوکھلا کر پوچھا۔
"میرا اسکوٹر خراب ہو گیا ہے۔ آپ ہی کی بس میں آیا ہوں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ کچھ دور پر میرے دوست کا گھر ہے۔ وہاں جا رہا ہوں۔ اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔
پروین مطمئن ہو گئی۔
آپ بھی یہیں رہتی ہیں کیا؟
"جی ذرا آگے۔" پروین نے گول مول جواب دیا۔
اس دن دوپٹے کے سلسلے میں اتنی تلخ بات کہہ دینے پر یقین جانئے مجھے سخت ندامت ہے۔" عکرمہ نے ساتھ چلتے ہوئے بات بڑھانی چاہی۔
"نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کسی نے تو سیدھی راہ دکھائی۔ ورنہ ہمارا گھرانہ تو اتنا ماڈرن ہے کہ میری باجیاں تو دوپٹہ اوڑھتی ہی نہیں ہیں۔" پروین نے سادگی سے کہا۔
"اچھا بڑی حیرت ہوئی یہ سن کر۔ گھرانہ تو ہمارا بھی خاصا ماڈرن ہے مگر ابھی اسلامی قدروں سے دور نہیں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس روز آپ کا دوپٹہ اڑتے دیکھ کر بڑا عجیب لگا تھا" عکرمہ کی بات پر پروین رک گئی۔
"آپ پڑھتی ہیں؟" عکرمہ نے پوچھا۔
"نہیں۔ بی۔ اے کے بعد میں نے فائن آرٹ کالج جوائن کر لیا ہے۔ وہیں جاتی ہوں کمرشل آرٹ سیکھنے۔ آپ برا نہ مانیں تو اپنی منزل کو مڑ جائیں تاکہ میں اپنی طرف جا سکوں۔ پروین نے سوچ کر کہا۔
"اگر میری منزل وہیں ہو جہاں آپ کی منزل ہے تب کیا کروں۔" عکرمہ کے جواب پر وہ ہنسنے لگی۔
سامنے سے ایک گاڑی آنے لگی تو دونوں ہی چونک پڑے۔
"میں کل عزیز بھٹی پارک میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

عکرمہ آہستہ سے کہہ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

اس دن وہ بہت خوش خوش گھر واپس آیا

عاشی برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی کھیل رہی تھی۔

عکرمہ نے فائل اسٹول پہ رکھ کے اسے اٹھا لیا اور نچانا شروع کر دیا۔

عاشی کے قہقہے سن کر بھابی کمرے سے نکل آئیں۔

"کیا بات ہے عکرمہ آج بہت خوش نظر آرہے ہو۔" انھوں نے اسے بچوں کی طرح یوں گول گول گھوم کر عاشی کو نچاتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں تو بھابی بات تو کوئی بھی نہیں۔ عاشی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ پھیلا دیئے تو میں نے اسے اٹھا لیا۔" وہ جھینپ کر بولا۔

"چلو کوئی بھی بات ہے۔ شکر ہے کہ آج تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی۔ ورنہ اب تک تو میں سمجھی تھی کہ شاید ڈاکٹر نے تمہیں ہنسنے کے لئے منع کیا ہوا ہے۔" بھابی ہنستے ہوئے بولیں۔

عکرمہ نے دل کھول کر قہقہہ لگایا

"دلہن کون آیا ہے؟" اماں جانی نے اس کے قہقہے کی آواز سن کر باہر نکل کے پوچھا۔

"لو ایک ثبوت یہ اور مل گیا تمہارے نہ ہنسنے کا۔ اماں جانی بھی اس کے ہنسنے پہ کافی خوش نظر آتی تھیں۔

عکرمہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا بیٹا کہ تم چپ ہو جاؤ۔ جانے تم نے اپنے کو ہمیشہ اس گھر میں اجنبی کیوں سمجھا۔ حالانکہ کسی نے آج تک تم سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی۔ پھر بھی تم بس اپنے کام ہی سے کام رکھتے ہو۔ کبھی ہم لوگوں میں گھلنے ملنے کی کوشش ہی نہ کی۔" اماں جانی نے موقع دیکھ کر آج کہہ ہی ڈالا۔

عکرمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس فائل اٹھا کر اوپر آنے لگا تو سیڑھیوں پہ رک کر اس نے سنا بھابی اماں جانی سے کہہ رہی تھیں۔

"ناحق کو آپ نے اسے ٹوکا۔ آج پہلی بار تو گھر میں ہنسا تھا، ہنس لینے دیتیں۔"

"تم ہی ایمان سے بتاؤ دلہن میں نے کوئی غلط بات کہی۔ اس گھر میں اسے کب تکلیف ہے۔ کون اسے روک ٹوک کرتا ہے پھر بھی یہ ہمیشہ اجنبی ہی رہا۔" اماں جانی پھسر پھسر رونے لگیں۔

وہ بوجھل دل لئے اوپر آگیا۔

"کیا بات تھی۔ وہ ایسا کیوں تھا؟"

اماں جانی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی ہمیشہ اجنبیوں کی طرح اس گھر میں رہتا آیا تھا

کالج سے آکر سیدھا اوپر آجاتا۔

کھانے پر آوازیں پڑتیں تو آتا۔ اگر کسی دن کوئی بھول جائے تو وہ چپکا بیٹھا رہتا۔

اس حرکت پہ اماں جانی اوپر آکر خوب ڈانٹتیں مگر اف نہ کہتا۔

جب تک ابا جانی زندہ رہے کپڑوں کا خیال وہی رکھتے تھے۔ ساتھ لے جا کر خود کپڑے دلواتے۔ درزی کے ہاں بھی خود ہی لے جاتے۔ ان کے مرنے کے بعد بھیا نے یہ ذمہ داری سنبھالی پہلے پہل تو انھوں نے پیسے دے کر دیکھا اور جب مہینے گزر جانے پر بھی پیسے جوں کے توں اس کی دراز میں پڑے رہتے اور وہ اپنے پرانے کپڑوں کو خود ہی الٹا سیدھا سی کر پہن کے جاتا رہا تو تنگ آکر ایک دن انھوں نے بھابی کے ذمے یہ فرض بھی کر دیا۔ اب بھابی ہی اس کو ساتھ لے جا کر کپڑے دلوائیں اور وہیں کے وہیں درزی کو دے آتیں۔

وہ اس پورے گھر میں مانوس بھی صرف بھابی ہی سے تھا۔

اگر کوئی بہت ہی اشد ضروری کام ہوتا تو بھابی ہی سے کہتا۔ ورنہ اماں جانی اور ان کے جگر گوشوں کو دیکھ کر تو اس پہ چپ کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے بھابی سے بھی وہ اسی لئے مانوس تھا۔ کیونکہ وہ بھی بن باپ کی تھیں۔ پھوپھی نے انہیں پالا تھا۔

بقیہ لوگوں کو دیکھ کر وہ گونگے کا گڑ کیوں کھا لیتا تھا یہ بات وہ خود بھی آج تک نہ سمجھ پایا تھا۔

بس عجیب سی اداسی تھی جو ان لوگوں کے سامنے اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔

ابھی پچھلے ہی دنوں کی تو بات تھی۔

مراد کی سالگرہ پہ وہ سارا دن بھابی کے ساتھ ساتھ کام کرواتا رہا۔

ایک ایک چیز قرینے سے لگائی۔

حتیٰ کہ مراد کے کپڑوں پہ استری تک اس نے کی۔

مگر شام کو جیسے ہی سلمیٰ آپا اپنے بچوں سمیت آئیں وہ

ان کی صورت دیکھتے ہی اوپر بھاگا

اسے یوں جاتے دیکھ کر سلمہ آپا کا منہ بن گیا۔

ہم لوگوں سے تو یوں بدکتا ہے جیسے ہم قصائی ہوں اور اسے حلال کرنے جا رہے ہوں۔ انھوں نے تنک کر بھابی سے کہا۔

آج ہی کی طرح اس دن بھی وہ اوپر آکر سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔

کیا بات تھی وہ ان لوگوں سے کیوں بدکتا تھا

آج تک کسی نے اسے ٹکڑوں پہ پلنے کا طعنہ نہیں دیا۔

کبھی کسی نے اسے لے پالک نہیں کہا

سب ہی اپنا چھوٹا بھائی کہہ کر اسے متعارف کرواتے تھے۔

پھر کیا بات تھی؟

آخر کیا سبب تھا؟

کتنا برا ہے وہ۔ ان لوگوں کے احسانوں کا بدلہ کیسے دے رہا تھا۔

آج اماں جانی بھی رو پڑی تھیں۔

مگر یہ تو بتاؤ عکرمہ جی۔ آج تک تم کو کسی نے سینے سے لگایا۔

کونسا ایسا ہاتھ تھا جو تمہارے لیے دست شفقت بن کر سر تک آیا ہو۔

"تم انسان ہو عکرمہ۔

اور یہ انسان جو مٹی سے تکمیل پاکر گوشت پوست کا جیتا جاگتا مجسمہ بن جاتا ہے تو اسی انسان کے سینے میں گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے جو محبت مانگتا ہے۔

جو شفقت کا بھوکا ہوتا ہے۔

جو انسیت کا پیاسا ہوتا ہے۔

انسان کے سینے میں پلنے والے یہ جذبے دولت سے نہیں دبتے۔

یہ پیاس پیسوں سے نہیں بجھتی

اچھا کھانا اور پر آسائش رہائش اس بھوک کو نہیں مٹا سکتی۔ تو پھر عکرمہ جی سارے انسان بالکل تمہاری طرح ہو جاتے ہیں۔

چپ چپ گم سم رہنے والے

دل کا بھید نہ کہنے والے

تم اپنی اس حالت پر کیوں پریشان ہو۔

یہ تو بالکل فطری امر ہے

ایک دم قدرتی بات

گاڑی کے مسلسل ہارن پر اس نے دل کی ان اونگ بونگ باتوں سے چھٹکارا حاصل کیا۔

بھیا آگئے تھے۔

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

مراد اور عاشی دونوں ایک ساتھ ان کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔

وہ پھر بجھ گیا

اے اللہ یہ محبت

یہ چاہت بھرے لمحے میری جھولی میں کیوں نہ آئے

میرا دامن کیوں خالی رہا۔

کیا میں ہمیشہ یونہی رہوں گا پیاسا کا پیاسا۔

دوسرے دن جب عزیز بھٹی پارک کے بیچوں بیچ بنائی گئی نہر کے کنارے بیٹھ کر وہ پروین سے باتیں کر رہا تھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ پیاس بجھ سکتی ہے۔ زندگی میں ایک ہستی ایسی بھی آتی ہے جو سارے جذبوں کو بھرپور تسکین عطا کر سکتی ہے۔

ماں کی شفقت

بہن کا پیار

اور بیٹی کی محبت

یہ ساری چیزیں ایک اچھی بیوی میں یکجا ہو سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے پروین اسے بہت مکمل لگی۔

بہت بھرپور

سنو پروین۔ تمھیں پتہ ہی ہے کہ میرا فائنل ایر ہے تین ماہ بعد امتحان ہو جائیں گے اور اس کے بعد انشاء اللہ کہیں نہ کہیں سروس مل ہی جائے گی۔ اور سروس ملتے ہی میرا وعدہ ہے کہ میں گھر والوں کو تمھارے ہاں لے آؤں گا۔ تب تک پلیز پروین مجھ سے ملتی رہنا۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ میں بکھر جاؤں۔ غلط راہوں پہ لگ جاؤں۔ کیونکہ آج کل میرے ذہن میں بہت ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ بڑے عجیب عجیب خیالات دل کو چھوتے رہتے ہیں۔ میں بہت پیاسا ہوں۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔ پلیز پروین مجھ سے رابطہ منقطع نہ کرنا۔ وہ بہت جذباتی ہو چلا تھا۔

پروین اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ یہ کیسا لڑکا تھا۔

پہلی ڈیٹنگ میں شادی کی بات کرنے لگا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کے کسی بوائے فرینڈ نے ایسی بات نہیں کی تھی۔ نہ

ہی اس کی کسی سہیلی نے بتایا تھا کہ ان کے بولائے فرینڈز ایسی باتیں کرتے تھے۔ دراصل وہ اب تک محض وقت گزاری کے لئے ملتی رہی تھی۔ یہ پہلا انسان تھا جو ٹوٹ کر جذبات کا اظہار کرنے لگا تھا۔ ویسے اُسے یہ خاصا ٹھیک لگا۔ اس کا مستقبل روشن تھا۔ پھر کوئی ذمہ داری بھی نہ تھی۔ اس کے ساتھ شادی ہو جانے میں کوئی نقصان بھی نہ تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ مجھے فون کرلیا کیجیے گا۔" پروین نے اسے تسلی دی۔

"ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں رات کو دس بجے کے بعد فون کیا کروں گا۔"

اس رات عکرمہ نے الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبہ سے تعلق رکھنے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹیلیفون کے تاروں میں جوڑ توڑ کرکے اپنے کمرے میں بالکل خفیہ فون لگالیا۔

رات کو وہ نیچے والے فون کا سلسلہ منقطع کرکے اپنے فون کا تار لگا لیتا اور صبح کالج جانے سے پہلے اپنا فون نکال کر گھر کا فون فٹ کر دیتا۔ دو ماہ تک یہ سلسلہ بڑے آرام سے چل گیا

دونوں رات بھر باتیں کرتے۔

زندگی سے بھرپور باتیں۔

مستقبل کی باتیں۔

دل کے نہاں خانوں میں جنم لینے والے جذبات کی باتیں۔

ایک رات سلمہ آپا کے میاں کو اپنڈکس کا درد اٹھا۔ وہ رات گئے تک فون کرکر کے تھک گئیں۔ آخر خود ہی بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر میاں کو ہسپتال لیکر گئیں۔

صبح بھیا کے جانے سے پہلے آن دھمکیں۔

"شاباش ہے تم لوگوں پر رات گئے اتنی دیر تک فون پر باتیں کرتے ہو۔ میں فون کرکر کے تھک گئی۔ مسلسل لائن انگیج ملی۔ میرے میاں کا جو حشر ہوتا تھا تنگ آکر مجھے خود ہی ہسپتال جانا پڑا۔ کس سے باتیں کررہے تھے تم سجاد۔"

وہ بھیا پر برس پڑیں۔

"ہوش میں تو ہیں سلمہ آپا۔ میں کس سے باتیں کروں گا" بھیا جل گئے۔

"میں نے آپریٹر سے پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگا ایک لڑکا اور لڑکی باتیں کررہے ہیں۔" سلمہ آپا بہت غصے میں تھیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی سلمہ آپا۔ فون تو ہمارے بیڈروم میں رہتا ہے۔ سجاد تو رات بھر بے خبر سوتے رہے تھے۔ البتہ مجھے ہی عاشی کے بیماری کی وجہ سے کئی بار اٹھنا پڑا تھا۔

بھابی نے بھیا کی حمایت کی۔

لیکن عکرمہ کے کاٹو تو لہو بدن میں نہ تھا

وہ سلائس ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

بھابی نے اٹھتے وقت اس کا زرد چہرہ دیکھ لیا تھا۔

اس وقت تو باتوں میں آئی گئی ہوگئی۔ سلمہ آپا بھیا کو ہسپتال لے کر چلی گئیں تو بھابی عاشی کو سلا کر بہانے سے اوپر آئیں۔

ساری الماریوں میں تالا لگا ہوا تھا۔ پہلے تو عکرمہ چابیاں دراز میں رکھ جاتا تھا۔ مگر آج وہ بھی غائب تھیں۔ بھابی نیچے جاکر اپنی چابیوں کا گچھا اٹھا لائیں اور جب الماری کی نچلی دراز میں کپڑوں میں چھپا ہوا فون رکھا نظر آیا تو ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہیں عکرمہ پر بڑا ترس آیا۔

کتنے چھپ چھپ کر پیار کررہا تھا وہ کسی سے۔

لوگ تو ایسے جذبے بیدار ہوتے ہی اتنے خوش ہوجاتے ہیں کہ دیواروں کو بھی خبر لگ جاتی ہے۔

اور ایک عکرمہ تھا۔

بلا کا رازداں۔

پیار کے جذبوں کو سب سے چھپائے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔

نجانے کون لڑکی ہے۔ بھابی کو تجسس ہوا۔

میں انشاء اللہ اس کا بھی کھوج لگالوں گی۔ انھوں نے دل میں عہد کیا۔

جب بھابی یہ سب سوچ رہی تھیں

عکرمہ پروین کے ساتھ ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے سلمہ آپا والی بات بتا رہا تھا۔

وہ تو سخت خوفزدہ تھا۔

مگر پروین تھی کہ ہنسے جارہی تھی۔

"نالائق ہو تم بہت۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ بتاؤ اب میں تم سے بات کیسے کروں گا؟" عکرمہ نے اداس لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری بھی بس اپر اسٹوری خالی ہے۔ ضروری ہے فون روز رات ہی کو آئے۔"

"نا بابا اب میں فون نہ کرنے کا۔ کسی نے رات کو چیک کرلیا تو کیا ہوگا؟"

"تو بس بیٹھے رہنا یونہی۔"

"یہ بھی تو نہیں ممکن۔"

"وہ کیوں؟"

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا پروین۔ تمہیں روز نہ دیکھوں اور تم سے بات نہ کروں تو مجھے جانے کیا ہونے لگتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے صبح نہ ہوئی ہو اور میرے ارد گرد رات ہو۔ ایسی رات جس میں مجھے کچھ نظر نہ آرہا ہو۔ وہ چلتے چلتے پروین کے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگا۔

"عکرمہ پلیز یہ کیا کرتے ہو؟" پروین پریشان ہونے لگی۔

"سوری پروین۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں کہاں ہوں اور ارد گرد ماحول کیا ہے۔" وہ جھجک کر سیدھا ہو گیا۔

"تمہارے امتحان کب سے ہو رہے ہیں؟"

"اگلے ماہ کی پندرہ سے۔"

"یعنی کل بیس دن باقی ہیں۔ اگر تم واقعی مجھے اپنانا چاہتے ہو تو جی لگا کر اسٹیڈی کرو۔ امتحانوں کے بعد میرا وعدہ ہے کہ روز ملوں گی۔" پروین نے سمجھایا۔

"نہیں پروین۔ اگر تم آج کل مجھ سے روز نہ ملیں اور مجھ سے باتیں نہ کیں تو تمہاری قسم میں ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکوں گا۔ بس تمہارے ہی تصور میں کھویا رہوں گا۔ اگر چاہتی ہو کہ میں دل لگا کر پڑھوں تو پلیز تھوڑا سا ٹائم مجھے ضرور دے دیا کرو۔ اس نے اتنے ملتجی لہجے میں کہا کہ پروین کو ترس آ گیا۔

"ٹھیک ہے تم روز مل لیا کرو مگر ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں اس کے بعد بھی اگر تمہارے امتحانوں میں اچھے نمبر نہ آئے تو یقین جانو میں تمہیں ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ دوں گی۔" پروین کی دھمکی پر وہ واقعی سہم گیا

اور تعلیم پر پہلے سے دگنی توجہ دینے لگا

ادھر بھابی نے بھی امتحانوں تک کچھ باز پرس نہ کی۔ جس دن امتحان ختم ہوئے اس کے دوسرے دن صبح ہی سے عکرمہ پروین کو اسکوٹر پر ساتھ لئے لئے پھرا۔ شہر کی کونسی ایسی جگہ تھی جو ان لوگوں نے چھان نہ ماری ہو۔

پروین جب بھی واپس چلنے کو کہتی عکرمہ آنکھیں دکھانے لگتا۔ پتہ ہے پورے اٹھائیس دن صرف ایک گھنٹے کی راشن پر عمل کیا ہے۔ آج میں نہیں رک سکتا۔ آج مجھے جی بھر کے گھوم لینے دو۔ میرا تو دل چاہتا ہے تمہیں لیکر اتنی دور چلا جاؤں جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ ہاکس بے کی ٹھنڈی ریت پر چت لیٹے لیٹے۔ وہ بولا۔

"ہاں۔ تاکہ دوسرے دن ہم دونوں کے اغوا ہونے کی خبریں ہمارے گھر والے چھپوا دیں اور پولیس پارٹی ہماری تلاش پر روانہ ہو جائے۔" پروین نے اس کا مذاق اڑایا۔

پروین۔ تم صبح سے میرے ساتھ ہو۔ تمہارے گھر والے ڈانٹیں گے تو نہیں؟" اس نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

نہیں۔ ان سب کو میں نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ ہمارے گھر میں ایسے لوگوں سے جو شادی کے بارے میں سنجیدہ ہوں ملنا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ میرے والدین بہت روشن خیال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح آئندہ زندگی کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مزاج کی ہم آہنگی ازدواجی زندگی کے لئے اشد ضروری ہے۔" پروین کی بات پر اس نے شکر کا سانس لیا۔ ورنہ اب تک تو وہ یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ شاید آج پروین کی زبردست باز پرس ہوگی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں تو اجنبی نہیں سمجھا جاؤں گا۔" اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔" وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

پروین کے ساتھ اتنے ڈھیر سارے دن گزار لینے کے باوجود وہ ذہنی طور پر اس کے گھر والوں کو قبول نہ کر سکا۔

لگتا تھا جیسے وہ کسی غیر ملکی گھرانے میں آ گیا ہو۔

پروین کی ممی نیچے گلے والے بغیر آستینوں کے اونچے بلاؤز پر ساری کو رسی کی طرح ڈالے ہوئے تھیں۔

پروین کی بڑی بہنیں جو شادی شدہ تھیں اور نزدیک ہی رہتی تھیں اس کی آمد کا سن کر ملنے چلی آئیں۔

ان کی حالت اور بھی بدتر تھی۔ ایک صاحبہ جسم پر سلی ہوئی میکسی بغیر دوپٹے کے پہن کر آئی تھیں۔

دوسری صاحبہ نے ٹراؤزر پر مردانی بغیر آستینوں والی چھوٹی سی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ بھی دوپٹے کی تکلیف سے آزاد تھیں۔

دم بہ دم انگلش بولتے شوہر صاحبان گود والے بچوں کو اٹھائے ان کے پیچھے آئے تھے۔

ان سب میں ایک پروین ہی تھی جو لباس اور وضع قطع کے لحاظ سے ان سب سے ڈھنگ کی معلوم ہو رہی تھی۔ پروین کے گھر والوں کا یہ حلیہ دیکھ کر اس کا جی اوبھ سا گیا۔ ممی کو ڈنر پہ جانا تھا۔ انھیں کوئی صاحب لینے آئے تو وہ وہاں چل دیں۔

اور عکرمہ ان پاکستانی برانڈ امریکنوں سے بدقت تمام جان چھڑا کر بھاگا۔

اس ساری رات وہ ڈھنگ سے سو نہ سکا۔

ہر لمحہ یہی خیال کچوکتا رہا کہ اگر پروین بھی شادی کے بعد ایسی ہی ہو گئی تو وہ کیا کرے گا۔

پھر دل کے کسی گوشے سے تسلی کی یہ صدا اٹھتی کہ پیار سے تو جانور بھی سدھر جاتے ہیں۔ یہ کیوں بھولتے ہو کہ تمہاری ہی ریکوئسٹ پر اس لڑکی نے ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنا شروع کیا تو تمہاری دوسری باتیں نہ مانے گی۔

بس یہی خیال ذرا سکون بخش تھا۔

ورنہ آج تو پروین کے گھر جا کر وہ بے حد بیکل ہو گیا تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ وہ رات بھر جاگنے کے سبب دیر تک پڑا سوتا رہا۔

بھابی نے نوکر بھیج کر اسے اٹھوایا تو اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔

وہ بھاگم بھاگ تیار ہو کر نیچے آیا تو وال کلاک کی سوئیاں گیارہ پہ پہنچ چکی تھیں۔

بھیا اور مراد بال کٹوانے گئے ہوئے تھے۔

اماں جانی برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔

"آج بڑی دیر تک سوتے رہے۔" بھابی اس کے لئے ناشتہ گرم کرتے ہوئے بولیں۔

"ہاں بھابی جان نہ جانے کیوں رات کو نیند نہیں آئی۔ صبح آنکھ لگی تھی۔ اگر شرفو اٹھانے نہ آتا تو نہ جانے کب تک پڑا سویا کرتا۔" وہ ناشتہ کرتے ہوئے بولا۔

بھابی ہنسنے لگیں۔

"کیوں آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کئی دنوں سے تمہارے اندر بڑی واضح تبدیلیاں آئی ہیں اب راتوں کو اختر شماری بھی کرنے لگے ہو۔ لگتا ہے بچو کوئی چکر شروع کر دیا ہے تم نے۔" انھوں نے کھنچائی کی۔

"نہیں بھابی ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے بات ٹالی۔

"ہمارا کیا ہے مت بتاؤ۔ تمہارے بھیا نے کہا تھا پوچھنے کو۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر واقعی تم سیریس ہو تو پیغام وغیرہ بھیج دیا جائے" بھابی نے شوشہ چھوڑ دیا۔

"کیا مطلب۔ کہاں پیغام بھیجنے کا ارادہ ہے؟" عکرمہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اسی کے گھر جس کے ساتھ آج کل گھوما کرتے ہو۔" بھابی نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو سیدھا جا کر عکرمہ کے دل پہ لگا۔ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بھابی۔ کس کے ساتھ گھومتا ہوں میں۔ وہ روہانسا ہو چلا تھا۔

مجھے کیا خبر تمہارے بھیا کہہ رہے تھے کہ انھوں نے تمہارے ساتھ اسکوٹر پہ کوئی لڑکی دیکھی تھی۔" بھابی کی بات پہ تو واقعی سہم گیا۔ منھ سے کچھ نہ بول پایا۔ بس ٹکر ٹکر بھابی کو دیکھتا رہ گیا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہاں تو سب ہی تمہارا پیغام وہاں لے جانے پر راضی ہیں۔" بھابی کی تسلی پر وہ ہار کر بیٹھ گیا

"ٹھیک ہے۔ مگر پہلے آپ چل کر بات کر لیجئے۔ بقیہ لوگوں کو بعد میں لے جاؤں گا۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟"

"نارتھ ناظم آباد میں۔"

"لڑکی کے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وہ بزنس مین ہیں۔ زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔"

"بھائی بہن کتنے ہیں؟"

پروین کے علاوہ دو بڑی بہنیں اور دو بھائی اور ہیں۔ بھائی باہر ہی کے شہری ہو گئے ہیں۔ البتہ بہنیں وہیں نزدیک ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی ہے پروین کے سوا۔" عکرمہ نے آہستہ آہستہ تفصیل بتائی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں تمہارے ساتھ ان کے ہاں چلوں گی۔ تم ان لوگوں کو فون کر کے مطلع کر دینا۔" بھابی نے باہر جاتے ہوئے مژدہ سنایا۔

تو شام تک کا وقت کاٹنا عکرمہ کے لئے مشکل ہو گیا۔

پانچ بجے وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو دیکھا بھابی پہلے ہی اس کی منتظر تھیں۔

آج بھی پروین کے گھر دونوں بہنیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ موجود تھیں۔

پروین کی ممی بڑے تپاک سے بھابی کے ساتھ پیش آئیں۔

پروین کے والد افریقہ سے واپس آنے والے تھے۔ بات ان کے آنے پر آ کر اٹک گئی۔

پروین کے والد آ گئے تو بھابی نے ان کے پورے گھرانے کی لمبی چوڑی دعوت کر ڈالی۔

بہنوں نے تو اپنی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کر لی تھی مگر پروین والدین کے ساتھ آ گئی۔

جب یہ لوگ آئے اماں جانی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں اور بھیا شیرمالیں لینے بازار گئے ہوئے تھے۔

اماں جانی کے باہر آنے تک بھابی اور عکرمہ نے انہیں باتوں میں لگائے رکھا۔

اماں جانی جب نماز پڑھ کے لان تک آئیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

"ارے اماں جانی آپ!" پروین کی ممی اٹھ کھڑی ہوئیں

"پروین تمہاری بیٹی ہے رقیہ۔ اور یہ ظفر ہیں کس قدر بدل گئے ہیں"

"تم لوگ!" اماں جانی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں اماں جانی زمانہ بدل گیا تو ہمیں بھی بدلنا پڑا۔" ظفر صاحب جھینپ کر بولے۔

"آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بھابی نے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں دستگیر میں ہم لوگ برابر رہا کرتے تھے۔" بیگم ظفر نے بتایا اتنے میں بھیا بھی بازار سے آ گئے۔

ان لوگوں کو دیکھ کر وہ بھی کچھ حیران اور کچھ پریشان سے ہو گئے کھانے کے بعد یہ لوگ واپس ہو گئے۔

مگر اماں جانی اور بھیا دونوں ہی چپ چپ تھے۔

کچھ دنوں تک تو خاموشی رہی مگر کب تک۔

ایک دن پروین کی ممی نے عکرمہ کو بلا کر صاف کہہ دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔

عکرمہ بھپر گیا۔

اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ وجہ بتانے پر اڑ گیا مگر پروین کی ممی نے کچھ نہ بتایا۔

کہنے لگیں اگر پوچھنا ہے تو جا کر ممی سے پوچھو کہ تم کس کی اولاد ہو۔ اگر وہ نہ بتائیں تو انہیں قسم دینا۔ اس کے بعد تم خود ہی ہمارے انکار کی وجہ سمجھ جاؤ گے۔

عکرمہ کو تو جیسے موت کا حکم سنا دیا گیا تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا نجمہ کے گھر پہنچا۔

وہ آج پہلی بار ان کے گھر آیا تھا۔

نجمہ اسے اپنے ہاں دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

شفاعت اور بچے موجود نہ تھے۔

"خیریت تو ہے عکرمہ تم آج کیسے آن پہنچے۔

"نجمہ آپا۔ بھابی ایک جگہ میرا پیغام لے کر گئی تھیں۔ اور وہ لڑکی مجھے بے حد پسند ہے۔ پچھلے ہفتے ان کے گھر والوں کی دعوت ہمارے ہاں ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ لوگ دستگیر میں آپ کے برابر رہا کرتے تھے۔ رقیہ آنٹی اور ظفر صاحب اب ان لوگوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے جب رقیہ آنٹی پر زور ڈالا تو انھوں نے کہا کہ جا کر نجمہ سے پوچھو۔ تم کس کی اولاد ہو۔ پلیز نجمہ آپا مجھے بتایئے میرے ماں باپ کون تھے۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔" وہ دو زانو ہو کر نجمہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

نجمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بس دل پکڑے ایک طرف کو جھک گئیں۔

چلے جاؤ عکرمہ تمہیں اپنی محبت کی قسم پلیز عکرمہ فوراً چلے جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے۔ تمہاری موجودگی میری ازدواجی زندگی کے خاتمے کا سبب بن جائے۔ اس لئے عکرمہ پلیز چلے جاؤ۔ انہوں نے اتنے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا کہ عکرمہ ان کی حالت کی پروا کئے بغیر جلتا ذہن لئے گھر واپس آ گیا۔

اس کی حالت سخت غیر ہو رہی تھی۔ کمرے میں آتے ہی ایسا بے سدھ سویا کہ گھر والے پریشان ہو گئے۔ ڈاکٹر پہ ڈاکٹر بلائے گئے۔ مگر اس کی حالت میں ذرا افاقہ نہ ہوا۔

سب ہی باری باری اسے دیکھنے آئے سوائے پروین کے گھر والوں کے۔

نجمہ بھی شفاعت کی غیر موجودگی میں اسے چھپ کر دیکھ گئی تھیں۔

اور اب اپنے گھر میں تڑپتا دل لئے سوچ رہی تھیں کہ عکرمہ کو کیسے بتائیں وہ کس کی اولاد ہے۔

اس کے ماں باپ کون ہیں۔

○

وہ کل تیرہ سال کی تھیں جب پرائیویٹ پڑھ کے داخلہ لیا ٹائیفائڈ کی وجہ سے انھیں کئی سال گھر بیٹھ کے پڑھنا پڑا۔ اور جب صحت بحال ہوئی تو لوگوں نے دیکھا دبی مریل سی ہر دم رونے والی لڑکی کچنار کی کچی کلی طرح روپ بھرنے لگی۔

وہ حسن کی دولت سے زیادہ احساسِ حسن سے مالامال تھیں۔

ان کی غرور سے تنی ہوئی گردن کسی کو خاطر میں لاتی ہی نہ تھی۔ عنبر تو الگ رہے خاندان کے لڑکوں سے بھی وہ یوں بدکتی تھیں جیسے لڑکے نہ ہوں کوئی بھوت ہوں جو ذرا سی توجہ پر ان کو چمٹ جائیں گے۔

ان کے علاوہ دو بڑی بہنیں اور بھی تھیں

بھائی بھی ان سے بڑا تھا۔ سب ہی ان کی اس عادت سے چڑتے تھے۔ ماں باپ الگ سمجھا سمجھا کر ہار گئے۔ مگر انھوں نے کسی کا کہا نہ مانا۔

زندگی کے دن یونہی گزر جاتے۔

اگر ایک دن اسکول کے لئے بس کا انتظار کرتے کرتے سڑک کے کنارے جمع پانی کے چھینٹے ان کو تر بتر نہ کر جاتے۔

انھوں نے کیچڑ میں لتھڑے کپڑوں پر نظر ڈال کر پلٹ کر دیکھا تو ایک سرخ رنگ کی کار واپس پلٹ آتی دکھائی دی۔

ان کی جان ہی تو جل گئی

یہ آج کل لڑکوں نے فیشن بنا لیا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑے پانی میں سے اتنی اسپیڈ سے گاڑیاں نکال کرلے جاتے تھے کہ کنارے کھڑے لوگ نقشِ فریادی بن کر رہ جاتے۔

وہ گاڑی کو پلٹ آتے دیکھ کر کنارے دور کھڑی ہوگئیں۔

ان کا خیال تھا کہ شاید اب کی بھی صاحبزادے ان پر گلکاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مگر ان کی توقع کے بالکل خلاف وہ گاڑی کنارے آکر رک گئی۔

"یقین کیجئے محترمہ۔ مجھے آپ کو ستانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میرے لاکھ ہارن دینے کے باوجود ٹرک نے مجھے سائڈ نہ دی تو یہ سب کچھ ہوگیا جس کی میں تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔" لڑکا بہت رسان سے معافی مانگ رہا تھا۔

"جی یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں آپ جیسے حضرات روز ہی یہ حرکات فرماتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی بالکل آپ کی طرح آکر معافی کے طلبگار بھی ہونے لگتے ہیں۔ ہم نے کچھ کہا تو شکایت ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ آپ خود ہی اپنی اداؤں پر غور کرلیں۔" انھوں نے بہت تلخی سے کہا اور پیر پٹختی ہوئی واپس گھر کو مڑ گئیں۔ کیونکہ اب اس حلیے میں تو اسکول جانے سے رہیں۔

دوسرے دن جب وہ اسکول جانے کے لئے اسٹاپ پر آئیں تو کل کے سبق کے بعد آج فٹ پاتھ سے دور ہی کھڑی رہیں بس آئی تو بہت عام دنوں کی طرح وہ اس میں سوار ہوکر اسکول پر اتر گئیں۔

وہ جب اسکول جانے کے لئے سڑک پار کر رہی تھیں تو وہی سرخ ٹیوٹا برابر سے بہت سست روی سے گزرتی۔

"اب معاف بھی کر دیجئے۔" کسی نے سر نکال کر کہا اور جواب سنے بغیر ہی یہ جا وہ جا۔

وہ کھسیا کر رہ گئیں۔

یہ بھی شکر تھا کہ کوئی دوسری لڑکی ان کے ساتھ نہ تھی۔ ورنہ وہ کیا جواب دیتیں۔

پھر تو یہ روز ہی ہونے لگا۔ آتے جاتے معافی مانگی جاتی یا کوئی اور دکھتا ہوا جملہ کانوں میں انڈیل دیا جاتا۔

وہ جو بھی لڑکا تھا بہت خوبصورت تھا۔

اس پر نئی چمکیلی گاڑی۔

ہمیشہ قیمتی لباس پہنتا۔

غیر ملکی پرفیوم کی مہک گاڑی کے آس پاس سے نکلتی رہتی تھی۔

ان کی عمر بھی تو تیرہ سال تھی۔

خواب دیکھنے کی عمر۔

آئیڈیل بنانے کی عمر۔

چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش کرنے کی عمر

وہ جو خاندان کے لڑکوں کو گھاس نہ ڈالتی تھیں، سرخ گاڑی کی چمک میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک دن گھر جاتے جاتے رک کر پوچھ ہی لیا۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"ناکردہ گناہ کی معافی۔"

"جائیے معاف کیا۔ بس اب تو پیچھا چھوڑ دیجئے۔

پیچھا چھوڑنے کے لئے تھوڑی پکڑا جاتا ہے

پھر کیا ارادے ہیں؟" انھوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جیون بھر ساتھ نبھانے کے۔" لڑکے نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ مسکراہٹ دبا کر چل دیں

اس کے بعد تو اس لڑکے نے واقعی پیچھا ہی پکڑ لیا۔

"پھر کیا ارادے ہیں جناب کے؟" وہ اکثر پوچھتا۔

"آپ کس بارے میں میرے ارادے پوچھنا چاہتے ہیں؟"

ایک دن، زچ ہو کر انہوں نے سوال کیا۔

"جیون بھرے ساتھ دینے کے بارے میں" دوسری طرف بھی کوئی ڈھیٹ شخصیت تھی۔

"واہ. کوئی زبردستی ہے کیا؟" انھوں نے تنک کر جواب دیا۔

"اگر معاملہ زبردستی کا ہوتا تو آپ ہرگز بات نہ کر رہی ہوتیں" لڑکے نے شرارت سے کہا۔

"چلئے اچھا ہوا یہ بھی آپ نے سمجھا دیا کہ بات کرنے سے آپ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

وہ تنتنا کر آگے بڑھنے لگیں۔

"بخدا میرا یہ مطلب نہ تھا۔ آپ رک جایئے ورنہ اسی ٹرانسفارمر سے گاڑی ٹکرا دوں گا۔" لڑکے نے دھمکی دی۔

"آپ تو مصیبت بن گئے ہیں اچھی بھلی" وہ مصنوعی غصے سے بولیں۔

"مصیبت نہیں راحت کہیئے۔ بندے کو راحت حسین کہتے ہیں۔"

انہیں اس کا تعارف کروانے کا انداز بہت بھلا لگا۔

"آپ کا نام پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں" انھوں نے شان بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"دیکھئے مجھے چیلنج نہ دیجئے۔ کل اسی جگہ آپ کو آپ کے نام سے معہ ولدیت کے نہ پکارا ہو تو نام بدل دیجئے گا" اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

"اچھا دیکھیں گے۔"

دوسرے دن واقعی اس نے نہ جانے کہاں سے نام معلوم کر لیا۔

وہ گھر کی گلی میں مڑنے ہی والی تھیں کہ وہ گاڑی ان کے نزدیک آئی۔

"میں نے کہا نجمہ مبارک علی صاحبہ آداب عرض۔"

اس نے شرارت سے کہا اور لوگوں کو آتا دیکھ کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

وہ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بڑی مشکل سے قابو پاسکیں۔ یقیناً کسی قوم جن سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے دل میں سوچا۔ ورنہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نام اور ساتھ ساتھ والد کا نام بھی معلوم کر لینا ان کے نزدیک اچنبھے کی بات تھی۔

انہیں کیا خبر تھی کہ لڑکے کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر محلے میں ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو بیسوں کے بدلے یہ کام بڑی آسانی سے کر دیتے ہیں۔

زمانے کی ہوا کو سونگھ لینے والے حضرات ایسے انسانوں کو بہت جلدی پہچان جاتے ہیں۔

اس سے اگلے دن وہ بس سے اتریں تو راحت گاڑی ان کے نزدیک لے آیا۔

"بھئی اب تو مان گئیں ہم کو۔ اب سیدھے سیدھے باتیں کر لیا کیجئے ہم سے۔ ورنہ یقین کیجئے کسی دن آپ کے گھر آن دھمکوں گا سہرا باندھ کر۔ پھر جوتے لگوائی رہیئے گا ابا جانی اور بھیا سے۔ اس نے اتنے اعتماد سے کہا کہ نجمہ رک گئیں۔

آپ تو بلائے جان بن گئے ہیں۔"

جب آپ جیسے دشمن جاں اور غارت گر ایماں سے سابقہ پڑ جائے تو اور کیا بنوں گا۔" وہ معصوم صورت بنا کر بولا

نجمہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"خدا کی قسم آپ کی ان ہی اداؤں نے نیندیں حرام کر دی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ آپ کی خاطر سینکڑوں روپئے کا پیٹرول پھونک چکے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ دو گھڑی بیٹھ کر اس دل خانہ خراب کو تسلی بھی نہیں دے سکتیں۔ وہ روہانسے لہجے میں بولا۔

"اچھا کس طرح تسلی ملے گی آپ کے دل خانہ خراب کو؟" نجمہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"صرف ایک دن ذرا دیر کو میرے ساتھ آؤٹنگ پر چلئے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں آپ سے مستقبل کی۔ آپ مانیں نہ جب۔" اس نے راہ دکھائی۔

"نانا بابا۔ جوتے پڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟" نجمہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"میرا وعدہ ہے کہ کسی کو خبر نہیں لگنے دوں گا۔ میں مزار قائد کے پاس گاڑی لئے کھڑا رہوں گا۔ آپ اسکول کے بجائے وہیں اتر جایئے گا۔" اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

"اچھا سوچوں گی۔

"نہیں سوچنا وچنا کچھ نہیں ضرور آیئے گا آپ کو میری قسم۔"

نہ جانے اس قسم میں کیا سحر تھا۔

ساری رات اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے باوجود، خاندان کی عزت سنبھال کر رکھنے کی اپنے آپ سے قسم کھانے کے باوجود۔

اور اس لڑکے پر توجہ نہ دینے کا عہد کرنے کے باوجود وہ گرومندر کے اسٹاپ پر کچے دھاگے کی طرح بندھی ہوئی اتر گئیں وہ سامنے ہی گاڑی سے ٹکا کھڑا ان ہی کی راہ تک رہا تھا۔

"مجھے اپنے جذبوں کی صداقت پر یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گی۔" اس نے دروازہ کھول کر کہا تو وہ لمحہ بھر کو کانپ گئیں۔ ان کے یہ اٹھے ہوئے قدم کہیں ان کی تباہی کا باعث نہ بن جائیں۔

مگر رات کی میٹھی میٹھی باتوں کا سحر۔

کچی عمر کی ناتجربہ کاری

اور دولت کی گوند نے ان کے لب پر ایسی چپ کی مہر لگائی کہ وہ باوجود کوشش کے اپنے آپ کو راحت سے ملنے سے نہ روک سکیں۔

وہ اکثر اسکول سے غائب رہنے لگیں۔

چھٹی والے دن سہیلی کا بہانہ کر کے وہ راحت سے ملنے آتیں۔

اسکول کی غیر حاضریوں کی رپورٹ گھر پہنچی تو بھیا پریشان ہو گئے۔ انھوں نے کسی کو بتائے بغیر نجمہ کی نگرانی شروع کی تو پتہ چلا کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے اور نجمہ اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ بھیا راحت سے بھی ملے۔ مگر اسے شادی کے لئے سیریس نہ پایا۔ ابھی وہ پڑھ رہا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ بڑے بھائی اور بہنیں کنواری تھیں۔ بھلا اس کی شادی کا نمبر کیسے آسکتا تھا۔

بھیا نے نجمہ کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانیں تو سختی شروع کر دی۔ اسکول خود چھوڑ کر آتے اور لینے بھی خود ہی جاتے۔

اتنے دنوں کی پابندی نے انہیں اور بھڑکا دیا۔ ایک دن بھیا بیمار ہوئے تو وہ ٹیسٹ کا بہانہ کر کے پورے مہینے بھر بعد اسکول آگئیں۔ پیٹ درد کا بہانہ گڑھ کے جلدی چھٹی لے کر گھر کے بجائے پبلک فون بوتھ پر آگئیں۔ فون کر کے راحت کو بلوایا۔

انھیں راحت اتنے دنوں بعد نظر آیا۔ دونوں بے انتہا جذباتی ہو رہے تھے۔ راحت انھیں اپنے دوست کے فلیٹ میں لے آیا جہاں سارے سماجی اور اخلاقی بندھن توڑ کر وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔

نجمہ جب زرد چہرہ لئے گھر پہنچیں تو ان کی ڈھنڈیا مچ چکی تھی۔ اباجانی چھٹی کے وقت انھیں اسکول لینے پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ دوسرے پیریڈ ہی میں اسکول سے جا چکی ہیں۔ اباجانی اور بھیا نے مل کر ہر ممکن جگہ تلاش کیا۔

اور اب انہیں سامنے پا کر بھیا آپے سے باہر ہو گئے۔ پہلی دفعہ ہاتھ اٹھا تو اٹھتا ہی چلا گیا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا ان کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا مگر گردنیں نیچی کرنی پڑیں۔

اماں جانی نے ہر ممکن گھریلو اور ٹوٹکے استعمال کر کے دیکھ لئے۔ مگر آنے والی روح کو کوئی نہ روک سکا۔ مجبوراً وہ نجمہ کو لے کر لاہور چلی گئیں۔ وہیں ان کی بڑی بیٹی نغمانہ بیاہی گئی تھیں۔

اسکے شوہر کے طعنے سنے۔ نغمانہ کی بدلی ہوئی نظریں دیکھیں مگر بے حیا بنی پڑی رہیں۔

اسی دوران بھیا کی مارا ماری وہ لوگ گلشن میں شفٹ ہو گئے تو وہ بھی نجمہ کے ساتھ واپس آگئیں۔ بچہ کو ایک غریب عورت کے سپرد کر دیا اور کچھ ماہ بعد جب یہ لوگ محلے میں شریفوں کی طرح سر اٹھا کر چلنے کے قابل سمجھے جانے لگے تو اباجانی اپنے ایک دوست کا بچہ ظاہر کر کے اسے گھر لے آئے۔ یوں عکرمہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح پلنے لگا۔

بھیا نے نجمہ کی خاطر راحت کو ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر سخت ناکامی ہوئی۔ وہ اپنی فیملی سمیت ایسا غائب ہوا تھا کہ کچھ پتہ ہی نہ ملتا تھا۔ پھر بھی ان لوگوں کا اپنا نہ تھا جو لوٹ آنے کی امید باقی رہے۔ کرایہ داروں سے کراچی جیسے شہر میں بھلا کون اتنا واسطہ رکھتا ہے کہ اگلے گھر کا پتہ بھی معلوم کرے۔

اس حادثے کے بعد خود نجمہ کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اسے خوب صورت لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے شفاعت کو زندگی کا ساتھی منتخب کیا۔ مگر شفاعت تو چہرے کے ساتھ ساتھ دل کے بھی کالے نکلے۔ ان کے مسلسل شک اور دل آزار باتوں نے نجمہ کو دل کا مریض بنا دیا تھا۔

زندگی یوں ہی بھلی بسر ہو رہی تھی کہ عکرمہ یوں بلائے ناگہانی کی طرح ان کے پاس آیا۔

وہ کیسے کہہ دیتیں کہ عکرمہ تم میرے بیٹے ہو۔

اور پھر وہ بتا بھی دیتیں تو ان کے بتانے کا کیا فائدہ ہوتا۔ عکرمہ کو پروین ملنے سے رہی۔

رقیہ آپا اور ظفر بھائی تو دستگیر میں اس کی بدنامی کے قصے سنانے میں سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ وہ بھلا اپنی بیٹی ایسے لڑکے کو کیوں دیتے جس کی ولدیت کے بارے میں نجمہ نے

زبان بند رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

رقیہ آپا کی لڑکیاں خود بھی کونسی اچھی تھیں۔ مگر لوگوں کو اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی آنکھ کے تنکے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔

عکرمہ کی طبیعت کی مسلسل خرابی نے سب کو لوکھلا دیا تھا۔ اب ان لوگوں کو احساس ہوا تھا کہ عکرمہ کس قدر بے ضرر اور مظلوم شخصیت ہے۔

جس نے دل کی دنیا لٹ جانے پر بھی کسی سے کوئی استفسار نہ کیا۔ بس غم کو سینے میں اتار کر مدہوش ہو گیا تھا۔

نجمہ سب کے سامنے سرسری رویہ رکھتیں مگر راتوں کو چھپ چھپ کر اس کی صحتیابی کی دعا مانگتیں۔ ان کا خیال تھا کہ عکرمہ صحت یاب ہو جائے تو بھیا سے کہہ سن کر اسے باہر بھجوا دیں گی۔ ہوسکتا ہے وہاں اس کی روح کا زخم بھر جائے۔

ہوسکتا ہے وہاں کوئی اس سے اس کے ماں باپ کا کھوج نہ لگائے اور اس کی سنی ہوئی کہانی پر یقین کرلے۔

وہ اپنے تئیں عکرمہ کی نظروں میں اٹھتے ہوئے سوالوں سے بچنے کے لئے بڑے معقول بہانے تلاش کئے بیٹھی تھیں مگر عکرمہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا۔ جس بارے میں انھوں نے زبان بند کر رکھی تھی وہ بھلا کیسے کھولتا۔

اور اس کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے لب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرلے۔

سو اس نے ایسا ہی کیا۔

ایک رات جب نجمہ سجدے میں پڑی اس کے لئے دعا گو تھیں ٹیلی فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی نے اطلاع دی کہ عکرمہ ان کی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لئے اپنی آنکھوں کے اٹھتے ہوئے سوالوں کو روکنے کے لئے۔ بہت چپکے سے اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

شاید اسے اپنی ہستی کے بارے میں احساس ہو گیا تھا۔



گزرے ہوئے موسم

عذرا جمیل

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تنہا ہوتے ہوئے بھی محفلیں ان کے ساتھ رہتی ہیں اور خزاؤں میں بھی بہاروں کا تصور ساتھ لئے پھرتے ہیں۔

لیکن وہ ۔۔۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھی جو بھری محفل میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور بہار کے موسم میں بھی خزاں کی ساری ویرانیاں اور سارا درد چپکے چپکے دل میں اتارتے رہتے ہیں۔

وہ تنہا تھی اور شجاعت کو جانے کب لوٹ کر آنا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ وہ کسی دن چپکے سے بالکل اچانک آجائے گا۔ یوں جیسے کراچی میں اچانک بارش آجاتی ہے۔ چپکے سے موسم بدل جاتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ذہن میں خیالوں کے سلسلے پھیلنے لگے۔ گزرے ہوئے موسموں کی یاد سے شہر دل آباد ہونے لگا۔

جب وہ پانچ سال کی تھی تو ایک حادثے میں بابا کا انتقال ہوگیا۔ اماں خوبصورت تھیں، کم عمر تھیں۔ ایک سال بعد جانے کس کی کوششوں سے ان کی دوبارہ شادی کر دی گئی۔ نئے ابا کافی امیر و کبیر تھے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ آٹھ سال کی ایک بیٹی ناصرہ تھی۔

شادی کی پہلی ہی رات کو ابا نے اماں پر واضح کر دیا تھا کہ اگر تم زندگی کے باقی دن بھی اسی گھر میں گزارنا چاہتی ہو تو تمہیں ناصرہ کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہوگا۔ وہ بڑے ارمانوں اور ناز و نعم کی پلی ہوئی ہے۔ جس دن مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ تم اس پر زیادتی کر رہی ہو تو وہ اس گھر میں تمہارا اور تمہاری بیٹی کا آخری دن ہوگا۔

اماں نے گویا یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ یہ جملے ہمیشہ کے لئے ذہن میں اتار لئے اور یہی وہ دن تھا کہ اماں کی محبت اور شفقت جو ساری کی ساری اس کے لئے وقف تھی، اسکا بٹوارہ اس کی تقسیم ہوگئی۔ اس کے نصیب میں جو حصہ آیا وہ ناصرہ کے حصے سے کم تھا۔

کچھ لوگ اپنے مخصوص حالات کے سبب وقت سے پہلے سمجھدار بن جاتے ہیں: وہ بھی اب ایسے ہی لوگوں میں ہوگئی تھی۔

شروع شروع میں اس نے اماں کے اس رویئے کی شکایت بھی کی لیکن اماں کے سمجھانے پر دھیرے دھیرے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ کم بولنا اور زیادہ شروع کر دیا۔ آنکھیں جو کچھ نہیں دیکھنا چاہتی تھیں اسے دیکھنے کی عادی ہوگئیں۔ کان جو کچھ نہیں سننا چاہتے تھے اسے سننے پر مجبور ہوگئے کہ وقت اور حالات کے تقاضے کے سبب جینے کی ایک راہ یہ بھی ہے۔ سب کچھ سہنا اور کچھ نہ کہنا۔ انسان بہت با اختیار سہی لیکن کبھی کبھی حالات اسے بہت بے اختیار بنا دیتے ہیں۔

ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ابا کی دولت بھی جو ان کی ضروریات سے بہت زیادہ تھی، ان کے لئے نقصان کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ریس اور جوئے کی لت کچھ ایسی پڑی ہوئی تھی کہ اب اس کا چھوٹنا محال تھا۔ گھر میں گزارنے کے لئے ان کے پاس بہت کم وقت تھا۔ صبح کے گئے ہوئے وہ گزرتی رات کے کسی لمحے میں گھر واپس آتے۔ سوتی ہوئی ناصرہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اگلی رات کو جلد لوٹ کر آنے کا کبھی نہ پورا ہونے والا عہد کرتے اور لڑکھڑاتے قدموں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ اپنے بستر پہ ڈھیر ہو جاتے۔ یوں اس کی بدنصیبی کچھ اور بڑھ جاتی کہ اس کے لئے ابا کے پاس اتنا بھی وقت نہ تھا کہ وہ اس سے محبت یا نفرت کرنے کے بارے میں سوچ سکتے۔ ان کے لئے وہ اور اماں کسی فالتو چیز کی مانند تھیں جس کی کوئی قدر و قیمت کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

ان کے برعکس اماں ہر طرح سے ناصرہ کا خیال رکھتی تھیں اس کا حق ادا کرنے کی خاطر فاطمہ کی حق تلفی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ ابا سب کچھ دیکھتے تھے اور بے حس بنے رہتے تھے۔

اماں مجبور تھیں اور وہ مختار تھے۔ انھوں نے تو اپنی دولت کے عوض اماں کی مجبوریوں کا سودا کیا تھا۔

ابا کے پاس تو وقت ہی نہ تھا اور اماں ۔۔۔ انہیں فرصت ہی فرصت تھی کہ اس سے بھی محبت کریں اور اس سے بڑھ کر ناصرہ پر محبتوں کے خزانے لٹائیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں لئے راتوں کو جاگ جاگ کر صرف اس لمحے کا انتظار کریں جب ابا گھر آتے

تھے۔

ناصرہ بچی تھی اور بچوں کو کیا چاہیئے، محبت، شفقت، اچھا کھانا اور بہتر تعلیم۔

یہ سب اسے میسّر تھا۔ اسے اماں سے کوئی شکایت تھی نہ فاطمہ سے کوئی گلہ۔ اسے کھیلنے کودنے اور اپنے دل کی باتیں کرنے کیلئے ایک ساتھی، ایک ہم عمر کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے فاطمہ سے بہتر ساتھی اور کون ہوسکتا تھا جو اس کی ہر بات فوراً مان لیا کرتی تھی۔

ناصرہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کا یہ احساس بھی گہرا ہوتا گیا کہ ابا کے خوف سے اماں اور فاطمہ نے اپنی ذات سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتے ہوئے خود کو مجبوری اور محرومی کی انتہائی منزلوں پر پہنچا کر ابا کے



اور اس کے لئے شکایت کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔

اماں کی صرف ایک ہی بہن تھیں۔ وہ جب کبھی اپنے بیٹے سجاد کے ساتھ اماں سے ملنے آتیں اور ایسے میں اگر اتفاق سے ابا گھر پر ہوتے تو وہ ایسے تمام جذبوں کا اظہار کرنے سے نہ چوکتے جن سے ان کی آمد پہ ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا۔

سجاد کو اگر وہ ناصرہ یا فاطمہ سے بات کرتے دیکھ لیتے تو سر سے پیر تک ایک نظر سجاد پر ایسی ڈالتے کہ وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ جاتا۔

یوں سال گزر گئے۔ ان گزرے ہوئے سالوں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ وقت بدلا۔ حالات بدلے۔ موسم بدلے۔ اس طرح کہ سجاد کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ تنہا رہ گیا۔ ناصرہ کی شادی بہت اچھے اور امیر گھرانے میں ہو چکی تھی اس لئے ابا گھر کی طرف سے کچھ اور غافل ہو گئے تھے۔ اب وہ کبھی کبھی رات کو بھی باہر رہنے لگے تھے۔ اور اماں جن کی قسمت میں دن رات شمع کی مانند سلگتے رہنا لکھا تھا غموں کی آگ میں چپکے چپکے جل جل کر بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان کو مستقل دل کی تکلیف رہنے لگی تھی۔ یہ بیماری دل کسی وقت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

انھوں نے چاہا تھا۔ ان کی یہ خواہش تھی۔ اس سے پہلے کہ کسی دن بہت اچانک ان کی زندگی کا وہ سفر شروع ہو جس پر روانہ ہو کر ان کے لئے واپس لوٹ کر آنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناممکن بن جائے وہ سجاد اور فاطمہ کی شادی نہ سہی تو کم از کم منگنی ہی کر دیں۔

ابا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظر میں فاطمہ کے لئے سجاد سے بہتر رشتے موجود ہیں۔

اماں ڈر کے مارے ابا سے یہ تو نہ کہہ سکیں کہ فاطمہ اور سجاد ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ابا نے ناصرہ کی شادی بھی اس لڑکے سے نہ ہونے دی تھی جسے وہ چاہتی تھی اور جو اسے پسند کرتا تھا۔ اس لئے کہ اس لڑکے کا تعلق متوسط طبقے سے تھا جبکہ ابا ناصرہ کی شادی امیر گھرانے میں کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ساری زندگی عیش کر سکے۔ یہی صورت حال ایک بار پھر درپیش تھی۔ سجاد کے والد کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی والدہ نے جانے کون کون سے جتن کر کے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ اب وہ انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے باہر جانے والا تھا۔ ابا کو نہ جانے کیوں شروع ہی سے سجاد سے ایک قسم کی چڑ سی رہی تھی۔ انھوں نے اماں سے کہا وہ باہر جا رہا ہے۔ نہ معلوم وہاں کیا گل کھلائے گا۔ کون جانے واپس آئے نہ آئے۔ کہیں لڑکی اس سے منگنی یا شادی کر کے اپنی قسمت کو روتی نہ رہ جائے۔

اس پر اماں سے چپ نہ رہا گیا۔ انھوں نے اپنے سارے حوصلوں کو یکجا کرتے ہوئے ابا سے کہا

”لیکن میں تو اپنی بہن کو زبان دے چکی ہوں۔“

یہ سن کر ابا نے کڑی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا

”مجھ سے پوچھے بغیر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا۔ مجھ سے شادی کر کے بیوی ہونے کا اعزاز تو حاصل کر لیا اور میری یہ وقعت کہ بیٹی کی شادی کے معاملے میں مجھ سے پوچھے بغیر زبان دے دی۔“

اور اماں کا دل چاہا کہ وہ زندگی میں پہلی بار اتنا ضرور پوچھیں کہ آپ نے اتنے سالوں کے کس لمحے میں میری بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھا ہے۔ وہ تو ان بدنصیبوں میں سے ہے جو باپ کے ہوتے ساری عمر باپ کی شفقت کے ایک ایک لمحے کو ترستے رہتے ہیں۔

لیکن ہمیشہ کی طرح جو انھوں نے سوچا جب اسے کہنا چاہا تو کہہ نہ سکیں۔ خود ان کی زبان ایسے ہر موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ آج بھی اس سوچ اس جذبے کو قوتِ گویائی نصیب نہ ہو سکی تھی۔

وقت پڑنے پر انسان کی اپنی زبان اس کا ساتھ چھوڑ کر باغی بن جائے تو وہ دوسروں سے کس بات کا شکوہ کرے؟

زیر سماعت مقدمے کا فیصلہ ابا نے جس انداز میں کیا وہ اماں کے لئے بڑا ہی ناقابل یقین تھا۔ عین بے یقینی کے عالم میں یقین دلانے کے لئے ایک لفظ بھی بہت ہوتا ہے۔

ابا نے اماں سے کہا۔

”سجاد جس کورس کے سلسلے میں جا رہا ہے اس میں دو سال یقیناً لگیں گے۔ اگر دو سال بعد وہ واپس نہ آیا تو میں جہاں چاہوں گا فاطمہ کی شادی کر دوں گا اور یہ رعایت صرف اس لئے دے رہا ہوں کہ تم زبان دے چکی ہو۔ لیکن فی الحال منگنی، نکاح یا رخصتی کچھ بھی نہیں کیا جائے گا۔“

نامہربان ابا کی یہ مہربانی اماں کے لئے خوش کن ہونے سے زیادہ حیران کن تھی۔ سجاد آیا تو ابا نے اس سے بھی کہہ دیا۔

”جب تم واپس آؤ گے تو فاطمہ کی شادی تم سے کر دی جائے گی۔“ سجاد احمد جسے ابا کی پچھلی تمام نامہربانیوں کے سبب اپنے ٹھکرائے جانے کا مکمل یقین ہو چکا تھا، یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اپنی قوتِ سماعت پر یقین کرنے کو اس کا دل نہ چاہا۔

یہ خوش خبری سن کر بھی وہ خوش ہونے کی طرح خوش نہ ہو سکا

یقین دلائے جانے کے باوجود دل کے کسی گوشے میں بے یقینی کا احساس اب بھی باقی تھا۔ پھر ایک دن وہ یہی اندیشے دل میں بسائے دیارِ غیر کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

دھیرے دھیرے چپکے چپکے دو سال سے زیادہ گزر گئے۔ ان دو سالوں میں جن مسافروں کو کبھی واپس لوٹ کر نہ آنے کے لیے جانا تھا ان میں اماں کا نام بھی شامل تھا۔ اس بار جن لوگوں کا بلاوا آیا تھا ان میں اماں کی شمولیت اس انداز میں ہوئی کہ ایک روز فجر کی نماز پڑھتے ہوئے چپکے سے ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔

فاطمہ نے یہ غم کس طرح برداشت کیا تھا۔ اس کا اظہار وہ اگر چاہتی بھی تو الفاظ میں نہیں کرسکتی تھی۔

ابا نے بھی دنیاداری کی خاطر ہی سہی کچھ دن اماں کے مرنے کا سوگ منایا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ سجاد احمد واپس لوٹ کر نہ آیا۔ کوئی اطلاع بھی نہیں دی کہ کیوں نہیں آیا یا کب تک آسکے گا۔

فاطمہ منتظر اور پریشان ہی رہی۔ ایک دن ابا نے اس سے کہا۔

"اس نامعقول کا اب انتظار کرنا بیکار ہے۔ نہ معلوم وہاں کیا گل کھلا رہا ہوگا۔ اچھا ہی ہوا جو تمھاری اس سے منگنی یا نکاح نہیں ہوا تھا۔"

پھر انھوں نے ایک جگہ اس کی بات طے کردی۔ احسان صاحب کے بارے میں ابا نے اسے بتایا کہ وہ اپنی دونوں بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادی کرچکے ہیں۔

بیوی کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ تمہیں زندگی بھر عیش و آرام سے رکھیں گے

فاطمہ نے یہ سن کر کچھ نہ کہا اس سے بولا ہی نہ گیا اور جب سوچنے بیٹھی تو اسے یاد آیا۔

احسان صاحب کی بیٹیاں اور بیٹا تینوں عمر میں اس سے بڑے تھے۔ اس بے انصافی پر اس نے رونا چاہا تو رویا بھی نہ گیا۔ اس نے سوچا۔

کیا وہ اب بھی چپ رہے گی اور کچھ نہ کہے گی۔ پھر جانے کیسے اور کس طرح ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ دوسرے ہی دن ابا کی غیر موجودگی میں احسان صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے رو رو کر ان سے فریاد کی کہ اسے ان کی دولت نہیں چاہیے۔ اس کا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ان کے تینوں بچے عمر میں اس سے بہت بڑے ہیں اور وہ تو اب بھی سجاد کا انتظار کرنا چاہتی ہے۔ ابا سے وہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اب وہ اس کی بات نہیں مانیں گے۔

اور جس کے دل میں خدا نیکی ڈال دے جس کی رہنمائی خدا کرے اسے کون بے رحمی پہ مجبور کرسکتا ہے اور کون ہے جو اسے گمراہ کرسکے۔

اسے روتے دیکھ کر ان کا دل دکھ کر رہ گیا۔

انھوں نے اس سے کہا۔ بیٹی اب تم گھر جاؤ۔ میں تمہارے ابا سے یہ کہہ کر انکار کردوں گا کہ میرے بچے اس بات پر بالکل آمادہ نہیں ہیں کہ میں دوسری شادی کرلوں۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ مجھ سے قطع تعلق کرلیں گے اور میں اولاد کے ہوتے ہوئے اولاد سے دوری کا غم نہیں سہنا چاہتا۔

فاطمہ کی نامہربان زندگی کے یہ چند بڑے مہربان لمحے تھے۔ اس موقع پر اسے وہ الفاظ یاد نہ آسکے جو احسان صاحب کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے میں کام آسکتے۔ بہت یاد کرنے پر بھی اسے یاد نہ آسکا کہ زندگی میں اس سے پہلے کب اور کس نے اس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا؟

وہ کچھ عجیب قسم کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہوئی احسان صاحب سے ایک لفظ کہے بغیر واپس لوٹ آئی۔

احسان صاحب سے انکار سن کر ابا اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے۔ جی بھر کے انہیں برا بھلا کہا اور تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

دراصل وہ اب اپنی بھی ایک عدد شادی اور کروالینا چاہتے تھے۔ فاطمہ کی پروا تو نہ پہلے کبھی انھوں نے کی تھی اور نہ ہی اب انہیں اس کی پروا تھی۔ انھوں نے سوچا۔ کیوں نہ وہ اسے اس کے کسی رشتے دار کے ہاں بھیج دیں۔ اس کا سوگوار چہرہ دیکھ دیکھ کر انہیں کوفت ہوتی تھی۔

جہاں تک سجاد احمد کی ذات کا تعلق تھا اسے ابا نے احسان صاحب سے فاطمہ کے لئے بات کرنے سے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ انھوں نے فاطمہ کی بات بالکل پکی کردی ہے چاہے اب وہ لوٹ کر آئے یا نہ آئے ان کے اور فاطمہ کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سجاد احمد کو یہ خط پڑھ کر بہت زیادہ دکھ نہیں پہنچا۔ اسے تو شروع دن سے اپنی کامیابی کے یقین سے زیادہ ناکامی کا اندیشہ رہا تھا۔ فاطمہ کی طرف سے اس کا دل پہلے ہی ہٹ سا گیا تھا جس نے اس کے کئی خطوں میں سے کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔

سجاد احمد نے سوچا تھا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بڑی جلد انسان کی ساری شخصیت اس کی تمام سوچوں کو بدل

کے رکھ دیتا ہے۔ فاطمہ بھی تو انسان ہے اور انسان کمزوریوں کے مجموعے کا نام ہے۔ وقت اور حالات کے تحت دولت اس کی کمزوری بن گئی ہوگی اور یوں وہ ایک انسان کی کثیر دولت کے عوض دوسرے انسان کی محبت اور خلوص کا سودا کرنے پر رضامند ہوگئی ہوگی۔ حقیقت یہ تھی کہ سجاد احمد انجان تھا۔ فاطمہ بے خبر تھی اور ابا باخبر تھے۔ سجاد احمد کے فاطمہ کے نام آنے والے تمام خطوط اس تک پہنچنے سے پہلے ہی ابا کے پاس پہنچتے رہے۔

انہیں پہلے ہی سے خدشہ تھا کہ وہ بظاہر مسکین مگر اندر سے مکار لڑکا اتنی دور بیٹھ کر بھی کہیں خطوں کے ذریعے اس لڑکی کو پٹیاں نہ پڑھاتا رہے اور وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ سجاد احمد نے تقریباً ہر خط میں فاطمہ کو ادھر ادھر کی باتیں لکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تاکید کی تھی کہ اگر کسی وجہ سے وہ دو سال تک واپس نہ آسکے تب بھی وہ کہیں اور شادی کرنے پر رضامند نہ ہو کسی نہ کسی طرح ابا کو ٹالتی رہے۔ ویسے وہ پوری کوشش کرے گا کہ جلد از جلد واپس آسکے۔

اب جبکہ احسان صاحب ابا سے انکار کر چکے تھے تو ایک دن فاطمہ نے پہلی بار سوچا۔

وہ سجاد احمد کو خط لکھ کر معلوم کرے کہ وہ اب تک لوٹ کر کیوں نہیں آیا۔ ابھی صبر کے اور کتنے امتحان باقی ہیں اور یہ کہ اسے کب تک اس کا انتظار کرنا ہوگا؟

لیکن اس لڑکی فاطمہ حسن کی بدنصیبی نے بہت کم موقعوں پر اس کا پیچھا چھوڑا تھا۔ سو آج بھی جبکہ سجاد احمد کے نام لکھا جانے والا اس کا پہلا اور شاید آخری خط ادھورا ہی تھا کہ بالکل اچانک اور بہت غیر متوقع طور پر ابا آگئے۔

اس نے خط چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ ابا کی ایک ہی جھڑکی سن کر اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط ان کے حوالے کر دیا

ابا نے خط پڑھ کر کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بڑے ہی سخت لہجے میں کہا۔

"آئندہ اگر تم نے اس نامعقول کو خط لکھنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا" پھر خط کے پرزے پرزے کرکے دریچے سے باہر پھینک دیا۔ انہیں نہ معلوم کیوں شروع ہی سے سجاد احمد سے ایک خاص قسم کی چڑ سی رہی تھی۔ دراصل وہ کبھی بھی فاطمہ کو اس سے منسوب کرنے کے بارے میں مخلص نہیں رہے تھے۔

فاطمہ نے اس زیادتی پر بھی صبر کیا۔ اب تو اسے اس قسم کی باتوں پر رونے سے زیادہ صبر کرنا آسان لگتا تھا۔

ایک دن ابا نے اس سے کہا۔

"تم اگر چاہو تو اپنے کسی بھی رشتہ دار کے ہاں چلی جاؤ۔ تمہیں رات کو بھی اکثر تنہا رہنا پڑتا ہے۔"

وہ جانتی تھی۔ اسے خبر تھی۔ اگر چاہو کا مطلب یہ تھا کہ تم اگر نہ بھی چاہو تو تمہیں اب یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ اس لئے کہ اس نے ابا کی بیزاری کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے کہ ابا کو اماں کے انتقال کے بعد اس کے یہاں رہنے کا جواز نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے اماں سے اس کے لئے تو شادی نہیں کی تھی۔ انھوں نے تو فقط ناصرہ کی دیکھ بھال اور نگہداشت کے لئے شادی کی تھی اور یہ کام وہ بحسن و خوبی تکمیل کو پہنچا چکی تھیں

طویل قید کے بعد آزادی اور رہائی کے یہ لمحے کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ لیکن وہ۔ وہ تو ایسے پرندے کی مانند ہوگئی تھی جو قیدوبند کی صعوبتوں کے باوجود صیاد اور قفس سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ اب قفس چھوڑ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتا۔

ابا کی تیسری شادی ہوجانے کے بعد جو وہ عنقریب کرنے والے تھے، اسے خود بھی اب یہاں رہنے کا بہانہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لئے اب اسے یہاں سے جانا تھا۔ خود کو شہر بدر کر لینا تھا۔ یہ بات اگر نہ بھی ہوتی تب بھی اسے ہمیشہ کے لئے نہ سہی عارضی طور پر ہی جانا پڑتا۔ کئی دن ہوئے دوسرے شہر سے اس کی بہت پرانی دوست سارہ احمد نے اسے بلایا تھا۔ یہ خط سارہ احمد نے اسے ایک ہاسپٹل سے لکھا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔ سارہ احمد کا تعلق بجد الٹرا ماڈرن اور آزاد گھرانے سے تھا۔ اس کی امی نے جانے کن جھگڑوں بکھیڑوں کے سبب اس کے ابا سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی تھی۔ سارہ احمد کو بھی ان سے چھین لیا تھا اور اپنی راہ پر اسے اس طرح لگایا تھا کہ وہ بھی انہی کی طرح کلب ہوٹلوں اور رقص و سرود کی محفلوں کے بغیر زندگی کو ادھورا سمجھتی تھی

فاطمہ نے پہلی کلاس سے لیکر کالج تک اس کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ سارہ احمد سے بالکل برعکس تھی پھر بھی سارہ احمد اپنی خوش اخلاقی کے سبب اس کی بہترین دوست تھی۔ سارہ احمد کو خبر تھی۔ لڑکیاں فاطمہ کو ورغلاتی تھیں کہ تم سارہ احمد کے ساتھ نہ رہا کرو یہ بہت خراب لڑکی ہے۔ سب تمہیں بھی خراب سمجھتے ہیں۔ بھی کسی موڑ پر بھی خود کو اس سے الگ نہ کر سکی تھی۔ لیکن حالات کے پیش نظر جب سارہ احمد کو یہ شہر چھوڑنا پڑا تب یہ ساتھ چھوٹا تھا۔ پھر وہ

تک ان دونوں میں خط و کتابت رہی پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کافی عرصے سے نہ فاطمہ احمد کو سارہ کی خبر تھی اور نہ سارہ احمد کو فاطمہ کی۔

اب سارہ احمد کا خط ملنے کے بعد فاطمہ احمد کو ایک بار ضرور اسکے پاس جانا تھا۔ جانے کیوں اس قدر اصرار سے سارہ احمد نے بلایا تھا اسے۔ ایک دن وہ اپنا گھر چھوڑ کر ابا کو چھوڑ کر سارہ احمد کے پاس پہنچ گئی۔

سوچتے سوچتے خیالوں کے سلسلے ابھی یہیں تک آئے تھے کہ بالکل اچانک شجاعت واپس آگیا۔ وہ اپنی سروس کے سلسلے میں دوسرے شہروں کے دورے پہ گیا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اطلاع دیئے بغیر اچانک آگیا تھا۔

اس نے آتے ہی فاطمہ سے پوچھا "آپ وہاں گئی تھیں؟"

"نہیں بھول گئی تھی۔ کل ضرور جاؤں گی۔" اس نے شجاعت سے وعدہ کیا۔

دوسرے دن حسب وعدہ وہ وہاں گئی اور لوٹ آئی یا لوٹا دی گئی یہ کہہ کر کہ اس کے گھر کے دروازے اس پہ ہمیشہ بند رہیں گے۔

وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے بالکل خاموش اور اپنے آپ سے بے خبر بیٹھی تھی کہ شجاعت آفس سے آگیا۔

"کیا ہوا آپ کو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ وہاں سے کیا جواب ملا۔؟

شجاعت نے پوچھا۔

وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے صبر کیا اور ضبط سے کام لیا۔ اپنے اندر کی ساری چیخوں کو دبا کر بہت آہستہ سے صرف اتنا کہا۔

"انھوں نے انکار کر دیا۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" اعتبار کرنے کو شجاعت کا دل نہ چاہا۔ چار سال تک بلکہ اس کے بعد بھی جس بات کے پورا ہو جانے کا اسے یقین دلایا جاتا رہا۔ جب وقت آیا تو اسے پورا کرنے سے انکار کر دیا گیا۔

کب سوچا تھا اس نے اتنا دھوکا کھائے گا وہ۔ ایسا دھچکا لگے گا اسے۔

"اچھا! یہ بات ہے؟ تو میں ابھی جا کر اس مکّار اور بیوفا لڑکی سے پوچھتا ہوں۔ کیا سمجھ کر اس نے میرے احساسات و جذبات کی توہین کی ہے؟ کس لئے کھلونا بنایا تھا مجھے؟

"نہیں شجاعت۔ تم اب وہاں نہ جاؤ۔" فاطمہ نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔

شجاعت کے لوٹ کر واپس آنے کے عرصے میں وہ درد کی کن کیفیتوں اور عذاب کی کس نوعیت سے گزری اس کا اندازہ کچھ وہ ہی لگا سکتی تھی۔

شجاعت جب وہاں سے آیا تو وہ شجاعت نہ رہا جو وہاں جانے سے پہلے تھا۔

اس نے چیختے ہوئے طنزیہ انداز میں فاطمہ سے کہا

"کتنا بے وقوف ہوں میں بھی۔ اب سمجھا آپ نے مجھے وہاں جانے سے کس لئے روکا تھا۔ سوچتا ہوں کیوں گیا تھا؟ نہ جاتا۔ آپ کا بھرم تو رہ جاتا۔ میری حقیقت تو مجھ پر واضح نہ ہوتی۔ کچھ عرصہ اور زندہ رہنے کی طرح زندہ رہنے کا جواز تو باقی رہ جاتا۔ کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا۔ کس لئے آپ نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ یہ دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گیا کہ میں خود اپنی بہن سے . . . ."

اس سے آگے اس سے بولا ہی نہ گیا۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر خود کو کرسی پہ گرا دیا۔

"شجاعت۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ فرحین تمہاری بہن نہیں ہے اور سجاد احمد تمہارے نہیں صرف اس کے باپ ہیں۔"

فاطمہ نے اپنے دل میں اٹھنے والی درد کی تمام ٹیسوں کو دبا کر اسے بتانے کی کوشش کی۔

وہ سمجھ چکی تھی شجاعت دور ہی سے سجاد احمد کو دیکھ کر ان سے اور فرحین سے کچھ کہے بغیر کچھ پوچھے بغیر لوٹ آیا ہے۔ اس نے یقیناً سجّاد کو فرحین کے باپ کے روپ میں آج پہلی بار دیکھا ہے۔ شجاعت نے اسے خود ہی بتایا تھا کہ فرحین کے ابا کئی سال سے باہر ہیں۔ فرحین کے گھر وہ اس سے پہلے گیا نہیں تھا جو ان کی کوئی تصویر دیکھ سکتا۔ ان دونوں کا ساتھ صرف یونیورسٹی تک رہتا تھا۔

شجاعت نے اس کی بات سن کر کہا "امّی خدا کے لئے آپ خاموش ہو جائیے ورنہ میرا ذہن میرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ آپ نے تو میرے لئے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا بھلا دیا ہے۔ پچیس سال تک جس کا نام لیکر آپ مجھے بتاتی رہیں کہ وہ میرا باپ ہے اور اب آپ مجھے بتا رہی ہیں کہ وہ میرا باپ نہیں۔ بتائیے میں ان پچیس سالوں کے ایک ایک لمحے کا یقین کروں یا آج کے ان چند لمحوں کا۔

"میں تو اس بات پر اتنا ہی ایمان لا چکا ہوں جتنا کہ خدا کے وجود پر میرا ایمان ہے۔ اور اس تصویر کے بارے میں اب کیا کہنا چاہیں گی۔ یہ تصویر آپ نے میرے پوچھنے پر بچپن میں کئی بار مجھے یہ کہہ کر نہیں دکھائی تھی کہ یہ تمہارے باپ کی تصویر ہے اور جسے میں نے اپنے باپ سے محرومی کو کم کرنے کے لئے آپ سے چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔"

شجاعت نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر فاطمہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ کہنے لگا۔ "آج میں نے فرحین کے ڈرائنگ روم میں ایسی کئی تصویریں لگی دیکھی ہیں۔ میں سمجھا شاید وہ ہماری رشتہ دار ہے۔ لیکن نوکر سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ تصویریں فرحین کے والد کی ہیں۔ پھر میں کسی سے ملے بغیر کچھ کہے بنا واپس لوٹ آیا۔"

یہ ساری باتیں سن کر فاطمہ نے ایکبار پھر بڑے التجا آمیز انداز میں اس سے کہا۔

"تم یقین کرو بیٹے۔ یہ تصویر سجاد احمد کی ضرور ہے لیکن تم ان کے بیٹے اور فرحین کے بھائی نہیں ہو۔"

"اب تھوڑی دیر بعد آپ شاید مجھ سے یہ کہیں گی کہ آپ بھی میری ماں نہیں ہیں۔"

شجاعت نے اس کی بات سن کر طنزیہ انداز میں کہا۔

"شاید نہیں۔ یقیناً" فاطمہ نے بڑے کرب سے کہا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ — آپ یقیناً مجھے پاگل کر دیں گی۔ آج میرا دماغ خراب ہو کر رہے گا۔ اُف میرے خدا میں کیا کروں؟ اگر — اگر سجاد احمد میرے باپ نہیں۔ آپ میری ماں نہیں ہیں تو پھر میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کس کا بیٹا ہوں؟ نہیں، نہیں۔ میں آپ کی اس بات کا یقین نہیں کر سکتا۔ نہیں کروں گا۔"

شجاعت نے بہت بے بسی کے عالم میں بڑی بے یقینی سے کہا۔

فاطمہ کا دل شجاعت کی حالت دیکھ کر چیخ چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ وہ پریشان تھی۔ کس طرح وہ شجاعت کو یقین دلائے کہ جو کچھ وہ مصلحت اور حالات کے تحت پچیس سال تک مسلسل اس کے ذہن میں اتارتی رہی وہ غلط تھا، غلط ہے اور غلط رہے گا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے قرآن شریف تھام کر کہا

"میں پھر تم سے کہتی ہوں تم سجاد احمد کے بیٹے اور فرحین کے بھائی نہیں ہو اور نہ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم — تم — میں تمہیں سب کچھ لکھ کر دے دوں گی اب مجھ میں مزید کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ لیکن اتنا بتا دوں میں صرف تمہاری ماں کو جانتی ہوں تمہارے باپ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی تصویر بھی میرے پاس نہیں ہے۔ بولو اب یقین آتا ہے تمہیں؟ اب یقین کرتے ہو تم —؟"

اب شجاعت کے پاس یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس نے بڑی بے بسی سے فاطمہ کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بنا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

اس کے جانے کے بعد فاطمہ بھی بے حال ہو کر بستر پر گر گئی۔

ایک بار پھر ذہن میں خیالوں کے سائے پھیلنے لگے۔ اس مقام سے آگے جہاں تک شجاعت کے دوسرے سے واپس لوٹ کر آنے تک پھیلے تھے۔

جب وہ سارہ احمد کے بتائے ہوئے پتے پر اس کے پاس ہاسپٹل پہنچی تو سارہ احمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے فاطمہ سے اس کا نام، پتہ اور دیگر ضروری باتیں پوچھنے کے بعد سارہ احمد کا پانچ دن کا بیٹا اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا" یہ پوسٹھیومس چائلڈ ہے۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کراچی سے آنے والی ہے یہ بچہ اس کے حوالے کر دینا اور ساتھ ہی اس نے سارہ احمد کا ایک خط بھی اسے دیا۔

فاطمہ حسن کو بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آسکا کہ زندگی میں اتنا مشکل مقام اس سے پہلے کب آیا تھا؟

وہ سارہ احمد کے بیٹے کو لینے اور اس کی خالہ ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جانے کیوں اور کس مصلحت کے تحت سارہ نے اپنا بیٹا صرف اس کے حوالے کرنے کو کہا تھا۔ وہ سارہ احمد کے بیٹے اور اس کی تمام چیزوں کو لے کر اپنی پناہ گاہ میں چلی آئی۔ یہ ایک بڑے گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں وہ ابھی چند دن پہلے آئی تھی۔

یہاں آ کر وہ کچھ دن اپنے ایک دور دراز کے رشتے کی خالہ کے ہاں رہی تھی۔ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت جلد ان پر بوجھ بننے والی ہے تو اس نے ایک کالج میں لیکچرر شپ کے لئے مسز سجاد کے نام سے درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی پھر وہ خالہ

کا گھر چھوڑ کر اس چھوٹی سی پناہ گاہ میں چلی آئی تھی۔

وہ بچے کو ایک طرف لٹا کر سارہ کا خط پڑھنے لگی۔

پیاری فاطمہ!

میری حالت بہت خراب ہے۔ اس لئے چند سطروں کا یہ بے ربط سا خط تمہارے نام لکھ رہی ہوں۔

میری امی اور ابا کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں میری شادی کر دی تھی۔ میں شروع ہی سے جس قسم کے ماحول میں رہی ہوں اس کا تمہیں بخوبی اندازہ ہے کئی مہینے پہلے ایک دن بہت زیادہ نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے میرے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا چند دن ہاسپٹل میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے میری جو حالت ہوئی اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اب جبکہ میری حالت بہت خراب ہے اور چند دنوں کے بعد میرا بیٹا یا بیٹی پیدا ہونے والی ہے تو ایک ایک کر کے سارے رشتے دار الگ ہو گئے ہیں۔ میرے بعد کوئی بھی اسے اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کسی کو میرے آزاد ماحول کے سبب اس کے جائز ہونے میں شبہ ہے اور کوئی مجھے اس کو یتیم خانے میں داخل کرنے کا مشورہ دے رہا ہے

ایسے وقت میں جبکہ اپنے پرائے ہو چکے ہیں مجھے تم یاد آ رہی ہو تم نے ہمیشہ اور ہر مشکل موقع پر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تم کس حال میں ہو، تمہاری منگنی یا شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ اگر تم بھی اپنی مجبوریوں اور حالات کے سبب اسے اپنے پاس نہ رکھ سکو تو پھر واقعی اسے کسی یتیم خانے میں داخل کر دینا۔

تمہاری سارہ

خط پڑھ کر اس نے سوچا

وہ کب تک اور کس کس بات پر صبر کرتی رہے گی؟ یہ آزمائش بھی اس کے نصیب میں لکھی تھی جو اس کے حوصلے سے بہت زیادہ ہے مگر نہیں۔ خدا کبھی بھی کسی کو اس کے حوصلے سے بڑھ کر تکلیف اور آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ اور وہ۔ اس میں تو ابھی بڑی ہمت ہے۔ بہت حوصلہ ہے۔ ابھی تو وہ آزمائشوں کی کڑی دھوپ میں بڑی دور تک جا سکتی ہے۔ غم کے پہاڑ کی آخری بلندیوں کو چھو سکتی ہے۔ درد کے سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہو سکتی ہے۔

خدا کی رحمت کے سبب اس نے تخیل کے ہر انداز سے ہٹ کر صرف ایک انداز میں سوچا۔ سوچ کے ہر زاویے کو نظر انداز کر کے صرف ایک مرکز پہ اپنی توجہ مبذول کر دی تھی اور وہ یہ تھا کہ کون جانتا ہے اور کس کو خبر ہے، کل کب اور کس مقام پر وہ کن حالات سے دوچار ہو گا۔ اگر اپنے حالات اور ماحول کے سبب آج وہ سارہ کی جگہ پر ہوتی تو کیا وہ برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا بیٹا کسی یتیم خانے میں پرورش پائے؟ اور ان تمام خرابیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ بن جائے جو ایسے بچوں میں ہوتی یا ہو سکتی ہیں۔ خدا نے ہر انسان کو دوسرے انسان کو خوشی یا غم پہنچانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ نفع یا نقصان پہنچانے کا وسیلہ بنا دیا ہے۔

اور فاطمہ حسن کے دل میں نیکی پیدا کر کے خدا نے اسے بھی سارہ احمد کے بیٹے کو یتیم خانے میں داخل ہونے سے بچ جانے کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ اور اس طرح فاطمہ حسن کی کڑی آزمائشیں سارہ احمد کی اس تمنا کی تکمیل کا سبب بن گئیں کہ اس کے بعد اس کے بیٹے کو یتیم خانے میں داخل نہ کیا جائے۔ ماں کے دل میں فطری اور قدرتی طور پر ایثار قربانی اور اپنے بچے کی پرورش کرنے کے سلسلے میں ساری مصیبتوں کو صبر سے برداشت کرنے کا احساس اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس کے اپنے وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

لیکن وہ تو کنواری لڑکی تھی اور ایک بچے کی پرورش کرنا، ایک قطرے کو سمندر بنانا بلاشبہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش، سب سے بڑا امتحان تھا۔ اور پروردگار نے اپنی رحمت، اپنی مہربانی کے ذریعے اس آزمائش اس امتحان میں پورا اترنے کی صلاحیت اسے بخش دی تھی۔ اس بچے کی پرورش کے ہر مشکل ترین مقام پر اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اسے کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو تنہا سر کرنا ہے یا افریقہ کے صحرائے اعظم کو تپتی ہوئی دھوپ میں تنہا عبور کرنا ہے۔

اس نے کالج میں اپنا نام مسز سجاد لکھوایا تھا۔ وہ ہر جگہ اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اسے معلوم تھا اگر اس نے اپنے نام کے ساتھ مسز کا اضافہ نہ کیا تو دنیا والے ایک کنواری لڑکی کے پاس ایک بچے کو دیکھ کر اس کا جینا اس انداز سے محال کریں گے کہ یہ زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔

شجاعت جب بچہ تھا جب اس نے اسکول جانا شروع کیا تھا تو وہ اس سے اپنے باپ کے بارے میں ایسے ایسے سوال کرتا تھا کہ وہ لاجواب ہو جاتی تھی۔ اس نے شجاعت کو بڑی مشکل سے یہ بات بتائی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اس پر شجاعت نے اپنے باپ کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ فاطمہ نے تو اس کے باپ کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ اس کی تصویر اس کے پاس تھی اور نہ ہی سارہ نے اس کا نام اپنے خط میں اسے لکھا تھا۔

شجاعت کے بہت رونے دھونے پر ایک دن تنگ

آکر اس نے سجاد احمد کی ایک تصویر اسے دکھا دی تھی۔ پھر اکثر وہ اس سے وہ تصویر مانگنے لگا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔

اسے معلوم نہ ہو سکا سجاد احمد واپس لوٹ آیا تھا یا نہیں وہ اگر آ بھی گیا ہوتا تو اب فاطمہ کے لئے اس کے آنے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

ایک ایک کر کے اب پچیس برس گزر چکے تھے اور ایک قطرے کو سمندر بنانے کی جدوجہد میں ان پچیس سالوں کا ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کر گزرا تھا۔ اس بات کا اندازہ صرف فاطمہ حسن لگا سکتی تھی۔ کوئی اور نہیں۔

اس مدت کے دوران ایک انقلاب اس طرح سے آیا تھا کہ وقت نے فاطمہ حسن کے بیٹے کو سجاد احمد کی بیٹی کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ان دونوں نے چار سال تک یونیورسٹی میں ساتھ پڑھا تھا۔ ان چار سالوں کے دوران فرحین نے شجاعت کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس کی شادی سوائے شجاعت کے اور کسی سے نہیں ہو سکتی۔

لیکن شجاعت کو سروس ملنے تک نہ فرحین نے اپنی امی سے اس بات کا ذکر کیا تھا نہ شجاعت نے اپنی امی سے۔

شجاعت کو سروس مل جانے کے بعد فرحین نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اب اس کے ابا بھی واپس آ چکے ہیں جو کئی سالوں سے باہر تھے۔ اس لئے اب وہ کسی دن بھی اپنی امی کو اس کے ہاں بھیج دے۔

اور آج جب کہ شجاعت کی چار سال کی تمنا کی تکمیل ہونے کا پہلا مرحلہ آیا تو اس پہلے مرحلے پر ہی اسے اس تمنا کی تکمیل نہ ہو سکنے کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔

آج بہت سالوں کے بعد وقت نے فاطمہ حسن کو سوالی بنا کر سجاد احمد کے در پہ لا کھڑا کیا تھا اور سجاد احمد نے جس کے دل میں فاطمہ حسن کی طرف سے بدگمانیاں گھر کر چکی تھیں، اس کے یہاں آنے کا سبب معلوم کرنے کے بعد اس کی ایسی ذلت اتنی توہین کی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سارے اگلے پچھلے حساب چکا دیئے تھے اور طنز کے ایسے تیر اس کے دل میں اتارے تھے جن کی چبھن کو اب زندگی کی آخری سانسوں تک باقی رہنا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی ہی کہتا رہا۔ اس کی ایک نہ سنی۔ اسے زبان کھولنے کا موقع نہ دیا۔

اور آخر میں اس نے طنز کا آخری بھرپور وار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مسز سیٹھ احسان احمد! ایک بار تم نے دولت کی کثیر مقدار کے لالچ میں اپنے باپ کی فرمانبرداری کے لئے خود کو مجبور پایا تھا آج میری بیٹی میرے سامنے مجبور ہے۔ آج میں اسے اپنی فرماں برداری کا سبق سکھاؤں گا۔ اس کی شادی تمہارے بیٹے سے بہت زیادہ دولتمند انسان سے کروں گا اور اگر وہ نہ مانی تو میں اس کے سامنے تمہاری مثال پیش کروں گا۔ یہ سبق میں نے تم سے سیکھا ہے کہ انسان کی دولت کے عوض دوسرے کی محبت اور خلوص کا سودا خسارے کا نہیں سراسر منافع کا سودا ہے۔"

اس نے فاطمہ کی کوئی بات نہیں سنی۔ اپنی ہی کہتا رہا۔ اسے معلوم تھا فاطمہ کے ابا نے اس کے اور فاطمہ کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا تھا۔ پھر بھی اس نے یہ نہ سوچا کہ ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ اس کا کوئی خط فاطمہ تک نہ پہنچنے دیا ہو اور اسی وجہ سے فاطمہ اسکے کسی بھی خط کا جواب نہ دے سکی ہو۔

لیکن انسان کمزوریوں کے مجموعے اور خطاؤں کے پتلے کا نام ہے۔ کبھی کبھی وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایسی باتوں کا یقین کر لیتا ہے جن کا یقین اسے نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہر انسان ہر موقع پر دوسرے کے بارے میں صحیح انداز میں سوچنے لگے تو آپس میں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ دشمنیاں جنم نہ لیں۔

اگر سجاد احمد فاطمہ حسن کے بارے میں منفی انداز کے بجائے مثبت انداز میں سوچ سکتا تو اس کے اور فاطمہ حسن کے درمیان بدگمانیاں کس طرح جنم لیتیں۔ صدیوں کے فاصلے کس طرح حائل ہوتے؟ فاطمہ حسن اتنی آزمائشوں سے کس طرح گزرتی؟ اس کی قسمت میں اتنی بربادیاں کیوں کر لکھ دی جاتیں؟

جب فاطمہ حسن خیالوں کے جزیرے سے واپس لوٹی تو اس کے چہرے پر آنسو ہی آنسو تھے۔ اس نے ساری رات جاگ کر شروع سے آخر تک کا ایک ایک واقعہ جس میں آج سجاد احمد کے ہاں اس پر گزرنے والے درد کے ایک ایک لمحے کا ذکر بھی شامل تھا شجاعت کے لئے لکھ کر اس کے سرہانے رکھ دیا۔ شجاعت جب اس دردناک کہانی کا ایک ایک لفظ پڑھ کر حقیقت سے باخبر ہو چکا تو مرد ہونے کے باوجود وہ دل کے دریا سے اٹھنے والے سیلاب کو آنکھوں کے ساحلوں تک آنے سے نہ روک سکا۔ اس نے اپنا سر فاطمہ کے قدموں میں رکھ دیا اور کہا

"آپ نے ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ماں کا حق ادا کر دیا۔ آپ کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لئے تو میری تمام عمر بھی ناکافی ہے۔"

آپ کی عظمت بہت زیادہ ہے اور میرے پاس الفاظ بہت کم ہیں۔ میں اگر چاہوں بھی تو الفاظ میں آپ کے احسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ میں قطرہ ہوں اور آپ سمندر۔ مجھے اپنے آپ سے جدا نہ کیجئے گا آپ سے الگ ہوکر میرا وجود بے معنی ہوجائے گا۔ میں اب کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"

فاطمہ نے اسے اٹھا کر اپنے پاس بٹھایا اور کہا

"زندگی اس طرح نہیں گزرا کرتی جس طرح تم گزار دینا چاہتے ہو۔ تمہیں شادی کرنی پڑے گی۔"

"آپ عورت ہوکر اس طرح زندگی گزار سکتی ہیں تو کیا میں مرد ہوکر ایسا نہیں کرسکتا۔ میں آپ کی برابری تو مر کر بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن اتنا کم ظرف بھی نہیں بننا چاہتا کہ زندگی کے باقی دنوں میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں۔ اب میری ساری محبت ساری توجہ آپ کے لئے وقف رہے گی۔ امی اب میں اس میں کسی اور کو حصے دار نہیں بنا سکتا یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ لیکن صرف ایکبار مجھے سجاد صاحب کے گھر جانے کی اجازت دے دیجئے۔

جو بات آپ انہیں نہ بتا سکیں وہ میں انہیں بتاؤں گا۔ میں ان پر اپنی حقیقت واضح کردوں گا کہ جسے وہ ذرہ سمجھتے ہیں وہ بلندی میں پہاڑوں کے برابر ہے۔"

لیکن فاطمہ حسن نے شجاعت کو وہاں جانے سے روک دیا اگر اب بھی شجاعت کی فرحین سے شادی کا سوال درپیش ہوتا تو وہ اسے وہاں جانے اور سجاد احمد کو یہ باتیں بتانے سے نہ روکتی، لیکن اب اپنے آپ کو سجاد احمد کی نظروں میں بے قصور و بے خطا نیک اور پارسا ظاہر کرنے کے لئے شجاعت کا وہاں جانا منظور نہ تھا۔

جب وقت پر ایک بات نہ ہوسکی تو بعد از وقت اسے پورا کرنا بے سود اور لا حاصل تھا۔ اور اب — اب تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ اب ایسا کرنے سے سجاد احمد کے پرسکون گھر کا سکون تو برباد ہوسکتا تھا۔ اس کا دل اپنی بیوی کی طرف سے ہٹ تو سکتا تھا۔ وہ فاطمہ حسن کے اپنے بعد کسی اور سے شادی نہ کرکے تنہا زندگی گزارنے کے فیصلے کو سراہ تو سکتا تھا لیکن اس طرح فاطمہ حسن کی عمر کا وہ دور واپس نہیں آسکتا تھا جو کبھی واپس لوٹ کر نہ آنے کے لئے گزر چکا تھا۔ اس کی زندگی کے وہ روز و شب وہ ماہ و سال واپس نہیں آسکتے تھے جو بیت چکے تھے۔ اب اس کے بالوں کی سفیدی سیاہی میں نہیں بدل سکتی تھی۔ اس کی مانگ میں افشاں نہیں سج سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی نہیں رچ سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں امنگوں بھرے خواب نہیں دیکھ سکتی تھیں اور اس کی زندگی میں آکر گزر جانے والے بے کیف موسم پر کیف نہیں ہوسکتے تھے۔

پھر اس ایک شخص سجاد احمد نے واقعی اپنی بیٹی فرحین کی شادی بہت دولتمند لڑکے سے کردی اسے اپنی فرمانبرداری پر مجبور کردیا اور کبھی بھی یہ نہ جان سکا، یہ نہ جاننا چاہا کہ ایک لڑکی نے جس کا نام فاطمہ حسن تھا، اس کی خاطر اپنی زندگی گنوا دی۔ لیکن دولت کی کثیر مقدار کے عوض بھی اس کے علاوہ کسی اور کو وہ مقام دینا گوارا نہ کیا جسے وہ صرف سجاد احمد کے لئے وقف کرچکی تھی۔

جھوٹے رنگ سارے



لبنیٰ عروج

"ڈرتی ہوں آشا کہیں یہ تمہارے اتنے بے پناہ نازک نازک سپنے بکھر نہ جائیں۔"

روپا نے حقیقتاً خوفزدہ ہو کر آشا کو دیکھا۔

"چھوڑو دیدی تم بھی کن چکروں میں پڑ گئیں۔"

آشا نے انتہائی نفاست سے ڈیکوریٹ کی ہوئی فلاور باسکٹ اٹھا کر دوبارہ ایک نئے انداز سے نئے زاویئے سے کارنر ٹیبل پر سجادی۔

"خوابوں میں رہنا چھوڑ دو آشا۔"

خواب بہت حسین ہوتے ہیں دیدی اور مجھے حسن سے پیار ہے۔" "نہ ہم کسی کے کہے سے سپنے بنتے ہیں نہ چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ تو ایک نیچرل کسی بات ہے جس میں ہم بے بس ہوتے ہیں۔"

"مجھے خوف آتا ہے آشا۔ تو نہیں جانتی پریکٹیکل لائف کتنی کٹھن ہوتی ہے۔"

"میرے من مندر میں تو بڑی پیاری شبیہیں سجی ہیں دیدی۔"

آشا نے روپا کو مزید چڑایا۔

"بھگوان تیری ساری آشائیں پوری کرے آشا۔"

"تھینک یو دیدی۔" آشا ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

"پاپا آپ کو یاد ہے پرسوں میری برتھ ڈے ہے۔"

"بالکل یاد ہے بیٹے۔"

"کیا تحفہ دیں گے؟"

وہ بڑی شرارت سے ہنس رہی تھی۔

"بیٹے ہم سوچ رہے ہیں اس دفعہ تو پھولوں کی پوری نرسری خرید کر تمہارے نام کر دیں۔"

"ہائے پاپا دی گریٹ۔"

وہ بھاگ کر پاپا کی کرسی کے بازو پر جا بیٹھی مگر ماتا جی کو سچ مچ غصہ آگیا۔

"لڑکیوں کے اتنے لاڈ کرنا اچھا نہیں ہوتا جی۔ کیا خبر ان کے بھاگوں میں کیا لکھا ہے۔"

"تم تو ہمیشہ ہی بدفال نکالتی ہو روپا کی ماں۔" پاپا دھیمے سے مسکرائے۔

"بھگوان نہ کرے بدفال کیوں نکالوں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ اب دیکھو روپا کا کبھی ہم نے اتنی دور کا سوچا تھا۔"

"یہ سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔"

تبھی روپا اور اس کا شوہر آنند آگئے۔

"کیا حال ہے بھئی آنند۔ خوب سوئے آج تو۔"

"بس پاپا۔ ایسے ہی آنکھ لگ گئی تھی۔"

کیا باتیں ہو رہی تھیں ماما؟"

روپا ماں کے پاس آبیٹھی۔

"یہ آشا اپنے جنم دن کا پروگرام بنا رہی تھی۔"

ماتا جی روپا کو دیکھ کر شفقت سے مسکرائیں۔

"ارے ہاں جیجا جی۔ آپ مجھے کیا دے رہے ہیں؟"

"ویری بیڈ۔ آشا تم آج بھی اتنی ہی ماندیدی ہو جتنی آج سے چار سال پہلے تھیں۔"

آنند نے شرارت سے آشا کو چڑایا۔

"ارے واہ دیدی تم نے جیجا جی کو ایک انچ بھی نہیں بدلا آج بھی ویسے ہی کنجوس ہیں جیسے چار سال پہلے تھے۔"

آشا نے شرارت سے آنند کو چڑایا۔

آشا کی بات پر سب ہنس پڑے۔

"ویسے آشا میں تمہیں اس مرتبہ کتابیں دے رہا ہوں۔"

"ریئلی دیدی!"

آشا نے تائید طلب نظروں سے روپا کی طرف دیکھا۔

"ہاں انھوں نے اس مرتبہ یہی سوچا ہے۔"

روپا دھیمے سے مسکرائی۔

"ہائے رام۔ یہ آشا کتنی دیوانی ہے۔ حقیقی دنیا سے کوسوں پرے۔ یہ پھول اور کتابیں اسے کب تک آسرا دیں گے۔"

روپا نے ایک بار پھر اس سانولی سی پرکشش سی آشا کو بغور دیکھا جو پاپا سے جانے کس بحث میں الجھی بے تحاشا دلائل دے رہی تھی۔

روپا انتہائی حقیقت پسند تھی جبکہ آشا اس کے بالکل

برعکس تھی۔
"کتابوں کو چھوڑو آشا، اب انسانوں کو پڑھو۔"
"انسانوں کو پڑھنے کو جی نہیں مانتا دیدی۔ یہ تن کے جتنے اجلے ہیں من کے اتنے ہی میلے۔ کھوٹ ہی کھوٹ ہے۔"
"ساری زندگی اسی کھوٹ سے نباہ کرنا پڑتا ہے آشو۔"
"دیدی آپ کا اشارہ کہیں جیجا جی کی طرف تو نہیں؟"
آشا شرارت سے ہنسی۔
"ہائے رام یہ آشا کبھی کبھی کیسی بے وقوفی کی باتیں کر جاتی ہے۔" پھر دھیرے سے بولی "میں تو ایک جنرل بات کر رہی تھی۔"



سالگرہ کی تقریب ختم ہونے کے بعد جب تحائف دیکھے گئے تو اکثریت نے آشا کو پھولوں اور کتابوں کے تحائف دیئے تھے۔ یہ لڑکی کسی کھلی کتاب کی مانند ہے۔ اس کے دوستوں، سکھیوں سب کو اس کے ذوق اور شوق سے مکمل آگہی ہے۔ کچھ باتیں چھپا کے بھی تو رکھنا چاہئیں۔ روپا اپنی محتاط طبیعت کی وجہ سے ہمیشہ ایسے ہی سوچا کرتی تھی۔

اس صبح روپا اور اس کا شوہر آنند لندن واپس جا رہے تھے۔ آشا، پاپا اور ماتا جی سمیت بہت اداس اور خاموش تھی۔

"ہائے دیدی تمہاری یہ چار ماہ کی چھٹیاں تو یوں گزر گئیں جیسے چار دن۔" آشا روہانسی ہو رہی تھی۔

"ہم تمہاری وداعیگی پہ آئیں گے آشا۔"

آنند نے جاتے جاتے ماحول کو خوشگوار بنانا چاہا۔ آشا آنند کی بات پہ سمٹ سی گئی۔

"ماما۔ اس کا بیاہ بہت سوچ سمجھ کر کیجئے گا۔ یہ بہت حساس ہے۔"

روپا کو جاتے جاتے بھی اس دیوانی سی آشا کی فکر ستا رہی تھی جو انتہائی آرٹسٹک مائنڈڈ تھی۔ رنگ، خوشبو، پھول اور کتابوں کو چاہنے والی، جو سدا اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ اپنی چھوٹی سی دنیا میں بے تحاشہ مصروف۔

اس شام بادل بہت گھر کے آئے تھے۔ آشا لان میں پودوں کو پانی دیتے ہوئے مسلسل خود بھی گنگنا رہی تھی۔

"ہائے آشا۔"

اس کی ہمسائی کرن سنتھے کی باڑ سے بنی ہوئی باؤنڈری وال پھلانگ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"ہائے کرن۔" آشا پانی چھوڑ چھاڑ اس کے قریب چلی آئی۔ "اتنے حسین موسم میں بھی گھر میں گھسی بیٹھی ہو کبھی تو اس چار دیواری سے باہر نکل کر بھی دیکھ لیا کرو۔"

"باہر کی دنیا میں سوائے جھوٹ اور کھوٹ کے رکھا ہی کیا ہے۔"

"افوہ اتنے حسین موسم میں لیکچر سننے تو ہرگز نہیں آئی تھی۔"

"تمہیں تو پتہ ہے میں ایسی ہی باتوں کی شیدائی ہوں پھر کیوں آتی ہو میرے پاس؟"

کرن سے اس کی دوستی بھی بے تحاشا تھی اور یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں آپس میں تکرار بڑھ کے ناراضگی کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی۔ آشا کبھی کرن کو مناتی نہیں تھی۔ اسی لئے کرن خود ہی مان کر اس کے پاس چلی آتی تھی۔ اور یوں یہ دوستی کا رشتہ قائم تھا۔

ان دنوں وہ بی۔اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ سارا دن گانے سنتی، پھول چنتی اور کتابیں پڑھتی۔ انہی دنوں ایک دن اس نے سنا پاپا، ماتا جی سے کہہ رہے تھے۔

"راجیش اچھا لڑکا ہے روپا کی ماں اور پھر اگروال کے قریبی جاننے والے میں سے ہے بس تم بھگوان کی کرپا سے یہ کام طے ہی سمجھو۔"

"بن دیکھے بھالے میں بھائی امرناتھ اگروال کی کسی بھی بات کا کیسے اعتبار کر لوں۔"

ماتا جی فیصلہ کرنے میں متردد تھیں جبکہ کھنہ صاحب مطمئن تھے۔

"پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ معقول آمدنی ہے شریف لوگ ہیں۔"

یہ سب تو ٹھیک ہے مگر تم جانو آشا کچھ مختلف قسم کی لڑکی ہے۔"

"ارے نہیں روپا کی ماں، سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ نازک بیلوں کی مانند، جو سہارا دے دو اسی کے سہارے پروان چڑھ جاتی ہیں۔"

"مگر آشا!"

"ارے بھئی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم چنتا نہ کرو۔"

کھنہ صاحب اور ماتا جی کی رضامندی سے اگروال صاحب نے بات آگے چلا دی۔ آشا نے سنا تو چھوئی موئی سی ہو گئی۔

"راجیش۔" "کتنا خوبصورت نام ہے۔" وہ نام کے حسن میں کھو گئی۔ "راج" "کہنا تو اور بھی اچھا لگے گا۔" اس نے دیوانوں کی طرح خوش ہو کر سوچا۔ اگلے ہی ہفتے راجیش اپنی ماتا جی اور پتا جی سمیت اس کے گھر آیا تو اس نے کرن کی مدد سے کی ہول میں سے جھانک کر اسے دیکھا اور کھو سی گئی۔ وہ ہر طرح سے مکمل لگ رہا تھا۔ بڑے مہذبانہ انداز میں بیٹھا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ زرد آدھی آستین کی شرٹ اور براؤن پینٹ میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ کرن نے خوش ہو کر اسے ڈھیروں مبارکبادیں دے ڈالیں۔ آناً فاناً ہی رشتہ طے ہو گیا۔ راجیش کی والدہ کچھ بیمار سی رہتی تھیں اسی لیے وہ لوگ شادی پہ بہت زور دے رہے تھے۔ جبکہ آشا کی ماتا کچھ سوچنا چاہتی تھیں۔ "جہیز کی تیاری میں بھی تو کچھ وقت لگے گا۔" وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں اور پھر آخر وہ دن بھی آ گیا۔ آشا دلہن بنی غضب ڈھا رہی تھی۔ پھر ساری رسموں میں سے گزرتی ہوئی وہ راجیش کے آنگن میں آ اتری۔

زندگی ایک دم ہی بڑی حسین بڑی رنگین ہوگئی تھی۔ راجیش کو پا کے یوں لگتا تھا جیسے سارا جہاں پالیا ہو۔ چند ماہ تو پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ اس سارے عرصے میں راجیش کی ماتاجی کئی تلخ باتیں کرگئی تھیں جنھیں سن کر آشا نے رو رو کے آنکھیں سجالی تھیں۔ تب راجیش نے اسے کتنا دلاسہ دیا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا کہ "ماں جی کی طبیعت ایسی ہی ہے۔ وہ بہت ضدی اور جذباتی ہیں۔" راجیش کا پیار اس کی توجہ پا کے وہ پھر سنبھل جاتی تھی۔ راجیش کی ماتاجی ایک ان پڑھ اور ضدی عورت تھیں۔ جنھیں اپنی بات منوانے کا خبط تھا۔ جنون تھا۔ وہ سمجھتی تھیں۔ سب لوگ غلط ہیں۔ بس وہ ٹھیک ہیں۔ آشا ابھی نادان تھی ناسمجھ تھی۔ وہ زمانہ سازی کے فن سے ناآشنا تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہہ جاتی تھی۔ بس اسی بات پہ وہ مارے غم و غصہ کے لال پیلی ہو جاتی تھیں۔ راجیش کے پتا سنہا صاحب بھی ان سے بہت ڈرتے تھے۔

اس خاموشی سے گھر کے در و دیوار سے کبھی کبھی تو اسے خوف آتا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے وہ عادی ہوتی چلی گئی اس گھر کے مکین کیسے تھے یہ سب دھیرے دھیرے اس پر کھلتا چلا گیا۔ راجیش جو اسے شروع شروع میں بہت مکمل لگا کرتا تھا۔ اب دھیرے دھیرے اس کی کئی خامیاں اس پر ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ بھی اپنی ماتا کی طرح بہت منہ پھٹ اور بدزبان تھا۔ جب جو جی چاہتا تھا کہہ جاتا تھا اور وہ حیرت سے دیکھتی رہ جاتی تھی۔ یہ شخص بظاہر کتنا مہذب کتنا اچھا لگتا ہے مگر من کتنا میلا ہے۔" وہ گھنٹوں سوچوں میں کھوئی رہتی۔ "تم ٹھیک کہتی تھیں دیدی۔ سارا جیون کھوٹ کے سنگ ہی بتانا پڑتا ہے۔"

انہی دنوں راجیش کو آفس کی طرف سے تین ماہ کے لئے لندن جانا پڑ گیا تو وہ سخت ہراساں ہوگئی۔

"راج آپ کب لوٹیں گے؟"

"تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ہائے رام۔"

وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"کیوں؟"

راجیش کا استفسار کتنا غلط تھا، وہ بجھ سی گئی۔

"کچھ نہیں۔ آپ کے بنا جی نہیں لگے گا راج۔"

وہ تنہا رہ جانے کے احساس سے انتہائی خوفزدہ تھی۔

"کیوں، گھر میں اور لوگ نہیں ہیں کیا؟"

راجیش کا لہجہ ایسا تھا کہ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی چپ چاپ سر جھکا کے ان کا اٹیچی تیار کرتی رہی۔ راجیش چلا گیا تو وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بہت دنوں تک کتابوں سے جی بہلاتی رہی پھر ڈھیروں نئے پھول بنا ڈالے۔ تب راجیش کی ماتاجی کو اعتراض کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔

"بہو یہ کیا تم ہر دم وقت اور پیسہ برباد کیا کرتی ہو؟"

"جی؟"

وہ چونک سی گئی۔ دل بجھ سا گیا۔ باقی ماندہ پھول اس نے بنائے سجائے بغیر ہی سارا سامان سمیٹ کر رکھ دیا۔ شام کو وہ برآمدے میں کرسی ڈالے ڈوبتے ہوئے سورج کو بغور دیکھ رہی تھی جب مغرب میں فضا دھواں دھواں ہوگئی تو وہ گہری سوچوں میں ڈوب گئی۔ تبھی راجیش کے پتاجی آگئے۔

"ارے آشا بیٹی۔ اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو۔ اندر چل کر بیٹھو۔"

"جی اچھا۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر اندر چلی آئی۔ آس پڑوس میں بھی کوئی اس کی ہم عمر، ہم ذوق نہیں تھی۔ تنہائی سی تنہائی تھی۔ وہ روہانسی ہو جاتی۔ ساتھ والے شرما صاحب کی بچی کی سالگرہ تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کو تیار ہوگئی۔ ماتاجی اور پتاجی بھی تیار تھے۔ وہ تو محض اس لئے چلی آئی تھی کہ کچھ تو یہ دل بہلے گا مگر وہاں اکثریت بچوں اور بزرگوں کی تھی۔ وہ چپ چاپ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے بیٹھی رنگ برنگے کپڑوں والے بچوں کو دیکھتی رہی۔ واپسی میں وہ بہت خاموش تھی۔

"کیا بات ہے آشا بیٹی بہت چپ چپ ہو۔"

ایک پتاجی تھے جو اوروں سے ذرا مختلف تھے۔ نرم خو، ہمدرد سے ان کے سلوک اور شفقت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی مشفق سی مسکراہٹ ان کا خاصہ تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ راجیش کی غیر موجودگی میں بھی وقت گزار رہی تھی اک پتاجی کی شفقتوں کے سہارے، ورنہ راجیش کی ماتاجی کا سلوک ان کی رلا دینے والی جا بلا نہ طعن و تشنیع سے بھرپور گفتگو، شاید وہ اس ماحول میں چند دن بھی زندہ نہ رہ سکتی۔

اس صبح وہ سویرے ہی اٹھ بیٹھی۔ پوجا پاٹ کے بعد وہ شال اپنے گرد لپیٹے چپکے سے لان میں چلی آئی۔ سبز گھاس پہ اور پھولوں پہ پڑی شبنم کو دیکھ کر روح تک میں تراوٹ سی گھل گئی۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کے کھو سی گئی۔ "راج تم کب آؤ گے؟"

اس نے لاشعوری طور پر نظریں گیٹ پر جما دیں۔ چند لمحے کی جو خوشی ملی تھی وہ اداسی میں بدل گئی۔ اس کی پلکوں پہ آنسوؤں کے ستارے جگمگا اٹھے تو۔ وہ پلٹ کر اندر چلی آئی۔

"یہ صبح صبح تم کہاں گئی تھیں بہو؟"

"کہیں نہیں ماتا جی۔"

اس کا دل قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے سوال کرے۔ وجہ پوچھے۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ پلکیں موند کے کہیں دور چلی جائے۔

"ناشتہ کر لو بیٹی۔"

سنہا صاحب کی آواز پر وہ چونکی اور دھیرے سے چھوٹی سی چوکور میز کے گرد آن بیٹھی۔

"راج کی ماں آج تو بہت سردی پڑ رہی ہے۔"

پتا جی نے ہیٹر کے سامنے ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہوگی۔ آشا بھی تو باہر گئی تھی اس نے تو شکایت نہیں کی۔"

"میں کہیں باہر نہیں گئی تھی ماتا جی۔ برآمدے میں کھڑی تھی۔"

"کیا خبر؟"

ماتا جی کے اس دو لفظی جملے میں جانے کیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ انتہائی حیرت سے ماتا جی کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھر رہی تھیں۔ اس نے بڑی بے بسی سے پتا جی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بیچارگی سے سر جھکا لیا۔ وہ ادھورا ناشتہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل بجھ سا گیا۔ ہم پڑھی لکھی لڑکیاں کتنی بے بس ہوتی ہیں۔ ہم ساری زندگی اپنے پڑھے لکھے ہونے کا خمیازہ بھگتتے ہیں محض اس لئے کہ ہم عام لوگوں کی طرح اخلاقی حدود پار نہیں کر سکتے۔ ہم جو شعور و آگہی کی سزا کاٹتے ہیں۔ وہ کب ایسی اذیت ناک کیفیتوں سے گزرتی ہیں۔ وہ تو جو جی چاہتا ہے کہہ ڈالتی ہیں کہ انہیں آداب سے واقفیت نہیں ہوتی۔ ادھر ہر قدم پہ اپنی کیفیت ہمارے پاؤں کی زنجیر بنے رہتے ہیں۔ جہالت اور علمیت کا یہ دوراہا کیسا ہوتا ہے؟ ایک طرف پرنور اجالا اور دوسری طرف پاتال سے بھی گہرا اندھیرا۔ الٰہی۔ ہم ایسے کیوں ہیں اور وہ ایسے کیوں ہیں؟ وہ شام تک اپنی سوچوں میں غلطاں رہی ہم کہ ساری زندگی ماں باپ کے در پہ بیٹھ کر ایک جیون ساتھی کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ آتا ہے تو زمین و آسمان کے ذہنی فاصلے لے کر۔ زندگی میں یہ موڑ کتنے چپکے سے آجاتا ہے۔ یہ ہم لڑکیاں جو کانچ کے گھروندے بنا کے ان میں پھول سجاتی رہتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ گھروندے ٹوٹ گئے تو کتنے پھول بکھر جائیں گے۔ کتنی کرچیاں روح تک کو زخمی کر ڈالیں گی۔ وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ صبح کی بات لئے بھولتی ہی نہ تھی۔ دل و دماغ میں طوفان سا آیا ہوا تھا اور وہ آنسوؤں کی روانی میں سب کچھ بہائے جا رہی تھی۔

"آشا۔ کدھر ہو بھئی؟" پتا کی آواز مارے مسرتوں کے لرز رہی تھی۔

"جی۔" وہ چپکے سے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"آشا، راج آ رہا ہے بھئی پرسوں شام کی فلائٹ سے۔"

"سچ پتا جی۔"

"یہ کیسا حسین لمحہ تھا جس نے سارے دکھ بھلا دیئے تھے۔ راج آ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ ہی مسکرا پڑی۔ سارے گھر میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے سارے گھر کو ایک نئے طریقے سے آراستہ کیا۔ جا بجا نئے بنائے ہوئے پھول سجا دیئے سارا گھر اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ وہ خود ہی مسکرا دی۔ لگتا تھا سارا جمود ٹوٹ گیا ہو۔ سکوت نے کہیں منہ چھپا لیا تھا۔

پنک کلر کے کپڑوں میں وہ خود بھی پنک سی لگ رہی تھی۔ پتا جی اور ماتا جی کے سنگ وہ ایئرپورٹ پر کھڑی بڑی مضطرب ہو رہی تھی۔ بار بار دیکھتی تھی۔ تبھی راجیش کا پلین آ گیا۔ ڈارک براؤن گرم سوٹ میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ رنگ کچھ اور بھی سرخ سفید ہو گیا تھا۔ وہ پتا جی کے گلے لگ گیا۔ پھر ماتا جی کے سامنے آشیرباد دینے کو جھک گیا۔ وہ بس دیکھتی رہی۔

"کیسی ہو آشا؟"

"ٹھیک ہوں۔"

جانے کیوں اسے راج سے ڈھیر ساری شرم آ رہی تھی۔ وہ تینوں کار میں بیٹھ کر بھی باتیں کئے جا رہے تھے۔ وہ چپ تھی تبھی پتا جی نے کہا۔

"آشا تم بھی تو بولو بیٹی۔"

"ودیدی کیسی تھیں راج؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" راج اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دیا۔ وہ پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ "تمہیں بہت یاد کرتی تھیں" راج کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ وہ سرخ پڑ گئی۔ راج کیا آیا اس کے چاروں طرف بہار ہی بہار چھا گئی۔ یہ زندگی ایک دم ہی بڑی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ "ارے واہ۔ گھر تو بہت سجایا

ہے"۔ راجیش نے تعریفی نظروں سے ڈرائنگ روم کو دیکھا۔ وہ کھل اٹھی۔

"راج آپ کو کیسا لگا یہ سب کچھ؟"

"بہت اچھا"

"اور۔۔۔ اور۔۔۔!" اس کا دل چاہتا تھا راج ڈرائنگ روم کی شیشے کی کھڑکیوں کے ساتھ چڑھتی ہوئی منی پلانٹ کی بیل کو تو کم از کم غور سے دیکھے۔ اس نے فوم ڈائی کر کے اتنی خوبصورت بنائی تھی جیسے پیپر مچ کی ہو۔ مگر راجیش کا سرسری انداز دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"یہ مالا آشا دیوی کی نذر۔"

راجیش نے بڑی خوبصورت سفید موتیوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔ وہ راجیش کی پسند کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیسی لگی؟"

"بہت خوبصورت ہے راج!"

دونوں کے مشترکہ قہقہوں سے ڈرائنگ روم گونج اٹھا۔

راج نے ڈیوٹی جوائن کر لی تھی۔ اس کے دن پھر ویران ہو گئے تھے۔ وہی ماتاجی کا تلخ لہجہ اور دل دکھا دینے والا رویہ تھا اور وہ تھی۔ شام کو راج آجاتا تو وہ جی اٹھتی تھی۔ اس دوپہر وہ لان میں کرسی ڈالے کسی کتاب کے مطالعے میں بری طرح غرق تھی۔ سنہا صاحب بھی آرام کرسی میں دھنسے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ماتا جی کسی پرانے کپڑے کی مرمت میں منہمک تھیں۔ تبھی کوئی فقیر اندر آگیا۔ اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ آشا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"پتاجی۔ یہ تو حقیقتاً کوئی ضرورتمند لگتا ہے۔"

اس نے انگریزی میں سنہا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا تو جواباً انھوں نے بھی اس کی تائید کر دی۔ ماتاجی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے انہیں گھورتی رہیں۔ اور سنہا صاحب نے چند سکے سائل کے کشکول میں ڈال دیئے۔ پتاجی انگریزی جانتے تھے اور روانی سے بول بھی لیتے تھے۔ وہ بے تحاشہ خوش ہو گئی اس دن کے بعد وہ اکثر ان کے ساتھ انگریزی میں باتیں کر لیتی تھی۔ جی کا بوجھ یوں ہلکا کر لیتی تھی کہ اکثر پتاجی اس کی باتوں کی تائید کر جاتے تھے۔ اس دن وہ صبح ہی سے بہت خوش تھی اور وجہ اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ شام کو راج آیا تو جانے کیوں وہ مووی دیکھنے کی ضد کر بیٹھی۔

"راج پلیز چلو نا۔"

"میں بہت تھکا ہوا آیا ہوں آشا۔"

"پلیز راج دکھادو نا آج بہت من چاہ رہا ہے۔"

وہ بچوں کی طرح ضد کر بیٹھی۔

"سنتی نہیں ہو وہ تھکا ہوا آیا ہے۔"

ماتاجی کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سخت تھا۔ وہ چپ رہ گئی۔ مگر جانے کیوں راج کی طرف سے دل میں میل سا آگیا۔ "کیا تھا اگر راج مان لیتا"۔ آنکھیں برسنے کو تھیں مگر اس نے آنسو پی لیئے کہ کچھ لوگ ان آنسوؤں کی عظمت کے اہل ہی نہیں ہوتے۔ مدت ہوئی اس نے تو کچھ چاہنا ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ راج آتے ہی اپنی تھکاوٹ کا اعلان کر دیتا تھا۔ وہ کھانا کھا کر سو جاتا تو وہ نیند نہ آنے کے باعث ادھر ادھر ڈولتی پھرتی۔ اس کی زندگی میں سوائے راج کے کوئی رنگینی نہ تھی۔ اور راج بھی کچھ ایسا تھا کہ من میں آتی تو اس کے دل میں پھول ہی پھول کھلا دیتا اور کبھی ایسا کٹھور بن جاتا۔ ایسی باتیں کر جاتا کہ دل ٹکڑے ہو جاتا اور وہ بمشکل خود کو سنبھال پاتی۔ یہ مرد شوہر بن کر صرف شوہر ہی رہ جاتے ہیں۔ تنگ نظر، کم ظرف۔ ایسے ایسے اصول وضع کر لیتے ہیں جو زندگی کو اجیرن کر دیتے ہیں۔ احساسات و جذبات کی دنیا سے کوسوں پرے۔ اپنی پتنی سے جانے کس جنم کا بدلہ لیتے ہیں۔ اس کی سوچیں بڑی عجیب ہو جاتی تھیں۔ پھر راج کے پکارنے پر وہ سب کچھ جھٹک کر اس کے کاموں میں خود کو بے انتہا مصروف کر لیتی تھی۔ وقت حسب عادت کبھی روانی سے کبھی آہستگی سے گزرتا ہی رہا اور آشا ایک بچی کی ماں بن گئی۔ لاجونتی کی آمد نے جیسے زندگی میں ڈھیروں نئے رنگ بھر دیئے تھے۔ وہ بہت مصروف رہنے لگی تھی۔ ماتاجی کے سلوک میں بھی شفقت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ راج کو بچی سے ایسی محبت تھی کہ اس کے بنا رہ ہی نہ سکتا تھا۔ پتاجی بھی لاج کے ساتھ بچہ ہی بن جاتے تھے۔

وہ بڑی مطمئن سی ہو گئی تھی۔ پھول بنانے کا سارا سامان سمیٹے مدتیں ہونے کو آئی تھیں۔ اب تو اسے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ بک شیلف کی گرد ہی جھاڑ ڈالے۔

"راج ہم اپنی بیٹی کو زیادہ نہیں پڑھائیں گے۔"

اس کی اس بات پر راج نے اسے چونک کر دیکھا۔

"کیوں؟"

"بس دسویں درجے تک ہی پڑھائیں گے۔"

وہ پھر اپنی بات دہرا گئی تو لیٹا ہوا راج ایکدم اٹھ بیٹھا۔

"یہ بات تمہیں کیوں سوجھی۔"

"ایسے ہی سوچتی ہوں، زیادہ شعور اور آگہی کبھی کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ کیا خبر اس کے بھاگوں میں کیا لکھا ہے۔"

"ارے آشا جی تم چنتا مت کرو۔ بھگوان بہتر کرے گا۔"

راج کو جانے کیوں ہنسی آگئی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ دن رات بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ وہ بہت مگن بہت مصروف تھی۔ اس کی شادی کو تین سال گزر چکے تھے۔ لاج اب ایک سال کی ہو

گئی تھی۔ اس کی پیاری پیاری حرکتوں اور اداؤں پر وہ سب کے سب نثار تھے۔

تبھی انہی دنوں روپا دیدی اچانک ہی آگئیں۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ مسکرا پڑیں۔

"آشا پلیز میرا یہ رومال اور جرابیں ذرا جلدی سے دھو دو۔ مجھے آنند بھائی کے ساتھ جانا ہے۔"

وہ راج کو شیو کے لئے گرم پانی دینے آئی تو راج نے نیا حکم سنا دیا۔ وہ خوشدلی سے مسکراتی ہوئی راج کے گندے اور میلے جراب اٹھا کر باتھ روم کی طرف بڑھی تو روپا دیدی نزدیک آگئیں۔ اس کے ہاتھ میں گندے جراب دیکھ کر نہ رہ سکیں کہہ ہی بیٹھیں۔

"آشو تمہارا وہ سارا آرٹسٹک پنا، وہ نفاست پسندی"

"سب بھول گئی دیدی۔"

وہ جلدی جلدی سرف گھولتے ہوئے بولی۔

"مگر آشا اتنی جلدی۔"

"جلدی کہاں دیدی پورے تین سال میں اتنی سی بات سمجھ میں آئی ہے کہ زندگی بس شوہر اور بچوں کے لئے ہوتی ہے۔"

روپا جانے کس سوچ میں گم اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ وہ دیدی سویٹ پریشان نہ ہوں پلیز۔" وہ دھوئے ہوئے کپڑے الگنی پہ پھیلاتی رہی۔

"سوچتی ہوں آشا، یہ ہم لڑکیاں کتنی جلدی خود کو ایڈجسٹ کر لیتی ہیں۔"

"نباہ جو کرنا ہوتا ہے دیدی۔" وہ حسب عادت مسکرا پڑی

روپا اور آنند کے جانے کے بعد وہ تھوڑا سا اداس ہوئی پھر اپنی روزمرہ زندگی میں بے تحاشہ مصروف ہو گئی۔

"آشا، پرسوں ہی میرا دوست اُتم ہمارے ساتھ والے بنگلے میں شفٹ ہو رہا ہے۔ اس کے یہاں یاد سے چلنا۔"

"او کے سر۔" اس نے لاج کو سویٹر پہناتے ہوئے کہا۔ اور اس تاریخی سی شام کو وہ راجیش کے سنگ اُتم کے گھر چلی آئی۔

"نمستے، تشریف لایئے۔"

"بیگم اُتم کو وہ خوبصورت سی آشا پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ جیسے بندیا بہت سج رہی تھی۔

اُتم اور راج تھوڑی دیر لان کے پاس بیٹھے پھر گاڑی لیکر کہیں چلے گئے۔ ان کا ڈرائنگ روم انتہائی نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ ہر چیز اتنی نازک، اتنی حسین تھی کہ مکینوں کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت لگ رہی تھی۔ آشا بار بار لاج کو پکڑنے کے لئے اٹھ جاتی تھی۔

"بچی کو روکئے نہیں ہم تو ایسی آوازوں کے لئے ترستے ہیں۔" "آپ کے بچے نہیں ہیں؟"

مسز اُتم دکھ سے مسکرائیں۔ آشا نے مستفسرانہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ جیسے اس کا مطلب سمجھ گئیں۔

"میرے شوہر بہت آرٹسٹک مائنڈڈ ہیں۔"

بیگم اُتم کی آنکھوں میں آنسو آ چلے تھے۔ آشا نے بڑی ہمدردی سے انہیں دیکھا۔

"وہ کہتے ہیں بچے اس گھر کی نفاست اور سکون کو اسپائل کر دیں گے۔"

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" "شاعری"

"بہت خوب"

آشا داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

مسز اُتم کی لائف کتنی بے رنگ کتنی پھیکی تھی۔ آشا کو دکھ سا ہوا۔ مسز اُتم لاج کو بہت پیار کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ خالص گھریلو قسم کے موضوعات پر بحث کر رہی تھیں جس میں سرفہرست مہنگائی کا مسئلہ تھا۔ آشا تو واقعی مہنگائی کے ہاتھوں سخت پریشان تھی جبکہ مسز اُتم نسبتاً پرسکون لگ رہی تھیں۔ "آپ دونوں اتنے پیسے کا کیا کرتے ہیں؟"

باتوں باتوں میں آشا پوچھ بیٹھی۔

"وہ سگار کے بہت شوقین ہیں اور میں پینٹنگ کا سامان خرید لاتی ہوں۔ بس یہی ہماری مصروفیات اور مشاغل ہیں۔"

مسز اُتم ایک بار پھر اداس ہو گئیں۔

"اُتم صاحب کو بچے اچھے نہیں لگتے؟"

"جب ہماری شادی ہوئی تو ہم نے اپنی زندگی میں جدت پیدا کرنا چاہی۔ دوسرے عام لوگوں کی روش سے ہٹ کر سوچا۔ معاشرے میں منفرد رہنا چاہا اور زندگی کے کئی قیمتی سال دوستوں کی طرح گزار دیئے یوں اس انمول نعمت سے محروم رہ گئے۔"

مسز اُتم نے بڑے پیار سے لاج کے ریشمی بالوں کو چھوا۔

"شاعری اور پینٹنگ کے علاوہ آپ دونوں کیا کرتے ہیں؟"

"صدارت۔"

آشا کچھ سمجھی نہیں تو وہ ہنس پڑیں۔

میرے شوہر بہت مشہور و معروف شاعر ہیں میں ایک جانی پہچانی مصورہ۔ بس مختلف تقاریب میں لوگ مہمان خصوصی کے طور پہ انوائٹ کرتے رہتے ہیں، لیکن اب میرا جی کچھ ہٹ سا گیا ہے۔ اس روٹین لائف سے سخت اکتا گئی ہوں میں۔"

وہ دونوں ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ راجیش اور اُتم واپس آ گئے۔ گھر آ کے بھی آشا مسز اُتم کی بے رنگ و بو زندگی

کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ کتنی تصویروں میں رنگ بھرتی ہیں پر اپنا جیون کتنا بے رنگ، کتنا پھیکا ہے ناراج؟" اس نے راج کو تائید طلب نظروں سے دیکھا مگر وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ زندگی کے وہی مخصوص شب و روز تھے اور آشا تھی۔ ہاں کبھی کبھی مسز اتم کی آمد سے وہ کچھ بہل تو جاتی مگر ان کے جانے کے بعد اداسی غالب آجاتی۔

اس شام وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر کھڑی لاج کو آئس کریم دلوا رہی تھی کہ کسی نے اسے دھیرے سے چھولیا۔ وہ چونک کر پلٹی تو کرن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ہائے کرن تم!"

"آف کورس۔" کرن ہنستے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

"آشا۔ ان سے ملو میرے شوہر وقار علی۔"

آشا نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کرن گھر چلو نا۔"

"پھر کبھی سہی۔"

"اچھا میرا ایڈریس لے لو۔ کل کسی وقت فرصت سے چلی آنا۔"

"اوکے۔"

دوسرے دن کرن آئی تو وہ لاج کو تیار کر رہی تھی۔ اس کی میلی فراک بدل رہی تھی۔

"ہیلو آشا۔"

"ہیلو کرن۔"

وہ کرن کے گلے لگ گئی۔ کرن تنہا آئی تھی اور اس کے بیڈ روم میں جا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

"پورے چار سال بعد تم سے ملی ہوں۔" کرن نے انگلیوں پہ گن کے حساب لگایا۔

"واقعی کرن ہمیں ملے ہوئے بہت مدت ہو گئی۔ اچھا ایک بات بتاؤ تمہیں یہ سب کیسا لگا؟ آئی مین شوہر، بچے، گھر داری۔۔۔؟"

"شروع میں ذرا مشکل لگا تھا۔"

"گڈ۔ گویا کہ جناب کا وہ آرٹسٹک مائنڈڈ کہلوانے کا خبط جاتا رہا۔" کرن نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

"ہاں کرن سوچتی ہوں۔ وہ سب رنگ جھوٹے تھے۔ پھیکے تھے۔ اصل رنگ تو یہی ہیں جو جیون کو رنگین بناتے ہیں۔ ہم لوگ اپنی ذات کے گرد جانے کیسی کیسی مضبوط چٹانیں کھڑی کیئے رہتے ہیں۔ جو اچانک ہی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔"

"واہ مزا آگیا تو واقعی آپ سب کچھ چھوڑ چکی ہیں۔ حتیٰ کہ کتابوں اور پھولوں کا جنون۔"

"سب چلا گیا کرن میرے بچے میرے پھول ہیں۔ میری کتابیں میری پتی ہیں۔"

"تم جیسی لڑکی بھی ایسی باتیں کرے گی آشا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"ہم سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ کرن جو پتنی بننے کے بعد صرف پتنی رہ جاتی ہیں۔ ماں بن جاتی ہیں۔ بے جان چیزیں تخلیق کرنے کے بجائے ہم زندہ چیزوں کی خالق ہوتی ہیں۔"

"ونڈرفل۔ اے گریٹ چینج۔ کرن اسے حیرت سے گھور رہی تھی۔ اچھا یہ بتاؤ راج بھائی کیسے ہیں؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔"

"کوئی ذہنی ہم آہنگی جیسی چیز بھی پائی جاتی ہے یا۔۔۔"

"ارے کرن جی۔ تم تو میرا پورا پورا انٹرویو لینے بیٹھ گئیں۔ پہلے چائے تو پی لو۔"

"پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔"

"بتایا نا وہ ایسے نہیں تھے جیسی میں ہوں۔ بس سیدھے سادے سے انسان ہیں۔ شک نہیں کرتے۔ بیجا پابندیاں نہیں لگاتے۔ ساری تنخواہ لا کے میرے ہاتھ پہ رکھ دیتے ہیں۔ بس ذرا غصے کے تیز ہیں۔ مگر باقی خوبیاں اتنی ہیں کہ مجھے ان کی یہ خامی بھول جاتی ہے۔"

تبھی راجیش آگیا۔ آشا کھل اٹھی۔

"راج یہ میری دوست ہے کرن۔"

"نمسکار کرن بہن۔"

تبھی آشا راج کے کپڑے نکالنے چلی گئی۔ اور کرن وقت گزارنے کی خاطر راج سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے وقت ٹالتی رہی۔ آشا واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں پہننے کا جوڑا تھا۔ راجیش کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا تو آشا نے اس کا اتارا ہوا کوٹ اٹھا کر ہینگر میں لٹکا دیا۔ پھر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے بوٹ اٹھا کر شو ریک میں دھر دیئے۔ ٹائی اٹھائی اور جراب جو راجیش نے اتار کر کرسی پر پھینک دیئے تھے۔ انہیں بڑی محبت سے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ کرن یہ سب حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو کرن؟"

آشا بڑی خوبصورتی سے مسکرا رہی تھی۔

"یہی کہ واقعی ہم سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔" کرن نے سنجیدگی سے کہا۔

پیاسا ساحل

مہناز عرفان



جھکے جھکے اس کی کمر تختہ ہو رہی تھی ابھی ابھی اسے تمام لوگ چھوڑ کر گئے تھے لڑکیاں تو اس کے پاس سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھیں لیکن مجبوراً انہیں جانا پڑا تو شمع نے سکون کا سانس لیا۔ کمرہ خواب ناک ماحول کا عکاس تھا۔ بستر، پردے، قالین سب سرخ رنگ کے تھے۔ سرخ نائٹ بلب روشن تھا۔ وہ خود بھی تو سرخ لباس اور سرخ پھولوں سے مزین تھی۔ سرخ رنگ سے اسے وحشت ہو رہی تھی جو اس کے ارمانوں کا خون تھا۔ اس نے یہ کب چاہا تھا جو ہو گیا تھا۔ دھیرے سے دروازہ کھلا اور نوابزادہ اظفر سہرا سنبھالتے اندر آ گئے۔ وہ بے چین ہو گئی اور دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ نواب اظفر نے اس کی رُو نمائی کی۔ ایک یاقوت کی خوبصورت انگوٹھی انہوں نے نکالی۔

"آنکھوں کو تو کھولیئے تاکہ میں نور کے اس سیلاب میں ڈوب جاؤں۔"

اظفر مدہوش سے تھے لیکن وہ امنگوں سے بے نیاز سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے شمع آپ اداس ہیں۔ کیا ہم سے مل کر خوش نہیں ہیں؟"

"تمہیں کیا پتہ میں کیوں اداس ہوں۔ میری محبت مجھ سے بچھڑ گئی۔ جس کے ساتھ مستقبل کے حسین خواب دیکھے تھے، وہ بھائی بنا دیا گیا۔ دیور بھی تو بھائی ہی ہوتا ہے نا۔ اور ایسی صورت میں اسی کے سامنے رہنا تھا۔ اور میں تو اتنی بزدل ہوں کہ مر بھی نہ سکی بس اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے رہ گئی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے یہ سب سوچا لیکن وہ مسکرا دی تھی اور اس بے جان سی مسکراہٹ کو نوابزادہ اظفر اس کی خوشی سمجھے اور اتنی حسین دلہن پا کر فرطِ مسرت سے اسے گلے لگا لیا۔

ناشتے کی میز پر وہ سر درد کا بہانہ کر کے نہ گئی کہ مبادا نوابزادہ غضنفر سے سامنا نہ ہو جائے لیکن ایک نہ ایک دن تو یہ سامنا ہونا ہی تھا۔ نوابزادہ اظفر کہیں باہر گئے ہوئے تھے نواب بیگم اپنے کمرے میں تھیں۔ گھر میں وہ تنہا تھی تو وہ پائیں باغ میں نکل آئی۔ خوبصورت بارہ دری کے اطراف گلاب کے پودے ہوا کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ حوض میں مجسمہ نما فوارے سے گرتا ہوا پانی عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ کوئل کی کوکو نے ماحول کو افسردہ کر دیا تھا۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے چھپرکھٹ پر بیٹھ گئی۔ یہاں وہ پہلے ہی بہت مرتبہ آ چکی تھی۔ حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے حسین و خوبصورت باتیں بھی کی تھیں۔ تب وہ سوچتی تھی کہ کاش یہ جنت جہاں سب کچھ میسر ہے میری بن سکے۔ دعا قبول ہو گئی تھی لیکن قبولیت کا یہ انداز بہت بھیانک تھا۔ اس کا ہمسفر بدل گیا تھا۔ اب جو وہ ساتھی نہ تھا تو یہ جنت جہنم سے بھی بدتر تھی۔ ہلکی سی آہٹ پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چونک پڑی۔ نوابزادہ غضنفر کو کھڑے پایا۔ بلیک سوٹ ان کی سرخ و سفید رنگت پر بہت بج رہا تھا۔ آنکھوں میں اداسی، چہرے پر رنج و غم کی پرچھائیاں لیکن ہونٹوں پر زخمی سی طنزیہ مسکراہٹ۔ شمع گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے آنکھیں ملانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ کچھ ساعتیں یونہی گزر گئیں۔

"ہونہہ بے وفا مکار۔ تم نے اس جنت کو اپنانے کی خواہش کی تھی اور وہ تمہیں مل بھی گئی۔"

رنج و غم کے مارے اس کے ہونٹوں سے بات نہ نکلی۔

"کیا مزا ہے کہ جب بھیا حضور کو یہ سب پتہ چلے کہ ان کی بیگم ہمارے ساتھ عشق لڑا چکی ہیں۔"

وہ بے دردی سے بولا۔

"نہیں۔ نہیں۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کریں۔ میری بھی تو سنیں۔"

اس نے التجا کی لیکن غضنفر تو سنگ دل بنے ہوئے تھے۔

"کیوں نہیں؟ ڈرتی ہیں محترمہ کہ آپ کی ساری اصلیت پتہ چل جائے گی اور تمہیں اس خوبصورت جگہ سے نکال دیا جائے گا۔ یاد رکھو میں تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا۔ تم آستین کا سانپ ہو۔ بڑا زہریلا۔ میں اس کو ٹھکانے لگانے کا انتظام کروں گا۔"

نواب زادہ غضنفر گرجتے برستے رہے۔ لیکن وہ تو یوں گنگ تھی جیسے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔ جو اس درست ہوئے تو دیکھا غضنفر جا چکے تھے۔ وہ لٹی لٹی سی اٹھی۔ یہ جگہ جو اس کی محبت کی امین تھی جہاں غزنی نے اسے محبت کا سبق سکھایا تھا، آج وہ اسی جگہ ذلیل کر گیا تھا۔ دھمکیاں دے گیا تھا۔ اسکی یہ شادی زبردستی ہوئی تھی۔ اس نے مرنا چاہا لیکن نہ مر سکی۔ اور شادی کی آڑ لے کر اسے سرخ کفن میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اور وہ دیکھتی ہی رہ گئی حالات کی سنگینی کا اسے احساس ہو چکا تھا۔ وہ بے بس تھی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے جب وہ کبھی مجبور نہ تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی دس گیارہ سال کی تھی۔ دولتمند باپ کی اکلوتی اولاد خوبصورت کوٹھی، ڈھیروں نوکر، پیار کرنے والے ماں باپ۔ دنیا بھر کی خوشیاں اسے عزیز تھیں۔ کوئی ننھیالی رشتہ دار اس کا نہ تھا۔ ددھیال میں اس کے سگے چچا مہتاب حسن اور ایک

پھوپھی صالحہ خانم تھیں جو شادی کے بعد افریقہ میں جا بسی تھیں تین چار سال بعد وہ پاکستان آئیں تو آفتاب حسن یعنی شمع کے والد کے گھر ٹھہری تھیں۔ شمع کے چچا مہتاب حسن زیادہ تر کاروبار میں الجھے رہتے تھے۔ ان کی بیگم رابعہ بیگم نہ جانے کیوں شمع کے گھر آنا پسند نہ کرتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی چچی کے بچے جنید، نائلہ و شمائلہ ان کے گھر آجاتے تو خوب دھما چوکڑی مچتی۔ اس کی زندگی شہزادیوں کی طرح بسر ہو رہی تھی کہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ غم کی گھٹا یوں امنڈ کر چھائی کہ کچھ عرصے تک تو اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوا بادل چھٹے تو اس نے دیکھا اس کا تو سب کچھ اسی کی نذر ہو گیا۔

آفتاب حسن اپنی بیگم زرین کے ساتھ ایک دوست کے ڈنر سے واپس آ رہے تھے کہ گاڑی ویگن سے ٹکرا گئی۔ دونوں موقع پر ہلاک ہو گئے اور وہ تنہا رہ گئی۔ پھوپھی صالحہ بھائی بھاوج کی موت پر آئی تھیں اور یتیم بچی کو ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن بخلانے یہ چچی کی مامتا کہاں سے لوٹ پڑی کہ وہ اسے اپنے سے جدا کرنے پر راضی نہ ہوئیں۔ وہ اسے گلے سے لگا کر بلک بلک کر یوں روئیں کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔ لیکن اب بھلا کون جان سکتا تھا کہ مگرمچھ کے آنسو بہانے والی چچی دراصل اس بے شمار جائیداد پر نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ یوں وہ گیارہ سال کی جان مصیبتوں میں گھر گئی جس کے لئے اٹھ کر پانی پینا بھی بڑا کام تھا، اس سے گھر کے کام لئے جانے لگے۔ بچے بڑے اس پر حکم چلانے لگے۔

"شمع! میرے جوتے پالش کر دو۔"

سب سے بڑے جنید نے اسے حکم دیا۔

"شمع! میرے کپڑوں پر استری کر دو دیر ہو رہی ہے۔"

نائلہ نے بھی رعب دکھایا۔

"لیکن مجھے بھی تو دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اسکول جانا ہے۔"

شمع ان کے حکم سن کر منمنائی۔

"چلو چلو۔ بڑی آئیں اسکول جانے والی۔ کیا کرو گی پڑھ کر بننا تو تمہیں ملازمہ ہی ہے۔"

نائلہ نے اسے ڈانٹا۔

"ہاں اور ہمارے ٹکڑوں پر پڑی ہیں اور نخرے کرتی ہیں شہزادیوں جیسے۔"

جنید بولا۔ اور وہ بزدلی کی وجہ سے اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ ٹکڑوں پہ تو اس کے ہی لوگ پل رہے ہیں۔ جنید عمر میں اس سے پانچ سال بڑا تھا۔ وہ اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ تین سال چھوٹی نائلہ تھی۔ شمائلہ البتہ اس کی ہم عمر تھی۔ وہ اکثر شمع کی حمایت میں بول دیا کرتی تھی۔ جبکہ نائلہ اور جنید اس پر رعب جماتے رہتے۔

"شمو! اے شمو۔ کہاں مری ہوئی ہے؟"

چچی کا لہجہ عامیانہ اور تحکمانہ تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے سے نکل آئی۔

"شمو ذرا چائے بنا دو مہمان آئے ہیں اور ہاں رحیمن بوا چھٹی پر ہیں۔ برتن بھی دھو لینا۔"

چچی اپنا حکم صادر کر کے چلتی بنیں اور وہ جو اسکول میں سزا پا کر آئی تھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے اس کو سزا ملتی تھی۔ سو دفعہ اٹھک بیٹھک لگا کر اس کی ٹانگیں درد کر رہی تھیں۔ اگر چچی اس کو کتابیں دلوا دیتیں تو سزا نہ ملتی۔ لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ چچی نے اسے پڑھنے سے نہیں اٹھایا تھا۔ اگر ایسا کر لیتیں تو وہ تب بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ چچا بے چارے کو اپنے گھر سے سروکار ہی نہ تھا جو وہ اس کی خبر لیتے۔ اب وہ بھائی کی جائیداد اور کاروبار کے ذریعے دولت بڑھانے کی فکر میں تھے۔ شمو! میرا یہ کام کر دو۔ وہ کام کرو۔ آوازوں کی اس بازگشت میں وہ شعور کو پہنچ گئی۔ ننھی سی گڑیا اب کومل دوشیزہ بن چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کم ہی آتی تھی۔ چچی کے گھر کے ماحول نے اس کی شخصیت مسخ کر دی تھی۔ سہمی سہمی سی وہ کام کرتی رہتی۔ جنید جس کو آوارگی سے فرصت نہ تھی، اب بھی اس پر رعب جھاڑتا۔ بچپن سے جو کام کاج کا بوجھ اس پر لادا گیا تھا وہ بدستور تھا۔ رات گئے اسے فرصت ملا کرتی۔ البتہ کبھی کبھی شمائلہ اس کی مدد کر دیا کرتی۔

"شمو۔ جلدی سے گھر کی صفائی کر لو۔ آج تمہاری پھوپھی آ رہی ہیں۔"

"کب؟"

وہ خوشی سے چہکی۔

"شام پانچ بجے کی فلائٹ سے۔"

اور تب وہ پھوپھی کے آنے کی خوشی میں جلد جلد گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ پھوپھی اپنے بیٹے ریحان کے ساتھ آئی تھیں۔ اس نے ریحان کو دس سال بعد دیکھا تھا۔ پھوپھی ان کے والد کی وفات پر آئی تھیں تو ریحان ساتھ تھا۔ اس کے بعد وہ اب آیا تھا۔ صالحہ پھوپھی اسے بار بار چوم رہی تھیں۔ ان کے عزیز بھائی کی اکلوتی نشانی جو تھی۔

"ماشاء اللہ کیسی پیاری شکل نکالی ہے۔ بالکل شہزادی لگتی ہے۔" وہ لاڈ سے بولیں۔

"پھوپھی جان مجھے تو کہیں سے بھی شہزادی نہیں لگتی۔ وہ کوئی

ایسی ہوتی ہیں ؟"
نائلہ بدتمیزی سے بولی۔
"ارے ریحان بیٹے، بات کرو نا۔ دیکھو تو یہ شرمیلی سی گڑیا بھی کتنی خاموش ہے۔ بچپن میں کتنا لڑا کرتی تھی۔"
ریحان نے اس کی جانب دیکھا تو وہ ہولے سے مسکرادی پھوپی کی شفیق آغوش میں اسے بڑا سکون محسوس ہوتا تھا۔ ریحان کی شرارتیں اسے ہنسنے پر مجبور کر دیتیں۔ لیکن وہ عام طور پر خاموش ہی رہتی کیونکہ کم گوئی اس کی عادت میں رچ بس گئی تھی۔
"شمع !"
اک پیار بھری آواز سن کر وہ پلٹی۔ ریحان گلاب کا پھول لئے کھڑا تھا۔
"کیا بات ہے بڑی چپ ہو۔ میں نے تمہیں ہنستے مسکراتے بہت کم دیکھا ہے۔ بھئی شمائلہ نائلہ بھی تو آخر لڑکیاں ہیں کیسی زندہ دل۔ اک تم ہو ہر وقت مفکروں کی طرح سوچتی رہتی ہو۔"
وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔
"ریحان بھائی۔ یہ تو اپنی اپنی عادت ہے۔ کوئی کم گو ہے کوئی باتونی۔ کوئی زندہ دل کوئی مردہ دل۔ کوئی خوش نصیب تو کوئی بدنصیب۔"
وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی
"کیوں۔ کیا ہوا تمہاری خوش نصیبی کو۔ بھئی سنو اتنی پیاری چچی ہیں جو تمہیں اپنی سگی بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں۔ ورنہ آج کل کون کس کا خیال کرتا ہے ؟"
تب ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔
ہونہہ۔ تمہیں کیا پتہ ریحان بھائی کہ چچی سگی بیٹیوں کی طرح رکھتی ہیں یا ملازمہ کی طرح۔ ہاں مگر آج کل تو ان کی مہربانیاں عام ہیں بڑے پیار سے مجھے بیٹی بیٹی کہہ کر آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ پھوپھی جان بھی خوش ہیں کہ وہ آرام سے رہتی ہے —— چلو پھوپی کا آنا مبارک تو ہوا۔ اتنے ڈھیر کاموں سے نجات تو ملی۔ اسے سوچتے ہوئے دیکھ کر ریحان بول پڑے۔
"اب کیا سوچنے لگیں ؟"
"آں۔ کچھ نہیں۔"
اور ریحان اس کی اس ادا پر مسکرا دیئے۔ وہ اس بھولی سی لڑکی کو پسند کرنے لگے تھے۔ صالحہ پھوپی اور رابعہ چچی اک دن بیٹھی تھیں کہ پھوپی نے کہا
بھابھی جان میں اس دفعہ اک خاص مقصد سے آئی ہوں۔"
"کہیئے کہیئے۔"
چچی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔
"میں سوچ کر آئی تھی کہ میں شمع کو آپ سے مانگ لوں گی۔"
پھوپی خوش دلی سے بولیں۔
"آپا جان شمع آپ کی ہی ہے۔ مگر یہ وہاں جائے گی کیسے ؛ یہاں اس کی سہیلیاں ہیں اور ابھی پڑھ رہی ہے۔ یہاں اس کا دل لگا ہوا ہے۔"
"بھئی میں ایسے ہی لے جانے کو نہیں کہہ رہی۔ میں چاہتی ہوں اپنے ریحان کی دلہن بنا کر میں شمع کو لے کر جاؤں۔"
پھوپی نے اب صاف صاف بات کی۔ یہ سن کر چچی ایک لمحے کو گھبرا سی گئیں۔ پھر جلدی سے بولیں
"آپا جان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؛ میں نے تو بہت پہلے سے سوچا ہوا تھا کہ اپنی یتیم بھتیجی کو اپنی بہو بناؤں گی۔ اور۔ اور پھر وہ جنید کو پسند بھی تو بہت کرتی ہے نا۔"
چچی نے جھوٹ بولا۔
"اچھا تو کیا وہ جنید کو پسند کرتی ہے ؟"
پھوپی نے پریشانی سے پوچھا۔
"ہاں ہاں آپا جان۔ بچپن سے ساتھ پلے بڑھے بھی تو ہیں نا۔ محبت تو ہو ہی جاتی ہے۔"
چچی ہنستے ہوئے بولیں۔
"میں تو شادی بھی کر دیتی۔ مگر پھر سوچتی ہوں جوان لڑکیاں ہیں پہلے ان کا بھی فرض پورا ہو جائے شمع تو گھر کی ہی ہے۔"
چچی صالحہ نے اپنے مطلب کی بات کی۔ "آپا جان رشتے تو ان کے بہت آرہے ہیں لیکن میں سوچتی ہوں کوئی خاندان کا لڑکا ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔"
رابعہ بیگم کسی سوچ میں تھیں۔ کچھ دیر بعد بولیں۔
"میری خواہش تھی شمع میرے پاس رہے میری بہو بن کر لیکن وہ جنید کو پسند کرتی ہے تو خیر شمائلہ اور نائلہ بھی میرا اپنا خون ہیں اس لئے میں اکیلی واپس نہیں جاؤں گی۔ شمائلہ یا نائلہ میرے ساتھ ہوں گی۔ اس کا فیصلہ میں ریحان سے پوچھ کر کروں گی۔"
یہ سن کر چچی کی تو گویا دل کی کلی کھل گئی۔ وہ خدا سے یہی چاہتی تھیں۔ ریحان اچھا تھا ہر لحاظ سے۔ شمع کو اس بات کا پتہ چلا تو بہت غصہ آیا۔ جنید تو اسے منہ ہی نہ لگاتا تھا جبکہ چچی نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ وہ جنید کو پسند کرتی ہے۔ اک من تھی کہ پھوپی کو بتا دے۔ لیکن اب پھوپی نے نائلہ کو پسند کر لیا تھا اور

اسے کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ان سے بات کرے۔ ریحان کو بھی افسوس ہوا تھا کہ وہ جنید کو پسند کرتی ہے۔ اک دن موقع پاکر پوچھ بیٹھے وہ عجیب کشمکش میں تھی کیا کہے۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بتا دے گی۔ یہ سب غلط ہے تب ہی چچی آ نکلیں انہیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور چچی نے کچھ سمجھتے ہوئے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ پھر اس کی نگرانی ہونے لگی اور ریحان سے بات کرنے کا اسے موقع نہ مل سکا۔ پھوپی نے جب نائلہ کو بہو بنانے کی اس سے بات کی تو وہ اس وقت بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ جس سے پھوپی نے یہ سمجھا کہ وہ واقعی جنید کو پسند کرتی ہوگی اور انھوں نے ریحان کو بھی مطمئن کر دیا۔ لہٰذا ریحان نے فرمانبرداری سے ماں کی خواہش پر نائلہ کا ساتھ قبول کر لیا اور یوں وہ یعنی نائلہ ریحان کی دلہن بن کر افریقہ سدھار گئیں۔ پھوپی کے جانے کے بعد چچی رابعہ کا سلوک پہلا جیسا ہی ہو گیا۔ البتہ اب حکم چلانے والوں میں سے ایک کی کمی ہو گئی تھی۔ آج کل وہ ایم اے پریویس میں تھیں۔ دونوں ساتھ یونیورسٹی جاتیں۔ واپس آکر حسب معمول شمع کام میں لگ جاتی۔ کبھی کبھار شمائلہ اس کا ساتھ دے دیتی۔ چچی رابعہ آج کل زیادہ وقت پارٹی اٹینڈ کرنے میں گزارتی تھیں۔ اکثر گھر پر بھی گیدرنگ ہوتی۔ جس میں شمع کو شامل ہونے کی فرصت ہی نہ ہوتی۔ اسے ڈھیر سارے کاموں پر لگا دیا جاتا۔ پھر چچی نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ میری بھتیجی بڑی کم گو ہے۔ وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ اگرچہ کچھ طبیعت تھی ہی اس کی ایسی۔ لیکن اب ایسی بھی مردہ دل نہ تھی جو چچی نے مشہور کر رکھا تھا۔

"شمو آج ذرا تمہیں کام کرنا پڑے گا کیونکہ شام میں نواب مظفر بیگم آ رہی ہیں۔ بہت بڑے لوگ ہیں۔ آکاش محل اتنا بڑا تو ان کا محل ہے۔ ان کا شایان شان استقبال ہونا چاہیے۔ سن لیا تم نے۔"

"جی چچی جان۔"

اور پھر وہ صفائی میں لگ گئی۔ پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کی گئی۔ ڈرائنگ روم کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ کشن بدلے۔ ڈیکوریشن پلیسز میں اضافہ کیا۔ غرض ڈرائنگ روم کو ان کے شایان شان سجا دیا گیا۔

نواب مظفر بیگم جن کو بیگم نواب کہا جاتا تھا دو خوبصورت برخورداروں کی ماں تھیں۔ بے حد امیر۔ بڑے نواب زادہ اظفر علی اور چھوٹے غضنفر علی تھے۔ بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ انہیں اپنی بیٹیاں دینا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دعوتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ نواب بیگم کے ہاں بھی ہر ماہ ایک پرشکوہ تقریب ہوا کرتی جس میں شہر کی بڑی بڑی بیگمات اظفر و غضنفر کے دوست شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ دراصل خاندانی نواب نہ تھے۔ اپنے کسی کارنامے کی بدولت مظفر علی نے انگریزوں سے جاگیر پائی تھی۔ پاکستان بننے سے ایک سال پہلے نواب مظفر کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اظفر دو سال کے تھے۔ جبکہ پانچ ماہ بعد غضنفر پیدا ہوئے۔ اب یہ لوگ نواب نہ رہے تھے۔ تاہم بے تحاشا دولت تھی۔ شہر کے آخر میں ایک شاندار محل نما عمارت آکاش محل ان کا مسکن تھی۔ یہاں پر نواب بیگم کی حکمرانی تھی۔ لیکن آزاد خیال ہونے کے باوجود وہ بہت پروقار خاتون تھیں۔ کسی پارٹی میں چچی رابعہ کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ نواب بیگم کو اپنے گھر مدعو کر بیٹھیں۔ اور آج وہ آ رہی تھیں۔

"شمع۔ اے شمع۔ تم اب تک تیار نہیں ہوئیں۔ ارے نواب بیگم اب آنے ہی والی ہوں گی۔"

شمائلہ پرفیوم اسپرے کرتی ہوئی بولی۔

"مجھے ابھی آخری ڈش تیار کرنا ہے، اس لئے میں تو نہیں آ سکتی۔"

شمع نے حسرت سے کہا۔ اسے بھی نواب بیگم کو دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر چچی کی طرف سے وہ مجبور تھی۔ کار کے ہارن کی آواز پر شمائلہ تیزی سے باہر دوڑی اور شمع باورچی خانے کی طرف چل دی۔

"بھئی کھانا تو بڑا لذیذ ہے۔ ملازموں کے ہاتھ کا تو نہیں لگتا کس نے پکایا ہے؟"

نواب بیگم نے پوچھا۔

"ہماری کزن نے پکایا ہے۔"

شمائلہ کے منہ سے نکلا تو رابعہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ارے بھئی تو وہ ہیں کہاں۔ ہمیں بھی تو ان سے ملوائیے۔ دیکھیں تو اس سگھڑ بچی کو۔"

رابعہ بیگم پہلے تو سٹپٹائیں پھر بولیں حسب عادت۔

"ہماری بچی تنہائی پسند ہے۔ کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ گھریلو کاموں کی شوقین ہے۔ شوق پورا کرتی رہتی ہے۔"

"پھر تو ہم ان سے ضرور ملیں گے۔ چلیے ہم انہی کے پاس چلتے ہیں۔"

اور جب نواب بیگم کو بضد دیکھا تو رابعہ بیگم کو مجبوراً اسے وہیں بلانا پڑا۔ اس نے بڑی شائستگی سے نواب بیگم کو آداب کیا اور انھوں نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"بیٹی۔ آپ نے تو بڑا لذیذ کھانا تیار کیا ہے۔ اتنا کہ ہم آپ سے ملنے کی خواہش کر بیٹھے۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"شمع آفتاب حسن۔"

"دیکھیے ہمیں آپ بہت پسند آئی ہیں۔ پرسوں ہمارے یہاں

ڈنر ہے۔ آئیں گی نا آپ؟ کیوں بھئی رابعہ بیگم۔ لا رہی ہیں نا اپنی گڑیا سی بھتیجی کو؟"

اور رابعہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔ نواب بیگم شمائلہ کو یکسر نظر انداز کر رہی تھیں جبکہ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن شمع اس سادگی میں بھی کہ مسلے مسلے سے کپڑے تھے۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز اچھی لگ رہی تھی تو اس میں نواب بیگم کا کیا قصور۔ آکاش محل پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ اس خوبصورت عمارت کی شان تقریب کے دوران دوبالا ہو جاتی تھی۔ خصوصاً لان جہاں ضیافت کا اہتمام ہوتا تھا۔ وسیع و عریض لان کے بیک سائڈ پر سرو و صنوبر کے ساتھ پام کی قطاریں تھیں درمیان میں ایک وسیع تالاب تھا جس میں بہت سے مجسمہ نما فوارے لگے ہوئے تھے۔ ان کے کھلے منہ سے گرتا پانی عجیب سماں پیدا کرتا تھا۔ حوض کے ساتھ سنگ مرمر کی منڈیر تھی اور چاروں کونوں پر سنگ سفید کی تخت نما کرسیاں۔ حوض کے نیلے نیلے پانی میں کنول کے خوب صورت پھول تیرا کرتے۔ حوض کے اطراف خوبصورت پھلواری تھی۔ اس کے ایک طرف بارہ دری تھی جس کے گرد سرخ گلاب کے پودے لہلہاتے تھے۔ پیڑوں کے جھنڈ میں رنگ برنگی بتیوں کا چراغاں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مرمریں مرکری بلب روشن ہوتے۔ حوض کے اطراف لوگ کرسیوں پر گروہ کی صورت میں ہوتے۔ چودھویں رات کو سنگ سفید سے بنی یہ عمارت جنت کا سا سماں پیش کرتی۔ مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ نواب بیگم کے دونوں صاحبزادے استقبال کو موجود تھے۔ رنگین آنچل لہراتے پھر رہے تھے۔ پرفیوم کی بھینی بھینی مہک ہلکے ہلکے سروں میں بجتا آرکسٹرا مدہم مدہم قہقہے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نواب زادہ اظفر چونکہ بیمار رہتے تھے اس لئے وہ ایک جانب لیٹے۔ دوستوں میں گھرے بیٹھے تھے البتہ نوابزادہ غضنفر گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ ان کے دوست بھی بے تحاشا تھے۔ کچھ دیر وہ ایک گروہ کے پاس بیٹھتے اور پھر دوسری جانب چلے جاتے۔ اپنے دوستوں میں پرنس پکارے جاتے تھے۔ تب ہی وہ اپنے گٹار کو لینے بارہ دری میں جا پہنچے۔ سنگ مرمر کی بنی بارہ دری کے محراب اور دروازوں پر باریک پردے پڑے تھے۔ باہر سے روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ پورے فرش پر ہلکے رنگ کا قالین بچھا تھا۔ باہر سے جھانکتے سرخ گلاب کے پھول بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ پرفیوم کی سبک سبک مہک نے ماحول کو بہت خوشگوار بنایا ہوا تھا۔

تب ہی ان کی نظر صندلی لکڑی کے کشمیری کام والے چھپر کھٹ پر پڑی جس کے چاروں طرف موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں اک مرمریں جسم اس پر دراز تھا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس ہاتھوں اور گلے میں موتیا کی کلیوں کے زیور، کشادہ پیشانی، سفید و گلابی رنگت ستواں ناک۔ گلاب کی پنکھڑی کے مانند ہونٹ، بند آنکھیں جن کی لمبی لمبی پلکوں کی جھالریں آنکھوں پر دراز تھیں۔ اف کیا یہ انسان ہے۔ غضنفر حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے کہ نواب بیگم اندر داخل ہوئیں۔

"امی حضور، یہ کون ہیں؟"

"یہ ہماری نئی مہمان ہیں۔ آج پہلی مرتبہ آئی ہیں۔ یتیم بچی ہے۔ اپنی چچی رابعہ بیگم کے پاس رہتی ہے۔ ہمیں بہت پسند ہے" غضنفر نے سوچا پسند تو خیر ہمیں بھی بہت آئی ہے "لیکن اتنے لوگوں میں گھبرا گئی۔ ہم اسے ادھر لے آئے تا کہ آرام کرے تنہائی پسند ہے نا۔" نواب بیگم پیار سے بتا رہی تھیں۔

"لیجئے شاید وہ جاگ رہی ہیں۔"

اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور ہیروں کی کنی کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ نواب بیگم کے ہمراہ ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"لیٹی رہو بیٹی۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ آہستگی سے بولی اور غضنفر علی کو محسوس ہوا گویا مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ پھر نواب بیگم نے غضنفر کا تعارف کرایا اور غضنفر علی تو محسوس کر رہے تھے کہ جس کی انہیں تلاش تھی وہ گوہر آبدار ہاتھ آ گیا۔ وہ اس دن موقع موقع سے اس سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن وہ ہوں ہاں ہی میں جواب دیتی رہی۔ اگلی ضیافت کا غضنفر علی کو شدت سے انتظار تھا۔ کیونکہ شمع سے ملنے کی یہی ایک راہ تھی۔ یوں تو پرنس کی بے شمار دوست لڑکیاں تھیں لیکن ان کی اداؤں کے جادو اس پر نہ چلے تھے۔ لیکن ایک سیدھی سادی لڑکی نے ان پہ جادو کر دیا تھا۔ اس نے چچی رابعہ کا بھی تعارف حاصل کیا تھا۔ جو بڑھ چڑھ کر شمائلہ کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ جو سرخ بنارسی ساڑھی میں سلیولیس بلاؤز زیب تن کئے ہوئے تھی۔ چہرہ پر بے تحاشا میک اپ تھا۔ اور پرنس ان دونوں کا موازنہ کئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج پھر تقریب تھی۔ آکاش محل میں لوگ آ چکے تھے۔ وہ بھی آئی تھی بلیو کلر کی سنہرے بارڈر والی ساڑھی کے ساتھ اس نے بالوں میں گیندے کا پھول لگایا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں میں پھولوں کا گجرا تھا۔

آج بھی وہ سب سے منفرد لگ رہی تھی سراپا خزاں۔
"کیسی ہیں آپ؟"
غضنفر موقع ملتے ہی پوچھ بیٹھے۔
"ٹھیک ہوں۔"
اس نے افسردگی سے جواب دیا۔ تب ہی غضنفر کے کسی دوست نے پکار لیا کچھ دیر بعد وہ لوٹے تو وہ انہیں کہیں نظر نہ آئی وہ کہیں نہ ملی تو وہ بارہ دری کے پیچھے گلاب کے کنج کی طرف گئے وہ بنچ پر بیٹھی نظر آ گئی۔
"آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ میں آپ کو ہر جگہ ڈھونڈھ آیا۔"
"میرا دل گھبرا رہا تھا تو میں ادھر چلی آئی۔"
وہ بولی۔
"ہاں امی حضور نے کہا تو تھا کہ آپ زیادہ لوگوں میں گھبرا جاتی ہیں۔ لیکن آج تو آپ مجسم سوگوار نظر آ رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ آپ اتنی اداس کیوں ہیں ویسے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن کیا کیا جائے کہ آپ کی اداسی نہیں دیکھی جاتی۔"
غضنفر خود بھی افسردہ سے ہو گئے تھے۔
"بات تو کچھ بھی نہیں بس اتنی سی ہے کہ ہمیں اپنے ممی ڈیڈی یاد آ رہے ہیں جب ان کی یاد آتی ہے تو میں اسی طرح اداس ہو جاتی ہوں۔ اور پھر آج تو میرا جنم دن ہے نا اسی لئے مجھے ان کی یاد آ رہی ہے آج میرے پاس میرے والدین نہیں ہیں کتنی اکیلی ہوں۔"
آنسو موتیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔
"آج آپ کی سالگرہ ہے آپ نے بتایا ہی نہیں ورنہ ہم ضرور تحفہ خریدتے۔"
"اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہماری سالگرہ تو ہمارے والدین کی حیات میں ہوتی تھی۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"
"نہیں بھئی آپ کو سالگرہ ضرور منانی چاہیئے۔ اتنا یادگار دن ہے کہ خدا نے اس قدر پیاری صورت اس دن تخلیق کی تھی۔"
غضنفر مزاحیہ انداز میں بولے۔
"اچھا تو یہ لیں ایک خوبصورت گلاب کا پھول۔ اسے تحفہ سمجھ لیں۔ اور یہ جو تقریب آج ہے یہ آپ کے نام۔ کہیئے پسند آیا تحفہ۔"
"تحفہ تو کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو بڑا قیمتی ہوتا ہے کیونکہ خلوص سے دیا جاتا ہے نا۔"
وہ غضنفر سے پھول لیتے ہوئے بولی۔
"اور پھر یہ تو گلاب کا پھول ہے جو دوستی کی نشانی ہوتا ہے۔"
"ہاں اور محبت کا بھی۔"
غضنفر بھولپن سے بولے۔
"شمع۔ دیکھو جانے والے تو چلے جاتے ہیں۔ یہی دنیا کی رسم ہے لیکن ان کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ یہ تو ہمارا امتحان ہوتا ہے کہ جو ہماری سب سے عزیز شے بچھڑ جائے تو ہمیں غم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ جس کی تھی اس نے واپس لے لی۔ ہم کو تو کچھ عرصے کے لئے دی گئی تھی اس پر رنج و غم کیسا۔ اور پھر عظیم انسان تو وہی ہے جو اپنے غموں کو چھپائے مسکراتا رہے۔ کیا میں امید رکھوں شمع تم بھی مسکراتی رہو گی۔ اپنے لئے نہ سہی۔ دوسروں کے لئے۔"
وہ ایک دم بے تکلفی پر اتر آئے تھے۔
"کوشش کروں گی۔"
وہ نظریں جھکا کر بولی۔
"ایسے نہیں۔ عملی کام ہونا چاہیئے یعنی مسکرا کے دکھاؤ۔ اور تمہاری اس مسکراہٹ کا امین یہ خادم ہے۔"
وہ تھوڑا جھکتے ہوئے بولے۔ تب وہ مسکرا دی تھی۔ لیکن آنکھوں سے دو ستارے ٹوٹ کر ضرور گرے تھے جیسے سورج کی کرنوں کے ساتھ برستا پانی۔
"آیئے تو پھر ہر غم بھول کر خوشیاں تلاش کرتے ہیں اور اس کی ابتدا آج سے ہی ہو گی۔ آیئے لوگوں سے ملئے۔ زندگی کا سبق سیکھیے۔ زندہ دلی اپنایئے۔"
اور جب وہ ان کے دوستوں میں گھری کھڑی تھی تو انتہائی نروس ہو گئی۔ انتہائی ماڈرن چہروں پر میک اپ کے خول چڑھائے لڑکیاں اور بڑے بڑے بالوں والے لڑکے۔
"ہلو شمع کہاں تھیں آپ نظر نہیں آئیں؟"
دوشیا مٹکتے ہوئے بولی۔
"بھئی ہماری کزن زیادہ لوگوں میں گھبراتی ہیں اس لئے کسی تنہا گوشے میں بیٹھی ہوں گی۔"
شائلہ نے جانے کس انداز میں یہ جملہ کہا تھا لیکن اس پر ایک قہقہہ پڑا تھا۔
"بھئی آدم بیزار ہوں گی۔"
وہ روہانسی ہو گئی۔
"بھئی بات یہ ہے کہ ہر انسان کی طبیعت الگ الگ ہوتی ہے کسی کو تنہائی پسند ہوتی ہے کسی کو شور شرابہ۔ اور سچ پوچھو تو ہمیں بھی تنہائی پسند ہے جو مزا اس میں ہے وہ ہنگامے میں کہاں؟"
پرنس بولے۔

"لیکن پرنس آپ تو ہر وقت ہی شور ہنگامے میں رہتے ہیں۔"
دوشیا جل کر طنزیہ لہجے میں بولی
"بھئی وہ کہتے ہیں نا خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم۔ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔ تو حضور ہم آپ لوگوں کی خاطر یہ محفلیں اٹینڈ کرتے ہیں۔"
غضنفر دوشیا کی جانب جھکتے ہوئے بولے اور دوشیا نے جل کر منہ بنا لیا۔ شمع کی طرف داری بہت سی حسین صورتوں کو بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ تقریب کے اختتام پر رابعہ بیگم نے جانے کی اجازت مانگی۔
"اب کب ملاقات ہوگی؟"
پرنس اشتیاق سے بولے۔
"جب خدا نے چاہا۔"
شمع نے مسکرا کر جواب دیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی راج محل اور کبھی یونیورسٹی میں اور پرنس کبھی کبھی ان کے گھر بھی چلے آتے۔ رابعہ بھی بہت خوش ہوا کرتیں انہیں غضنفر کے روپ میں شمائلہ کے ارمان نظر آرہے تھے۔ وہ خوب بن سنور کر غضنفر کے سامنے جانے کی شمائلہ کو تاکید کرتیں۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ سو رابعہ بیگم بھی تاڑ گئی تھیں کہ پرنس شمائلہ پر نہیں شمع پر مائل نظر آتے ہیں۔ شمع انہیں راہ کا پتھر نظر آرہی تھی اور انہیں اس پتھر کو ہٹانا تھا۔
ادھر پرنس کی محبت دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن شمع آئی تو وہ اسے اپنا کمرہ دکھانے لے گئے۔ یہ کمرہ مکمل بلو تھا۔ وسط میں خوبصورت ڈبل بیڈ تھا جس پر بلو بیڈ کور تھا۔ ارد گرد بلو موتیوں کی جھالریں تھیں۔ ایک ٹیبل پر ایک خوبصورت بالوں والی حسینہ کا چہرہ تھا جس کے سر پر خوبصورت ہیٹ تھا اور آنکھوں کی جگہ دو بلب ہلکے پاور کے تھے۔ جن سے نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک سائیڈ پر شنیل کے کور والے صوفہ سیٹ تھے۔ ایک جانب کیوپڈ کا مجسمہ تھا جو گھوم رہا تھا۔ تیر کمان کے آگے ایک دل تھا جس سے وقفے وقفے سے بوندیں ٹپک رہی تھیں اور اس کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ پورے کمرے میں خوشنما پرنٹڈ قالین تھا کہ پاؤں رکھو تو ٹخنوں تک دھنس جائیں۔ دیواروں پر ہلکے کلر میں خوبصورت مناظر والے قالین لٹک رہے تھے۔ ان پر ہلکے بلو کلر کے باریک ستاروں سے جھلملاتے پردے تھے۔ کمرے کی ایک چوتھائی دیوار شیشے کی تھی اور اس پہ باریک پردے پڑے تھے۔ پس منظر میں گلاب و موتیا اور گیندے کے پھول جھانکتے ہوئے نظر

بھلے لگ رہے تھے۔ دل کو بہکانے والی پرفیوم کی بھینی بھینی مہک اور اس پر آکاش محل کا یہ پُراسرار انتہائی شاندار کمرہ۔ اس نے ایسی جگہ تو خوابوں میں بھی نہ دیکھی تھی۔ کاش میں ہمیشہ یہیں رہ جاؤں اس نے حسرت سے سوچا۔
"کہیئے پسند آیا ما بدولت کا غریب خانہ؟"
پرنس نے شرارت سے پوچھا
"او ہو تو یہ غریب خانہ ہے۔ یہ تو سخت ناشکری ہے خدا کی کہ ..."
"سوری بھئی۔ ہم نے محاورۃً کہا تھا۔ ویسے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ تمام نعمتیں عطا کیں۔" پرنس نے مولویانہ انداز میں کہا تو اسے ہنسی آگئی "لیکن بھئی ایک چیز کی کمی ہے بس۔ وہ مل جائے تو سمجھو دنیا کی ہر شے ہمیں مل گئی۔"
"وہ کونسا دُرِ نایاب ہے جس کے آپ طالب ہیں؟"
شمع نے پوچھا۔
"وہ ہے ایک خوبصورت حسین ساتھی۔"
پرنس نے بغور اس کی جانب دیکھا۔
"پھر جلدی شادی کرلیں۔ اس میں کیا مشکل ہے؟"
شمع نے بھولپن سے کہا۔
"بھئی کر تو لیں۔ لیکن ہو سکتا ہے جو ہمیں پسند ہے وہ ہم کو پسند نہ کرے۔"
پرنس بناوٹی افسردگی سے بولے۔
"ارے کیا کمی ہے آپ کے پاس جو آپ کو ناپسند کردے ذرا اشارہ تو کریں وہ خود دوڑ کر آپ کے قدموں میں آجائے گی۔"
"سچ؟ تو کیا تم ہمیں مایوس نہیں کروگی۔ ہمارے ساتھ رہنا پسند کروگی؟"
پرنس نے ایک دم کہہ دیا۔ شمع بوکھلا گئی۔
"ارے تم ہی نے تو کہا تھا کہ ہم جس کی طرف بڑھیں مایوسی نہ ہوگی۔ تو شمع ہم تمہارے طالب تھے۔ وہ دُرِ نایاب تمہیں تو ہو۔ ہم نے پہلے ہی دن تمہیں پسند کرلیا تھا بلکہ منتخب کرلیا تھا۔ ہم نے سنجیدگی سے سوچ لیا ہے کہ اب اپنا گھر آباد کردیں کیونکہ امی حضور تنہا ہیں۔ وہ بھیاکی شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن وہ بیماری کے باعث تیار نہیں۔ اب تمام تر توجہ ان کی ہماری جانب ہے۔ بولو تم مایوس نہ کروگی نا؟"
"لیکن آپ کے اور میرے درمیان جو فرق ہے وہ کبھی ختم ہو سکتا ہے؟ آپ کی امی حضور اس کو کیسے پسند کریں گی؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہمیں یقین ہے امی حضور ہماری بات نہیں ٹالیں گی۔ ویسے بھی وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہیں۔ رہی فرق کی بات۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتیں۔ آخر ہمیں کس چیز کی کمی ہے خدا کا دیا سب ہی کچھ تو ہے۔"

شمع کی رضامندی پا کر پرنس بہت خوش تھے۔ پھر وہ شمع کے لئے غزنی بن گئے۔ شمع شامی بن گئی۔ غزنی اور شامی کی ملاقاتیں ہوتی رہیں جن کا علم ابھی کسی کو نہ تھا۔ غزنی مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ ماں سے بات کریں۔ ہلکی ہلکی خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ نواب بیگم کافی عرصے بعد رابعہ بیگم کے گھر آئی تھیں۔ لان میں چاٹ کا دور چل رہا تھا۔ پاس ہی شمائلہ اور شمع بھی بیٹھی تھیں۔

"رابعہ بیگم آج ہم آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنے آئے ہیں۔"

کافی دیر باتوں کے بعد نواب بیگم نے یہ جملہ کہا تو رابعہ بیگم ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"فرمایئے۔"

وہ آگے کو جھکتے ہوئے بولیں۔

"بات یہ ہے کہ آج ہم آپ سے کچھ مانگنے آئے ہیں۔"

"جی؟"

رابعہ بیگم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

"ہم آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔"

نواب بیگم نے صاف صاف بات کی تو رابعہ بیگم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ شمائلہ کا رنگ گلنار ہو گیا تھا اور شمع کچھ بجھ سی گئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں نواب بیگم؟"

رابعہ بیگم کا تو مارے خوشی کے سانس ہی پھول گیا۔ ان سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ یہ سپنا تو وہ کب سے دیکھ رہی تھیں کہ یہ وقت آئے۔ اور وہ وقت اب آ گیا تھا۔

"بات یہ ہے کہ آپ کی بھتیجی ہمیں شروع دن سے بہت پسند آئی تھی۔ پھر ہم نے اس کی عادات و اطوار دیکھے تو وہ ہمارے دل میں اترتی چلی گئی۔ ہم اسے بہت پسند کرنے لگے۔"

اور کچھ دیر پہلے ملنے والی بے تحاشا خوشی جو سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی پل کی پل میں یوں غائب ہوئی کہ رابعہ بیگم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہولے ہولے لرزنے لگیں۔ انہیں اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ شمائلہ کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چل دی۔ اس کے پیچھے شمع بھی چل دی۔

"ہاں تو رابعہ بیگم آپ کا کیا خیال ہے؟"

کچھ توقف کے بعد نواب بیگم بولیں۔ رابعہ بیگم شش و پنج میں تھیں۔ نواب بیگم ان سے رشتہ جوڑ رہی تھیں یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ لیکن شمع کے ساتھ، دوسری صورت میں نواب بیگم کو اپنے سے ناخوش کرنا تھا۔ وہ یہ بھی نہ چاہتی تھیں۔ اور پرنس کو انہوں نے ہمیشہ خیالوں میں شمائلہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ شمع کو مل جائے۔ کچھ دیر بعد بولیں

"صاحبزادے سے آپ نے معلوم کر لیا ہے؟"

"غضنفر ہماری ہر بات مانتے ہیں۔ وہ ہماری پسند کو اپنی پسند سمجھیں گے۔"

"لیکن آپ اپنے بڑے صاحبزادے کی شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

رابعہ بیگم نے چال چلی۔

"بات یہ ہے کہ وہ بیمار رہتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ ان کی بیماری پر خرچ ہو رہا ہے لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوتے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شاید شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں۔ لیکن صاحبزادے شادی پر رضامند نہیں ہوتے۔"

نواب بیگم افسردگی سے بولیں۔

"نواب بیگم آپ ان سے بات کر کے تو دیکھئے شاید مان جائیں میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد ضرور صحت مند ہو جائیں گے۔ اور بات یہ ہے کہ یتیم بچی ہے آپ کو تو پتہ ہی ہے کتنی کم گو ہے۔ سنجیدہ مزاج اور اپنے جیسے لوگوں کو پسند کرتی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ وہ خوش رہے۔ دیکھئے نا نواب بیگم اگر دونوں یعنی شوہر اور بیوی کے مزاج ایک جیسے ہوں تو ان کی زندگی اچھی گزرتی ہے۔ اگر مختلف ہوں تو پھر کچھ نہ کچھ بات ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں تو شمع کے معیار کا شوہر دیکھوں گی۔ کیوں کہ غضنفر میاں تو ماشاء اللہ بہت شوخ و شریر ہیں۔ کہیں وہ شمع کی کم گوئی و سنجیدگی سے اداس ہو جائیں۔ جلد وہ اکتا جائیں اس لئے اگر آپ مناسب سمجھیں تو اظفر میاں کے لئے بات ہو سکتی ہے کیونکہ شمع اور وہ ایک سے ہی مزاج کے ہیں۔ رہی صحت کی خرابی تو ڈاکٹروں کا خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی کے بعد ضرور تندرست ہو جائیں گے۔"

رابعہ بیگم اپنا جادو جگا رہی تھیں اور نواب بیگم کے دل میں اظفر میاں کی شادی کے خوابیدہ ارمان پھر سے بیدار ہونے لگے اور جب وہ رابعہ بیگم کے پاس سے اٹھیں تو اظفر میاں کی شادی کا پکا ارادہ کر چکی تھیں اور ان کو اس خوشی کی اتنی جلدی تھی کہ اسی دن انہوں نے اظفر علی سے بات کر لی۔ پہلے تو وہ

حسب معمول انکار کرتے رہے لیکن نواب بیگم کے دلائل، ان کے ممتا بھرے آنسو اور پھر شمع کا نام سن کر وہ انکار نہ کر سکے۔ شمع نے ان کے دل میں بھی جگہ پالی تھی اور اب جبکہ خود اس کے گھر والے اور بقول نواب بیگم کے شمع بھی ان کو پسند کرتی تھی تو وہ کیسے انکار کر سکتے تھے۔ اسی دوران غضنفر میاں تشریف لائے تو ماں کی بات سن کر سکتے میں رہ گئے۔ ایک نظر انہوں نے اظفر میاں کی طرف دیکھا جن کے چہرے پہ خوشی کے آثار تھے۔ بیمار بھائی سے انہیں محبت تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ آج کل میں تو وہ امی حضور سے شمع کو اپنا بنانے کی بات کرنے والے تھے لیکن دیر زیادہ ہو چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل گیا۔ ایک طرف شمع تھی دوسری طرف بیمار بھائی کی محبت اور پھر جب امی حضور نے بتایا کہ شمع اظفر میں دلچسپی رکھتی ہے تو وہ حیران ہوئے بنا نہ رہ سکے محبت تو وہ غزنی سے کرتی تھی۔ پھر اظفر میں کس قسم کی دلچسپی۔ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کیا کریں۔ اب انہیں کیا پتہ کہ یہ بات تو رابعہ بیگم نے اپنی طرف سے نواب بیگم کو بتائی تھی کہ وہ اظفر میں دلچسپی لیتی ہے۔ انہوں نے شمع سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ادھر شمع کو جب پتہ چلا کہ اس کی زندگی کا ساتھی غزنی نہیں اظفر ہے تو وہ بھی ششدر رہ گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ لیکن رابعہ بیگم نے سب کچھ ممکن بنا دیا۔ اس پر آنے جانے میں پابندی لگ گئی۔ یوں ایک ہفتے کے اندر اس کی منگنی ہو گئی۔ آئندہ ماہ شادی کا پروگرام تھا اور اس ایک ماہ میں شمع روز مر کر جیتی رہی۔ اس نے مرنا چاہا لیکن مر نہ سکی۔ غزنی سے اس کی ملاقات بھی نہ ہو سکی تھی کہ اس سے پوچھ لیتی یہ سب کیا ہے۔ آپ نے تو میرا ہمسفر خود کو بنایا پھر اپنے بھائی کو کیوں بنائے دے رہے ہیں۔ غزنی بھی اپنی آگ میں جلتے رہے۔ بارہا ان کا دل چاہا ماں اور بھائی کے آگے کہہ دیں شمع میری تمنا ہے لیکن پھر بھائی کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش رہ جاتے۔ ادھر شمع کے متعلق یہ خبر سن کر کہ وہ اظفر میں دلچسپی لیتی ہے یہ بات ان کے دل میں پھانس کی طرح چبھنے لگی اور ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ شمع کو تمام باتوں کا قصوروار سمجھنے لگے۔ وہ اب ان کی نظروں میں بے وفا تھی جس نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ محبت ان سے کی تھی اور شادی ان کے بھائی سے۔ اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ پلک جھپکتے آ گئی۔ وہ اپنے دل کو سنبھالے بھائی کی شادی کا فرض انجام دیتے رہے۔ بے حد دھوم دھام سے شادی ہوئی اور شمع دلہن بن کر آکاش محل میں آ گئی۔ چچی اس شادی سے بہت خوش تھیں۔ راہ کا پتھر ہٹ چکا تھا۔ اب شمائلہ کے لئے غزنی کا ساتھ ممکن تھا۔ شمع کو زندہ درگور کر کے وہ خوش تھیں۔

"شمع ہماری شادی کو دو ہفتے ہو چکے ہیں لیکن ہم نے محسوس کیا ہے کہ آپ بے حد اداس خاموش خاموش سی کچھ سوچا کرتی ہیں۔ آپ ہماری زندگی کی ساتھی ہیں۔ ہمیں بتائیے آپ کو کیا غم ہے؟"

نوابزادہ اظفر شمع کی خاموشی سے اکتا کر بولے۔ اس وقت وہ لان میں بیٹھے غزنی کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ کھیل سے زیادہ ان کی توجہ شمع کی جانب تھی۔ جس کو انہوں نے پاس بٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہاں سے اٹھنا چاہا لیکن اظفر نے اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیا اور وہ تقریباً آدھے گھنٹے سے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ غزنی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی جانب دیکھتے۔ لیکن اس کا انداز بدستور وہی تھا۔

"کچھ تو بولئے شمع" اب کی بار ان کا انداز خفگی لئے ہوئے تھا۔ "کیا آپ ہمارے ساتھ خوش نہیں ہیں؟"

"ہو سکتا ہے بھیا حضور یہ کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔"

غزنی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی؟"

اس نے خوفزدہ انداز میں غزنی کو دیکھا۔

"جی ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے بھئی دیکھئے نا ہمارا معاشرہ بھی تو ایسا ہی ہے۔ دو دلوں کو ملنے ہی نہیں دیتا۔ دیوار بن جاتا ہے بہرحال اگر ایسا ہوا ہے تو آپ کو اداس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اتنا حسین ساتھی ملا ہے اور پھر بے تحاشا دولتمند۔ خوش رہا کیجئے خوش۔"

وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا۔

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

شمع سہمی سہمی سی نواب اظفر سے بولی۔

"ارے آپ تو سچ مچ ایسا گھبرا گئیں جیسے یہ سب کچھ صحیح ہو۔ بھئی ہم تو مذاق کر رہے تھے۔"

غزنی قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

افریقہ سے ریحان بھائی آئے ہوئے تھے۔ وہ شمع سے ملے تو اس کی ویران زندگی میں تھوڑی سی ہماہمی ہو گئی ورنہ وہ ڈری ڈری سہمی سہمی سی رہتی۔ وہ ان سے بھائی سمجھ کر محبت سے پیش آرہی تھی۔ وہ بھی بڑا خلوص دکھا رہے تھے۔ شمع کے لئے یہ بڑا سہارا تھا۔ ان کی محبت کرنے والی شفیق پھپھو کے بیٹے۔ اس کے اپنے۔ اُدھ اس واقعے کے بعد میں غزنی نے کسی دوسرے کے ساتھ اس کی محبت

کو واضح کیا تھا۔ نواب اظفر کے دل میں خدشات نے سر اٹھایا تھا۔ اوپر سے ریحان اور شمع کا ملنا جلنا جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ عزنی کی باتیں اسے اور ہوا دیتی رہیں۔

آج اظفر کی سالگرہ تھی۔

"ارے آج تم نے اورنج لباس پہنا ہے۔ اچھا ہے لیکن وہ بلیو غرارہ سوٹ پہنتیں تو زیادہ اچھا تھا۔"

ظفری شمع کو داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ارے نہیں بھئی یہ لباس ان پر بہت جچ رہا ہے۔ ریحان بھائی بھی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ انہیں اورنج کلر بہت پسند ہے نا اسی لئے تعریف کر رہے تھے۔ ویسے مہمانوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے پسند کا کیوں بھا... بھی۔"

عزنی نے ایک وار کیا حسب معمول اور ریحان جو اس کا پھوپھی زاد تھا لیکن اس کو یہ تک معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔ اور آج عزنی کتنی دلیری سے اس پر یہ الزام لگا رہے تھے۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ظفری غصے سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اب صرف عزنی اس کے قریب تھا۔

"اوہو اتنا حسین موقع اور یہ آنسو!"

"نواب صاحب آخر آپ کو مجھ پر یہ ستم کر کے کیا مل جاتا ہے۔"

وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

"ٹوٹے ہوئے دل کو سکون۔ ویسے ڈیر آج پھر پیار سے عزنی کہو سچ کہتے ہیں بھیا حضور سے نہیں کہیں گے۔"

وہ بے غیرتی سے بولا

"نواب صاحب"

اس نے احتجاج کیا۔

"نہیں ڈیر یہ عزنی صرف عزنی۔"

اور وہ چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔ یہ عزنی کتنی تذلیل کرتا ہے ظفری کے سامنے آگ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ اسے روتا چھوڑ کر سیٹی بجاتا چلا گیا۔ تب ہی ریحان بھائی آ گئے۔

"کیا ہوا شمی؟"

وہ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولے۔ وہ ان کے کاندھے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی اور دور سے نواب زادہ اظفر علی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ غضنفر نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی اظفر اس کی طرف سے شک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ بھی اچھا ہوا پھپھی جان کی بیماری کا خط آیا اور ریحان بھائی جلد واپس چلے گئے۔ اس کا دکھ جانے بغیر۔ شمع نے نواب اظفر کی غلط فہمی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہو بھی جاتی لیکن اس کی تمام کاوشیں خاک میں مل گئیں۔ اظفر کی حالت اچانک خراب ہوئی اور تین دن کے اندر اندر وہ سب سے رخصت ہو گئے۔ بے تحاشا دولت اور ڈھیروں ڈاکٹروں کی کوششیں سب بے کار گئیں۔ نواب بیگم کا برا حال تھا لیکن اس کا تو ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ سکتے کی کیفیت میں وہ ہر ایک طرف دیکھتی رہی شادی کے تین ماہ بعد وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کو رلانے کی کوشش کی گئی اور پھر وہ رو پڑی تھی۔ روئی تو اتنا بلک بلک کر کہ دیکھنے والوں کے کلیجے شق ہو گئے۔ لیکن عزنی کا غصہ تو اب بھی کم نہ ہوا تھا۔

"شمع تو منحوس ہے۔ ہمارے بھیا کو کھا گئی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ بھیا حضور کی شادی ہی نہ ہوتی۔ تو جس کے ساتھ وابستہ رہی وہی نامراد ہوا۔ پہلے دل کی وابستگی تھی سو وہ ٹوٹ گیا۔ اس گھر میں بھیا حضور سے وابستہ ہوئی تو انہیں کھا گئی۔ اب امی حضور کے ساتھ وابستگی ہے۔ بہو کے ساتھ تو ان کا حشر بھی اچھا نہیں۔ بیٹے کے غم میں نہ جیتی ہیں نہ مرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہاں کچھ اور آفت آئے تم اپنا منحوس وجود لیکر نکل جاؤ۔"

اور یہ سب کچھ وہ اتنی بے دردی سے کہہ رہے تھے کہ انہیں مطلق احساس نہ تھا کہ کتنے نشتر اس کے سینے میں اتر رہے ہیں۔ دل لہو لہو ہو کر آنکھوں کی راہ ٹپکتا رہا۔ وہ لرز گئی۔ کہاں جائے۔ رابعہ بیگم کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ سو اس نے افریقہ پھوپی کے پاس جانے کی سوچی لیکن نواب بیگم نے اس کو کہیں جانے سے منع کر دیا کیونکہ وہ اسے اظفر کی نشانی سمجھتی تھیں۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے سو اب اظفر کی موت کا زخم کسی حد تک مندمل ہو چکا تھا۔ آکاش محل میں حالات معمول پر آ چکے تھے۔ نوابزادہ اظفر کی وفات کے بعد غضنفر نے دوشیا سے شادی کر لی تھی اور رابعہ بیگم کو اپنی کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی کہ وہ شمائلہ کو عزنی کی دلہن بنتا دیکھیں تو وہ دل برداشتہ ہو کر سعودی عرب چلی گئی تھی۔ اب وہیں رہائش تھی۔ نواب بیگم کی تمام دلچسپیاں ختم ہو گئی تھیں۔ انھوں نے عبادت و ریاضت میں خود کو وقف کر دیا تھا۔ دوشیا گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ شمع کی موجودگی کو مشکل سے برداشت کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ دن وہ آج بھی نہیں بھولی تھی جب عزنی اس کی حمایت میں دوشیا سے الجھ پڑتے تھے۔ اور آج اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ شمع سے اس کا بدلہ لے اس لئے وہ شمع کو تکلیف پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ شمع کا سامنا ان دونوں سے کم ہی ہوتا تھا لیکن عزنی اور دوشیا دونوں اسے ستانے پر تلے تھے۔ دوشیا ملازموں کی طرح اس پر حکم چلاتی۔ عزنی مزے لیتے۔ وہ نوکروں کی طرح ان

کی خدمات انجام دیتی تو وہ خوش ہوتے۔ چھن چھن کی آواز کے ساتھ خوبصورت گلدان گر کر ٹوٹ گیا اور شمع دھک سے رہ گئی۔ دوشیا نے دیکھا تو اودھم مچا ڈالا۔

ہائے اللہ میری مرحوم ممی کی نشانی یہ خوبصورت گل دان کس بے دردی سے توڑ دیا۔ غزنی دیکھا آپ نے اس نے جان بوجھ کر توڑا ہے۔"

وہ بے تحاشا دوڑتے ہوئے بولی تو غزنی چپ نہ رہ سکے۔

"اب کھڑی تماشا کیا دیکھ رہی ہو۔ سمیٹو اسے۔ ہمیں معلوم ہے تم یہ سب رقابت میں کرتی ہو تم دوشیا سے جلتی ہو۔ ممی کے گھر تو بڑے سنبھل سنبھل کے کام کرتی تھیں۔ کیا مجال جو کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے یہاں جو دل چاہتا ہے توڑ دیتی ہے۔ مفت کا مال جو سمجھا ہے۔"

اس سے تو کانچ کا گلدان ٹوٹا تھا۔ لیکن غزنی نے تو اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اب یہ کہنا بے کار ہی تھا کہ نہایت احتیاط کے باوجود بھی نہ جانے وہ کیسے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

اس کی طبیعت خراب تھی۔ لیٹی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟"

دوشی نے اسے لیٹے دیکھ کر پوچھا۔

"طبیعت خراب ہے۔"

وہ آہستگی سے بولی

"ہونہہ۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ آرام طلبی کی عادت پڑ گئی ہے پکا پکایا کھانے کو مل جاتا ہے۔ باقی سارا دن آرام ہی کرنا ہے۔ طبیعت کی خرابی تو ایک بہانہ ہے۔"

غزنی نے ایک اور تیر چلایا اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

اس کے گالوں کے گلاب خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زرد ہو گئے تھے۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں مرجھا گئی تھیں۔ جھیل جیسی آنکھیں پرانی قبر کی مانند اندر کو دھنس گئی تھیں۔ گداز جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اب کیا رہا تھا اس کے پاس۔

اچھے رشتے اس کے لئے آئے تھے۔ نواب بیگم نے بہت کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی باقی عمر نواب بیگم کے قدموں میں گزارنا چاہتی تھی اور اب نواب بیگم اپنے کمرے تک محدود ہو تیں۔ انہیں پتہ بھی نہ چلتا اس پہ روز ظلم کے کتنے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور وہ گھل گھل کر اپنے کو روگ لگا چکی تھی اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ کھانسی بھی مستقل ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے کسی پر اپنی بیماری کو ظاہر نہ کیا تھا۔ چپ چاپ جئے جا رہی تھی۔ ہر شکوے ہر غم سے بے نیاز آکاش محل میں اب بھی پارٹیاں ہوتیں ہنگامے ہوتے۔ شوخیاں شرارتیں لیکن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچتی رہتی۔ پچھلی باتیں پرانی یادیں اس دن بھی ایک ایسی ہی پارٹی تھی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ آہستہ آہستہ چلتی، بارہ دری کے عقب میں گلاب کے تختوں سے گھری بینچ پر بیٹھ گئی۔ رات زندہ تھی۔ پرفسوں ماحول تھا۔

دوشیا نے اپنے کو دلہنوں کی طرح سجایا ہوا تھا۔ وہ تتلی کے مانند قہقہے بکھیرتی اڑ رہی تھی۔ تب ہی دوشیا اور غزنی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بارہ دری کے قریب چلے آئے دوشیا کی آنکھیں خمار آلود ہو رہی تھیں۔ بہکی بہکی سانسیں تھیں۔ غزنی نے گلاب کا اک پھول توڑا اور دوشیا کے بالوں میں اٹکا دیا۔ شمع یہ سب دیکھ رہی تھی کبھی غزنی نے ایسے ہی گلاب کا پھول دیا تھا۔ تحفہ سمجھ کر اور اس کی زندہ دلی کی تلقین کی تھی جینے کی امنگیں بھری باتیں کی تھیں۔ یہ سب باتیں اس کو یاد آ رہی تھیں لیکن آج اس کا کیا حال تھا؟ درد کی ایک تیز لہر اس کی رگ و پے میں سما گئی۔ زبردست کھانسی اٹھی اور لال لال جیتا جاگتا خون گلاب کے سرخ پھولوں پر بکھر گیا پھولوں کی تازگی بڑھ گئی۔ غزنی اور دوشی نے کھانسی کی آواز سنی تو اس طرف چلے آئے۔

"محترمہ یہاں کوئی تماشا نہیں ہو رہا جو آپ یوں تاک جھانک کر لطف اندوز ہو رہی ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ شمع نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔ جانے ان نظروں میں کیا تھا۔ غزنی لرز گئے۔ زرد چہرہ اور منہ اور کپڑوں پر لگا گاڑھا گاڑھا خون بے حد سرخ۔ غزنی چونک گئے۔ دل میں رحم کا جذبہ ابھرا۔ انہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔ دوشیا نے حقارت سے منہ پر رومال رکھ لیا۔ انہیں اس کی بیماری کا پتہ ہی نہ تھا اور آج اس نے ان کے سامنے پہلی بار خون تھوکا تھا۔ غزنی نے دوشیا کے کہنے پر اسے سینی ٹوریم میں داخل کر دیا۔ دوشیا نے اس کے کمرے کی خوب صفائی کروائی۔ صفائی کے دوران اس کی ڈائری ملی جو ملازم نے غزنی کو دے دی۔ اس نے لاپرواہی سے ایک جانب پھینک دیا۔ لیکن پھر کچھ خیال آیا۔ اس نے ڈائری اٹھایا اور کھولا۔ پہلے صفحے پر غزنی کی بڑی سی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ نیچے شعر تھا

وہ بھی وقت تھا کہ تیرا ذکر تھا سرمایۂ زیست
اب ترا نام بھی لیتے ہیں تو دل دکھتا ہے

ایک جگہ لکھا تھا

"خدایا میری قسمت میں بربادیاں ہی کیوں لکھ دی گئیں۔ کیا مجھے کبھی کوئی خوشی راس نہیں آ سکتی۔ تیری اس بھری دنیا میں کیا ایک بھی خوشی میرے حصے کی نہیں۔ اس دکھی زندگی میں اس رنج و غم کے ساگر میں خوشی کی ایک لہر ابھری تھی۔ غزنی نام کی کتنا مسرت انگیز نام ہے میرے جیون کا انمٹ نقش۔ لیکن خوشی کی

ہر لمحہ کوسہ رہی آپ کے بغیر لوٹ گئی کسی اور جانب میں پرائی ہو گئی ہوں۔ میرا اس میں کیا دوش۔ مجبوری کی بھاری سل تلے مجھے دبا دیا گیا لیکن غزنی میرے دکھوں سے بے پرواہ مجھے اظفر کی نظروں میں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور آج پھر ایک نیا الزام میرے سر تھوپا ہے۔

اس کے بعد کئی تاریخیں تھیں جس میں غزنی کے ظلم درج تھے۔ ایک جگہ لکھا تھا۔

جی چاہتا ہے اب تو موت مجھے اپنے شفیق ہاتھوں میں لے لے۔ لیکن میں اتنی خوش قسمت کہاں ہوں کہ مجھے موت کے ہاتھوں پناہ مل جائے۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ سب مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ شاید میری روح سے میرے پیدا ہونے سے پہلے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہوا تھا جس کی اتنی کڑی سزا مجھے اس جنم میں مل رہی ہے

اگلے صفحے پہ تھا۔

زندگی بھی کیا چیز ہے کہیں مجسم خوشی اور کہیں سراپا غم۔ والدین کی حیات میں خوشیاں میرا مقدر تھیں اور اب میرا وجود سراپا غم ہے میری زندگی کو یہ تحفہ دینے والی میری چچی میں آپ کو اب بھی برا نہ کہوں گی۔ آپ نے میری ماں کا انتقام مجھ سے لیا۔ گناہ تو میری ماں نے بھی نہ کیا تھا۔ پاپا نے اگر ایک پہاڑی لڑکی کو پسند کر لیا اور شادی کر لی تو ان کا کیا دوش۔ وہ تو تھیں ہی ایسی چیز۔ پاپا نے ان کی محبت ٹھکرا دی تھی۔ اور پھر آپ کی شادی چچا سے ہو گئی۔ امی ابو کی زندگی نے وفا نہ کی اور مجھے آپ کے رحم و کرم پہ چھوڑ گئے۔ اور چچی آپ نے اپنی ناکام تمنا کا انتقام مجھ سے لیا۔ میرے ساتھ وہی کہانی دہرائی جو آپ کے ساتھ گزر چکی تھی۔ آپ نے میری شادی غزنی کے ساتھ کرنے کے بجائے اظفر سے کر دی اور کہا یہ کہ میں اظفر کو پسند کرتی ہوں۔ حالانکہ مجھ پر تو سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ غزنی سمجھتے ہیں کہ میں نے اظفر کو پسند کر لیا تھا۔ انہیں کیا پتہ کہ اس ستم زدہ دل پر لمحہ لمحہ اذیت ناک گزرتا ہے۔ آپ نے اپنا انتقام پورا کر لیا ہے لیکن غزنی کا انتقام جانے کب پورا ہو گا۔ شاید مرنے تک۔ اب تو زندگی کی ہر خوشی دکھوں کے گہرے سمندر میں ڈوب چکی ہے۔ کوئی آس نہیں۔ کوئی خوشی نہیں۔ کسی بھی سہارے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب ہم اس موڑ پر آ گئے ہیں جہاں سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن کبھی دل کے گوشے سے صدا ابھرتی ہے۔ کاش ایک دفعہ صرف ایک دفعہ غزنی مجھے معاف کر دے کہ میں سکون پا لوں لیکن مجھے معلوم ہے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ میری آس کبھی پوری نہ ہو گی۔

ڈائری غزنی کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔ ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا تب ہی ملازم ایک خط انہیں پکڑا گیا۔ خط سعودی عرب سے آیا تھا۔ چچی رابعہ بیگم کا تھا۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ زندگی کی چند سانسیں باقی تھیں۔ انھوں نے شمع سے خطائیں بخشوائی تھیں۔ اپنے ظلم کی معافی مانگی تھی اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ اور غزنی سن ہو کر رہ گئے۔ کتنے ظالم تھے وہ۔ انجانے میں اس معصوم ہستی کو کتنے دکھ دیتے رہے۔ اس وفا کی دیوی پر اپنی جفاؤں کے نشتر چلاتے رہے۔ طعنے دے دے کر اس کا کلیجہ چھلنی کرتے رہے۔ اور وہ اتنی اعلیٰ ظرف تھی کہ کبھی گلہ نہ کیا کوئی شکایت لبوں تک نہ لائی۔ چپ چاپ انکے ظلم و ستم کا تحفہ اپنے دل میں سجاتی رہی اور آج وہ کسمپرسی کی حالت میں بے یار و مددگار سینی ٹوریم میں پڑی تھی۔ نواب بیگم اسے دیکھ آئی تھیں۔ وہ اس پر بے تحاشا دولت خرچ کر رہی تھیں لیکن اسکو توفیق نہ ہوئی تھی کہ جا کر ایک دفعہ اس کے ٹوٹے دل کو تسلی ہی دے آتا کیونکہ وہ بے وفا تھی مگر آج پردہ ہٹ چکا تھا۔ چچی نے اس پر ظلم کیا تھا اور اس کا نتیجہ پا لیا۔ کینسر میں مبتلا ہو گئیں۔ ظلم انہوں نے بھی کیا۔ لیکن وہ خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔ رنج و غم سے دور۔ ایک دم بہت سا دکھ ان کے وجود میں اتر آیا۔ وہ بہت بے چین ہو گئے۔ دل رنج و غم سے پھٹنے لگا۔ میں۔ شمع تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ اندھا دھند گاڑی نکالی اور فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔ کئی دفعہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ راستے میں ٹرین آ رہی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ لمحہ لمحہ بھاری تھا۔ وہ شمع کے پاس اک دم پہنچ جانا چاہ رہے تھے۔ گیٹ کھلا۔ وہ جنون کی حالت میں گاڑی چلاتے رہے۔ شمع کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ سینی ٹوریم پہنچ گئے۔ تیزی سے گاڑی سے اترے دروازہ بند نہ کیا۔ جنرل وارڈ میں بیڈ ۲۱ کے صاف ستھرے بستر پر اسکا وجود گھل مل گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔

"شمع شمع! مجھے معاف کر دو۔"

وہ بیقراری سے اسکے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولے۔ "ہم تمہارے گنہگار ہیں۔ کاش تمہاری بیماری ہمیں لگ جائے۔" وہ بس بولے جا رہے تھے ان کا بس نہ چلتا تھا کہ دم بھر میں اسے تندرست کر دیں۔

"شمع!"

وہ اس کے چہرے پہ جھکے بغیر کسی احتیاط کے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

ایک ہلکی سی مدقوق مسکراہٹ شمع کے پپڑی لگے ہونٹوں پہ آئی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔ لیکن لہراتا ہوا موت کا جھونکا آیا اور شمع بجھ گئی۔

برابر کے وارڈ سے گانے کی تیز آواز آ رہی تھی

تم سے بچھڑ کے زندہ ہیں۔ جان بہت شرمندہ ہیں
شاید تم کبھی لوٹ ہی آؤ اس امید پہ زندہ ہیں



فاصلے جو مٹ نہ سکے

شاہدہ قمر



"نازش" بیگم رحمان آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں گھستی چلی آئیں۔

"اُف میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔"

انہوں نے پورے کمرے میں پھیلے ہوئے بے تحاشہ سگریٹ کے دھوئیں سے گھبرا کر کہا۔

ریکارڈ پلیئر تیز آواز میں بج رہا تھا... اور نازش وہ آرام سے اپنی موونگ چیئر پر بیٹھی مستقل اپنی چیئر کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اب بھی سگریٹ تھی... بیگم رحمان چند لمحوں اُسے نفرت اور غصہ سے دیکھتی رہیں... جب اس نے ذرا بھی نوٹس نہ لیا تو انہوں نے غصہ میں ریکارڈ پلیئر بند کر دیا... اور وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی... ہاتھوں میں دبا ہوا سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"جی فرمایئے۔"

وہ اپنے بالوں کو ہاتھ میں جکڑتے ہوئے بولی۔

"کیا فرماؤں تمہیں معلوم ہے اس وقت کیا ٹائم ہو رہا ہے؟"

"اس وقت ساری دنیا سو رہی ہے اور تم... تم سب کی نیند حرام کر رہی ہو۔ انتہا ہوتی ہے بدتمیزی کی۔ کوئی عادت لڑکیوں والی ہے تم میں۔"

انہوں نے نفرت سے بھری ہوئی ایش ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ آہستگی سے اُٹھی اور لان کی طرف کھلنے والے دریچے میں جا جھکی۔

"بس یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟"

وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

بیگم رحمٰن زور سے چیخیں۔

"آہستہ بولیئے آپ کے شوہر اور بچے سو رہے ہیں۔"

"میرے شوہر اور بچے تمہارے کچھ نہیں ہیں۔"

"میرے ہونہہ! وہ میرے ہوتے نہ ہوں میں ان کی کچھ نہیں ہوں۔"

"تو پھر دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔"

"فکر نہ کریں جلد ہو جاؤں گی۔"

اور بیگم رحمان پیر پٹختی ہوئی لوٹ گئیں۔

اس نے گھڑی دیکھی تین بج رہے تھے... ساری دنیا سو رہی تھی۔ ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا اس نے ایک ساتھ تین چار سلیپنگ پلز حلق سے اتاریں اور صوفے پر ہی لیٹ گئی اور پھر آہستہ آہستہ دو سوکھی جھیلیں تر ہوتی گئیں... ان میں قطرہ قطرہ بڑھتا رہا اور جب گنجائش نہ رہی تو دونوں کناروں سے گرم گرم ابلتا ہوا لاوا بہہ نکلا۔

"کہاں میں شروع سے ہی اتنی بری تھی... نہیں اندر سے آواز آئی... پھر ایسا کیوں ہوا... میں کہاں آگئی کن راہوں پر چل پڑی مما کی روح کیسی تڑپ رہی ہو گی... انہوں نے تو مجھے ایک مثالی لڑکی بنایا تھا۔ وہ خود تو ایک مغربی خاتون تھیں مگر انہوں نے مجھے تو مشرق کا حسین اور مکمل شاہکار بنایا تھا، کہ لوگ پاپا کو یہ طعنہ نہ دیں کہ انگریز امریکن عورت سے شادی اس نے اولاد کو یہ تربیت دی۔

*

بائیس سال پہلے جب رحمٰن صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے لگے تو سب خاندان والے بری طرح پیچھے پڑ گئے تھے کہ رحمٰن شادی کر کے جاؤ۔ وہاں تو ہر پاکستانی لڑکے کے پیچھے ضرور کوئی عورت پڑ جاتی ہے۔"

"دیکھو رحمٰن تم کو آکر رضیہ سے شادی کرنا ہے میں نے اُسے بچپن سے تمہارے لئے مانگ لیا ہے آپا بی سے اور تمہیں ہر حالت میں میرا حکم ماننا ہے۔"

اماں بی نے سخت لہجے میں اپنے چہیتے بیٹے کو نصیحت کی۔

"ارے اماں بی آپ فکر نہ کریں کچھ نہیں ہو گا۔"

اور وہ چلے گئے۔ وہ رحمٰن جنہوں نے اپنی عمر کے بائیس سال نہایت با اصول طریقے سے گزارے تھے۔ وہاں کی چکا چوند آزادی اور ہر طرف بکھرے حسن سے بوکھلا کر رہ گئے۔ اماں بی اور تمام خاندان والوں کی سب نصیحتیں بھک سے دماغ سے نکل گئیں۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ وقت سے فائدہ ضرور اُٹھانا چاہیئے۔ ان کے بیشمار امریکن دوست بن گئے جن میں لڑکیاں بھی تھیں مگر ریٹا ان سب سے منفرد تھی یا شاید رحمٰن صاحب کو لگتی تھی۔ وہ جب بھی سب دوستوں کے ساتھ مل کر ڈرنک کرتے تو وہ اُسے سمجھاتی۔

"پلیز رحمٰن تم مت پیا کرو تم مسلمان ہو تمہیں واپس پاکستان لوٹنا ہے۔"

وہ جب مدہوش ہو جاتے اور انہیں سہارے کی ضرورت

پڑتی تو سب اپنی اپنی راہ لیتے ایک ریٹا ہی تھی جو انہیں سنبھالتی اور پھر اس کا خلوص رنگ لے ہی آیا رحمٰن نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اُسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنانے کا۔ وہ آئے تو تھے اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ مگر سارا پیسہ تاش اور ریس میں اُڑا چکے تھے اور اس وقت ریٹا نے انہیں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں جگہ دی ہوئی تھی، وہ ایک فرم میں سروس بھی کرتی... اور رحمٰن وہ ہر لمحہ یہی سوچتے کہ وہ کیسی مغربی لڑکی ہے جس نے وفا کے سارے خزانے مجھ پر لٹا دیئے ہیں اماں بی تو کہتی تھیں وہاں کی عورتیں پاکستانی مردوں کو لوٹ لیتی ہیں مگر... مگر وہ تو خود اپنے ہاتوں برباد ہوئے تھے اس نے تو انہیں ہر قدم پر سہارا دیا تھا اور اب جب کہ سب دوست ساتھ چھوڑ گئے تھے وہ بالکل قلاش ہو گئے تھے وہ اُنکا سہارا بنی ہوئی تھی... وہ ان کا اتنا خیال کرتی کہ وہ بھول جاتے وہ کون ہے۔

مغرب کی بیٹی

غیر مسلم

بے پردہ

مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ ایک مکمل عورت تھی

اور عورت کی وفا اور عظمت سے آشنا تھی

سو انہوں نے کچھ سوچے بغیر وہ فیصلہ کر لیا جو شاید ان کی ہمتوں سے بہت زیادہ تھا۔ اور ایک مطمئن سی مسکراہٹ ان کے لبوں پھیل گئی اور اس رات جب ریٹا تھکی تھکی سی لوٹی تو وہ ہمیشہ سے مختلف نظر آئے۔

"ارے رحمٰن خیریت؟" وہ انہیں ٹہلتا پا کر بولی۔

"کیا مجھے زیادہ دیر ہو گئی؟ وہ گھبرا کر بولی۔

"ارے نہیں پگلی۔ کوئی بات نہیں۔ بس تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا تھا۔"

اور ریٹا اپنی گہری سبز آنکھوں میں ڈھیر ساری حیرانی لئے انہیں تک رہی تھی۔

اور جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھے تو رحمٰن بولے

"ریٹا ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ضرور پوچھیں۔"

"تم اتنی اچھی اردو کیسے بولتی ہو؟"

"اوہ!" وہ ہنس پڑی۔

"دیکھو رحمٰن میرے ڈیڈ اور مما ہیں نا ان کی ایک انڈین فیملی سے بہت دوستی ہے۔ میں نے بچپن سے خود کو ان لوگوں کے درمیان پایا۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہیں وہ لوگ انڈیا گئے ہیں۔ ان کے بچوں کے ساتھ میں نے اپنا بچپن گزارا۔ مجھے وہ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے ان کے گھر کی ہر بات معلوم ہے۔ تمہیں یاد ہے مائی! میں تم کو منع کرتی تھی کہ ڈرنک تم مسلمان ہو۔ تو مجھے یہ انہی لوگوں سے پتہ چلا تھا کہ تمہارے مذہب میں ڈرنک کرنا حرام ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا جب وہ لوگ عبادت کرتے تھے۔ وہ لوگ بس آنے ہی والے ہیں۔ میں تم کو ان سے ملواؤں گی۔" وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔

"اچھا ریٹا اگر میں تمہیں کہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اور ہم... ہم شادی کر لیں تو...؟" رحمٰن نے بہت تیزی سے یہ بات کہہ دی کہ اب اس کے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔ اور ریٹا۔ وہ تو ایسی بوکھلائی کہ ایک دم تین گلاس پانی پی گئی۔ مگر اس نے جو کچھ سنا اسے یقین اب بھی نہیں آ رہا تھا۔

"جواب دو ریٹا۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟ اگر تم نہ چاہو تو مجبور نہیں کروں گا۔"

"نہیں نہیں مائی تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی کہ جس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ مگر.... ڈیڈ اور مما تو فرانس سے آجائیں پھر سوچوں گی۔

"نہیں ریٹا ابھی فیصلہ کرو۔ کیونکہ تمہارے انکار کی صورت میں، میں بکھر جاؤں گا ان ہی راہوں پر لوٹ جاؤں گا جہاں سے تم مجھے واپس لائی ہو اور پھر تم کس سے ڈرتی ہو۔ تمہارے یہاں کی لڑکیاں تو آزاد ہوتی ہیں۔ یہ سب تو ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ بس زبردستی جہاں ماں باپ چاہیں وہیں لڑکی شادی کرے۔ پلیز ریٹا مجھ پر اعتبار کرو... اپنے مائی پر۔ میں تمہیں فخر سے اپنی دلہن بنا کر لیجاؤں گا پلیز ہاں کہہ ڈالو۔"

اتنے لمبے چوڑے رحمٰن اس نازک سی لڑکی کے سامنے خالی دامن پھیلائے بیٹھے تھے۔ اور ریٹا اس نے آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"دیکھو مائی خوب سمجھ کر فیصلہ کرو۔ جذباتی مت ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تنہا بھٹکتی رہ جاؤں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو صرف اتنا یاد رکھنا ریٹا جو اب تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ رہی ہے۔ اپنا مذہب، اپنے ماں باپ، اپنا وطن اور اپنا سب کچھ تم پر قربان کر رہی ہے آخر میں یہ جان بھی دیدے گی۔"

"بس کرو ریٹا۔ یہ مرد کا وعدہ ہے۔ تم مجھے ہمیشہ اپنا ہی پاؤ گی۔" انھوں نے اپنا ہاتھ ریٹا کے لرزتے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اور مائی یہ ایک مغرب کی عورت کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی جان دے کر بھی تمھارا مان رکھے گی۔"

"اوہ گڈ۔" رحمٰن خوشی سے جھوم اٹھے۔

دوسرے دن رحمٰن نے ریٹا سے شادی کرلی۔ وہ مسلمان ہوگئی۔

"مائی میں اپنا نام عائشہ رکھوں گی۔ مجھے یہ نام بے حد پسند ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج سے تم میری عاشی ہو۔" اور دونوں بھرپور انداز میں ہنس پڑے۔ اور چند مہینوں میں ہی عائشہ ایسی بدلی کہ لگتا ہی نہ تھا یہ وہی لڑکی ہے۔ شلوار قمیض پہنتی، اپنے چمکیلے سنہری بالوں کو اب اس نے کافی بڑھا لیا تھا۔ رحمٰن جو تعلیم کی غرض سے آئے تھے مگر جو حالات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ عائشہ نے دوبارہ شروع کروادی۔ اس نے پارٹ ٹائم جاب شروع کردیا تھا۔ وہ لاکھ کہتے۔

"دیکھو عاشی اب تم جاب چھوڑ دو۔ ہمارے ہاں لڑکیاں نوکری نہیں کرتیں یا جو کرتی ہیں ان کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔"

"ارے بابا چھوڑ دوں گی تمھاری تعلیم تو پوری ہوجائے جب ہم پاکستان چلیں گے تو چھوڑ دوں گی۔" اب تو اس نے رحمٰن سے نماز بھی سیکھ لی تھی۔ اور جب وہ بڑا سا دوپٹہ سر پر جمائے نماز پڑھتی تو اس کے چہرے پر ایسا نور ہوتا کہ رحمٰن دیکھتے رہ جاتے۔ وہ ان کا اتنا خیال رکھتی کہ اگر ذرا سی بھول ہوگئی تو قیامت آجائے گی۔

جب بھی گھر سے خط آتا رحمٰن پریشان ہوجاتے۔ سوچتے کیا ہوگا جب میں عاشی کو لے کر جاؤں گا۔ اور عاشی۔ اسے تو اتنا ارمان تھا پاکستان دیکھنے کا، اپنے سسرال والوں سے ملنے کا۔ رحمٰن نے کئی بار اماں بی کو لکھا کہ وہ پورے پانچ سال بعد آئیں گے آپ خالہ بی سے کہیے رضیہ کی شادی کہیں اور کردیں۔ مگر ہر دفعہ ایک لمبا چوڑا نصیحت بھرا خط آجاتا۔ آخر تھک کر انھوں نے اس بات کو ختم ہی کردیا۔ اب وہ ایسی کوئی بات کا جواب ہی نہ دیتے۔ سوچتے جب عاشی کو لے جاؤں گا تو ظاہر ہے وہ لوگ اس حقیقت کو مان ہی لیں گے۔

وقت بیتتا رہا لمحے سرکتے رہے اور اس خوشیوں سے سرکتے وقت نے انھیں ایک حسین پھول دیا جسے پاکر دونوں خوشی سے دیوانے ہوگئے۔

"عاشی ہماری بیٹی کتنی پیاری ہے۔" وہ اپنی ننھی سی گڑیا پر جھکتے ہوئے بولے، "کاش عاشی جو حسین وقت بیت گیا اسے ہم قید کرسکتے۔" نجانے کیوں وہ اداس ہو رہے تھے۔

"ارے مائی جی۔ یہ حسین وقت، حسین لمحوں کو ہم نے قید ہی تو کرلیا ہے۔ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھو۔ یہ ہمیں حسین وقت کی ہمیشہ یاد دلائے گی۔ یہ ہماری اپنی تخلیق ہے۔" اور رحمٰن نے اپنی پیاری سی گڑیا کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

اب عاشی نے جاب چھوڑ دی۔ رحمٰن کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ وہ وہیں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگئے تھے۔ ان کی ننھی بیٹی نازش اب بڑی ہوتی جارہی تھی۔

"مائی۔" عاشی قریب ہی بیٹھتی ہوئی بولی۔

"فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"بس مائی اب پاکستان چلیں۔"

"اس وقت! لیجیے بی بی اس وقت تو رات کے بارہ بجے ہیں، ہم کیسے جائیں گے، چلو سو جائیں۔"

"پلیز مائی۔ مذاق نہ کریں۔ دیکھیں نازش بڑی ہوتی جارہی ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ اپنے ملک میں تعلیم حاصل کرے۔ وہیں پلے بڑھے۔ جوان ہو۔ اپنے دادا دادی کی گود میں ان کے سائے میں پروان چڑھے۔ یہاں کا ماحول اس پر اچھا اثر نہیں ڈالے گا۔ اور میں اپنی بیٹی کو خالص مشرقی بناؤں گی تاکہ وہ کبھی کوئی طعنہ میرے حوالے سے نہ سن سکے۔"

"اچھا ٹھیک ہے ہم جلد چلیں گے۔ مگر دیکھو عاشی تم ضد کررہی ہو۔ اور وہاں کسی کو ہماری شادی تک معلوم نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو تم وہاں جاکر پریشان ہوجاؤ۔"

"نہیں رحمٰن۔ میں ان کو وہی کچھ کرکے دکھاؤں گی جس کی انھیں ایک پاکستانی لڑکی سے توقع ہوگی۔"

آخر کار انھوں نے جانے کے تمام انتظامات پورے کرلیے اور گھر ٹیلی گرام دے دیا۔ مگر نہ جانے کیوں ان کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا اپنا پُرسکون سا گھر چھوڑتے ہوئے۔ نہ جانے پھر یہ حسین لمحے، پھر یہ پُرسکون ماحول ملے نہ ملے۔ نازش جو اب سات سال کی پیاری سی بچی تھی حیران ہو کر پوچھتی

"بابا، ہم کہاں جارہے ہیں؟"

اور جواب میں عاشی خوش ہو کر بتاتی۔

"بیٹے! دادا جان، دادی جان کے پاس وہاں تمہارے بہت سارے پیارے پیارے بہن بھائی ہوں گے۔"

پورے گھر میں ایک ہلچل تھی۔ آخر کو رحمٰن پورے آٹھ سال بعد آرہے تھے۔ سب بے پناہ خوش تھے۔ اور خالہ بی کی خوشیوں کا تو ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ آخر کو اب ان کی رضیہ دلہن بنے گی۔ اتنے قابل آدمی کی۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا۔ سب ایئرپورٹ پر جمع تھے اور اس سرزمین پر پہنچتے ہی رحمٰن کا دل دھڑک اٹھا۔ آٹھ سال بعد وہ اپنے پیارے وطن کی سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے نازش کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ عاشی ان کے پیچھے تھی۔ ان کی نظر جیسے ہی اماں بی پر پڑی وہ بے ساختہ دوڑ پڑے۔ ادھر ان لوگوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ماں کے سینے سے لگ گئے اور اس افراتفری میں نازش کا ہاتھ ان سے چھوٹ گیا۔ اور انہیں احساس بھی نہ ہوا۔ نازش گھبرا کر پلٹی تو عاشی نے اسے فوراً تھام لیا۔

"ممی۔ پپا نے مجھے کھو دیا تھا۔"

"نہیں بیٹے میں جو تھی اور دیکھو وہ تمہارے پپا کی ممی ہیں۔ ان کو آداب کرنا۔" عاشی نے نازش کو سمجھایا۔

رحمٰن خالہ بی سے مل کر مڑے تو سامنے رضیہ تھی۔ تیز میک اپ اور شوخ سے رنگ کی ساڑھی میں۔

"آداب!" رضیہ نے اک ادا سے کہا۔

انہوں نے جواب دیا اور انہیں فوراً عاشی اور نازش کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر مڑے مگر عاشی تو بالکل قریب کھڑی تھی

"اماں بی! یہ آپ کی بہو ہے۔"

انہوں نے عاشی کی طرف اشارہ کیا اور اماں بی کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ انہوں نے دیکھا ایک پیاری سی نازک سی لڑکی پیازی شلوار کے سوٹ میں، سنہری بالوں کی چوٹی سمیت ایک پیاری سی بچی کو اپنے سے لپٹائے کھڑی تھی۔

"آداب اماں بی!"

وہ ان کے قدموں میں جھک گئی اور نازش۔ اس نے بھی دونوں ہاتھ اٹھا کر آداب کہا۔ مگر کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ کوئی جواب دیتا۔ رضیہ کے چہرے پر ڈھیروں نفرت اور حقارت عود کر آئی۔

"ویسے رحمٰن جی یقین نہیں آتا کہ تم اتنی قیمتی چیزیں یہاں سے لے آؤ گے۔ ورنہ اکثر لوگ تو اپنا سب کچھ لٹا آتے ہیں۔ بھابی اور تمہاری بیٹی بہت سویٹ ہیں۔"

رحمٰن کے دوست نے شوخی سے کہا۔ مگر رحمٰن تو سہمے رہے تھے۔ یہ ابھی پہلا قدم ہے اور عاشی کو نفرتیں مل گئی تو آگے کیا ہوگا! انہوں نے عاشی کی طرف دیکھا۔ دو سبز جھیلوں کا شفاف پانی گدلا رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس میں پتھر پھینک دیئے ہوں۔

عاشی گاڑی میں اماں بی اور خالہ بی کے درمیان بیٹھی تھی۔ اور ان دونوں کا بس نہ چل رہا تھا کہ اسی وقت اس کا گلا گھونٹ دیں۔

"پپا۔ میں آپ کی گود میں آؤں گی۔" نازش مچل گئی۔

"بیٹے۔ آگے انکل ہیں۔ تم پیچھے دادی جان کے ساتھ بیٹھو۔" رحمٰن نے پیار سے کہا۔

"دادی جان۔ کیا آپ ناراض ہیں؟ اگر ناراض ہوں گی ہم واپس چلے جائیں گے۔" نازش نے معصومیت سے دادی کی طرف دیکھا۔

"نازش بیٹے چپ کرو۔" عاشی نے ڈانٹا۔

"ارے اسے کچھ نہ کہو۔ آخر کو ایک امریکن عورت کی بیٹی ہے۔" یہ طنز میں ڈوبا پہلا تیر تھا جو عاشی نے اپنے دل میں سے اتار لیا۔

گھر پر رحمٰن کے بہت سے رشتہ دار تھے۔ بہت سے کچھ جو بھی عاشی سے ملا تعریف کیے بنا نہ رہا۔ وہ کسی طرح بھی لڑکی سے کم نہ تھی۔ اور اسی رات اماں بی نے اسے بلا بھیجا۔ اپنے کمرے میں عاشی اور نازش کو چھوڑ کر ان کے پاس آیا۔

"جی فرمائیے۔"

انہوں نے اماں بی کے قریب بیٹھ کر ادب سے کہا۔

"رحمٰن اگر تم میرے اکلوتے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہیں مار دیتی۔ تم نے یہ جرأت کیسے کی کہ اس فرنگن کو میرے پاس لاؤ۔ غضب خدا کا ایک بیٹی بھی ہو گئی اور تم نے ہمیں لاعلم رکھا۔ کان کھول کر سن لو۔ تم اسے طلاق دو۔ تمہیں رضیہ سے شادی کرنی پڑے گی۔"

وہ جواب تک خاموش کھڑے تھے ایکدم ہی چیخ پڑے

"اماں بی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اپنا حق لیا ہے۔ وہ ہو گئی ہے اور سات سال سے میرے ساتھ ہے۔ میری بیٹی کی ماں ہے۔ اگر آپ نے طلاق جیسے گندے لفظ کا استعمال دوبارہ کیا تو میں اسی وقت یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

"آپ کو نہیں معلوم اماں۔ وہ کیا ہے۔ وفا اور خلوص لا دیوی۔ آج جو میں آپ سب کے درمیان نظر آ رہا ہوں نا تو یہ سب اسی کی وجہ سے ورنہ شاید میں کبھی نہ آتا۔"

اور وہ غصہ میں وہاں سے نکل گئے۔

کمرے میں آکر انھوں نے دیکھا تو عاشی نماز پڑھ رہی تھی جانے کیا دعا مانگ رہی تھی کہ اس کے آنسو تیزی سے بہہ بہہ کر اس کے خوبصورت ہاتھوں کو اور آنچل کو بھگو رہے تھے۔ رحمٰن دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئے جہاں نازش بے خبر سو رہی تھی۔

"ہوں تو دیکھ لیا تم نے اپنا سسرال عاشی۔ دیکھ لیا تم نے پاکستان .... تمھارا استقبال اتنے انوکھے انداز میں ہوا ہے تو زندگی شاید بہت ہی خوبصورت گزرے۔"

اماں بی، ابا جان، خالہ بی، رضیہ سب ہی نے نفرتوں کی انتہا کر دی تھی۔ ایک رحمٰن کی بڑی آپا تھیں جو اپنے بیٹے فہد کے ساتھ راولپنڈی سے آئی ہوئی تھیں بھائی سے ملنے۔ ناراض تو وہ بھی بھائی سے بہت تھیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب عاشی کو سب قبول کر لیں اور رحمٰن کی زندگی اجیرن نہ کریں۔

مگر اماں بی۔ ان کی تو ایک ہی بات تھی۔

"بلقیس۔ زیادہ بھائی کی وکالت نہ کرو۔ میرا بچہ تو معصوم تھا۔ اس بے حیا نے لے کے ایسا کر دیا۔ اور تم دیکھنا ایک دن یہ ضرور میری ہو جائے گی۔"

"اماں بی۔ آپ خدا کے لیے خالہ بی کی باتوں میں نہ آئیں جو آپ سے کہیں وہ رضیہ کو کہیں اور بیاہ دیں۔ سوچیں تو ذرا نازش آپ کی پوتی۔ آپ کا خون۔ کیا آپ اسے ماں کے پیار سے محروم کر دیں گی؟"

"کیوں محروم ہو گی وہ پیار سے۔ رضیہ اسے ماں کا پیار دے گی اور وہ اس کی ماں اُسے واپس جانا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے جو آپ کا دل چاہے کریں۔ اگر آپ کو ایک ہمت کو برباد ہی کرنا ہے تو کریں۔ میں اور فہد کل جا رہے ہیں۔"

"ممی میں وہاں اکیلا ہوتا ہوں۔ آپ نازش کو بھی ساتھ لے چلیں نا۔" فہد نے ضد کی۔

"اچھا بیٹے لے چلیں گے۔ اس کے پاپا سے پوچھ لیں۔"

دن بیتتے رہے.... نہ جانے کیوں عاشی کو لگتا جیسے ایک ایک لمحہ صدی بن گیا ہے۔ وہاں وقت اتنی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا یہاں اتنا ہی رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ وہ ظلم، طنز اور نفرتوں کے سلسلے میں اپنی بچی سمیت دن گزار رہی تھی کہ شاید کسی صبح کا سورج اس کے لیے خوشیوں کا پیامبر بن کر چمکے مگر ایسا نہ ہوا۔ رحمٰن جن پر اسے بے پناہ ناز تھا، بھرم تھا، مان تھا وہ بھی ہار گئے۔ کیونکہ اماں بستر سے جا لگیں اور زندگی کے آثار جب بالکل ہی ختم ہونے لگے تو رحمٰن گھبرا گئے۔

"اماں بی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میرا قصور اتنا تو نہیں ہے کہ آپ مجھے ساری زندگی معاف نہ کریں۔"

وہ اماں بی کے پاؤں پکڑے رو رہے تھے۔ پاس ہی عاشی نازش کا ہاتھ تھامے التجا کر رہی تھی۔

"اماں بی۔ آپ چاہیں تو اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر دیں۔ مگر مجھے یہاں سے نہ نکالیں۔ میں طلاق نہیں لوں گی۔ نہیں لوں گی۔"

پاس کھڑے ہوئے سب ہی افراد رو رہے تھے۔ اور اماں بی نے آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔

"ٹھیک ہے تم رہو۔ مگر رحمٰن تمھیں آج ہی اسی وقت رضیہ سے شادی کرنا ہو گی۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ ورنہ میں تمھیں معاف نہیں کروں گی۔"

"مان لیں اماں بی کی بات مان لیں۔ آپ کو میری قسم۔" اور رحمٰن۔ وہ تڑپ اٹھے۔

"عاشی! تم عورت ہو یا..."

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ وہ تو جا چکی تھی۔ اس نے کمرہ اندر سے بند کر لیا اور نازش کو سینے سے لگائے بلکتی رہی۔ نازش جواب کافی بڑی ہو گئی تھی۔ اور اس کے دل میں اب سوائے اپنی ماں کے سب کی طرف سے نفرتوں کا زہر بھرا تھا۔

"ممی واپس چلیں۔"

اور عاشی چونک گئی۔

"کہاں؟"

"امریکہ۔"

"بیٹا یہ تمھارا گھر ہے۔"

"یہ میرا گھر ہے جہاں ہر وقت آپ روتی ہیں۔ جہاں کسی نے مجھے آج تک پیار نہیں کیا۔ ممی یہاں آکر تو ڈیڈی بھی بدل گئے۔ کیا وہ بھی سب سے ڈرتے ہیں۔ مجھے اب سب سے نفرت ہے ممی چلیں۔"

"نہیں نازش۔ اب میں وہاں کیا لے کر جاؤں۔ بہت عرصہ پہلے وہاں ایک ریٹا ہوتی تھی۔ پھر وہ عائشہ بنی۔ پھر ایک بیوی

بنی اور اب وہ صرف ایک ماں ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اس لئے میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ اس لئے کہ وہاں میرے ڈیڈ اور مما مجھ سے اپنی ربیٹا مانگیں گے اور وہ میں کہاں سے لاؤں گی۔ نازش میری جان تم یہاں سب سے محبت کرو۔ سب تم سے کریں گے۔ تم کو یہیں رہنا ہے۔"

اماں نے جب رحمٰن کا اقرار سنا تو ان میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی اور ان کی زندگی کا چراغ جو بجھنے کو تھا دوبارہ جل اٹھا۔ انہوں نے فوراً رضیہ اور رحمٰن کا نکاح کردیا اور رحمٰن مرد ہو کر بھی مجبور ہوگئے۔ انھوں نے سوچا ٹھیک ہے۔ اگر اس طرح گھر کا سکون بحال ہو جائے۔ وہ محبت تو عاشی سے اب بھی اتنی ہی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ دوسرے دن سے ہی رضیہ نے پورے گھر میں حکومت شروع کردی۔

رحمٰن دو تین دفعہ عاشی کے پاس گئے بھی مگر اس نے کوئی شکایت نہ کی۔ بس خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ مگر نازش انہیں دیکھتے ہی نفرت سے منہ موڑ لیتی۔ اور فوراً چیزوں کو ادھر اُدھر پٹخنے لگتی۔ وہ کچھ کہتے تو اتنی نفرت سے دیکھتی کہ وہ خود کانپ جاتے وہ لاکھ چاہتے کہ ان کی بیٹی ان کے قریب آئے مگر وہ دور ہوتی گئی اور پھر وقت کا چکر ایسا چلا کہ وہ خود نئی بیوی کے چکروں میں بری طرح پھنس گئے کہ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ اس گھر میں دو وجود اور بھی ہیں جو ان کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔

نازش اب سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ بے تحاشا پیاری۔ لگتا ہی نہ تھا کہ انگریز عورت کی بیٹی ہے۔ آنکھیں بالکل عاشی جیسی سبز سبز۔ مگر بال بالکل سیاہ اور چمکیلے۔ بچپن سے ہی عاشی نے اسے شرم و حیا اور مذہب کا سبق دیا تھا۔ بس پورے گھر میں جب بلقیس آتیں تو وہ اسے بہت پیار کرتیں۔ فہد بھی اب میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ جب بھی آتا سوچتا ماموں جان کتنے بزدل ہیں۔ اگر نباہ نہیں سکتے تھے تو شادی کیوں کی تھی۔ وہ چاہتا تھا نازش سے بات کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اس کا کزن ہے مگر نازش کبھی بات کرنے کا موقع نہ دیتی۔ کالج سے آکر زیادہ وقت ماں کے پاس گزارتی۔ اب عاشی بہت بیمار رہنے لگی تھی۔ اور ایک سرد سی رات کو اچانک عاشی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ اس نے بہت چاہا کہ نازش کو نہ اٹھائے مگر انتہا ہوگئی تو اس نے نازش کو اٹھا دیا۔

"کیا بات ہے ممی؟"

اس نے ماں کو تھام لیا مگر وہ تو دونوں ہاتھوں سے دل پکڑے ہوئے۔ "ناز مجھے سخت تکلیف ہے۔"

"اچھا ممی۔ میں کسی کو اٹھا دوں؟"

"نہیں۔ تم بیٹھو۔ غور سے میری چند باتیں سنو۔" اگر میں نہ رہوں تو تم ہمت نہ ہارنا۔ اپنے باپ سے اپنا حق لینا۔ اور جیسے ان کے خاندان کی بیٹیاں رہتی ہیں ویسے ہی رہنا۔ اگر تم سے ان لوگوں کو شکایت ہوئی تو میری روح تڑپے گی۔ میں نے تمہیں جس مشرقی رنگ میں ڈھالا ہے اسے نہ چھوڑنا۔"

وہ بری طرح ہانپنے لگی۔

"ممی" نازش رو پڑی۔ "مجھے جانے دیں۔ میں ڈاکٹر کو لے آتی ہوں۔"

وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑ پڑی۔

رحمٰن کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا کہ پپا کو اٹھا دوں مگر پھر نفرت کا ایک ریلا آیا اور اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔ ہونہہ۔ خود کیسے مزے سے اپنی بیوی اور بچوں کے سنگ آرام کر رہے ہیں۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

فہد جو لائٹ بند کرنے کے لئے اٹھے تھے کھڑکی کا کھلا پٹ بند کرنے اس طرف آئے تو انھوں نے دیکھا کہ نازش تیز رفتاری سے بھاگی جارہی ہے۔ وہ بھی دروازہ کھول کر اس کے پیچھے چل دیئے۔ اتنی رات کو نازش کہاں جارہی ہے اکیلی؟ ان کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اسے اپنی نانی جان کے الفاظ یاد آگئے۔

"اے بیٹا تم ان ماں بیٹی سے دور ہی رہنا۔ جیسی ماں تھی میرے بیٹے کو بگاڑنے والی ویسی ہی بیٹی ہے۔ آخر کو کس ماں کا خون ہے اس کی رگوں میں۔"

اس وقت نازش کہاں جارہی ہے؟ بس ایک ہی سوال تھا ان کے ذہن میں... اور اتنے میں وہ گاڑی تیزی سے نکل گئی۔ اور وہ کھڑے رہ گئے۔ وہ تیزی سے اپنی دوست نائلہ کے گھر کی طرف چل پڑی۔ کیونکہ اس کے ابو ڈاکٹر تھے۔ اور وہ جانتی تھی اتنی رات گئے شاید وہ ہی آجائیں۔ اور واقعی وہ اس کے کہنے پر فوراً آگئے۔

"آئیے انکل" وہ ڈاکٹر کے ساتھ آگے بڑھی۔ سامنے ہی فہد کھڑے تھے۔

"کہاں گئی تھیں اتنی رات کو؟"

ان کی آواز میں تھوڑا سا طنز تھا۔

"جہنم میں۔ آپ سے مطلب؟"

"آیئے انکل!"

اور وہ حیران سے دیکھتے رہ گئے۔ ڈاکٹر کے ... کر وہ گھبرا گئے اور پیچھے چلے آئے۔ عاشی تقریباً بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا۔

"بیٹی انہیں فوراً ہسپتال لے جانا پڑے گا ورنہ!"

"ورنہ کیا؟ نہیں انکل میری ممی کو کچھ نہیں ہوگا!"

"نازش۔ آنٹی کی طبیعت خراب ہے اور تم نے کسی کو نہیں بتایا۔ ماموں جان کو اٹھانا تھا۔"

"کیوں اٹھاتی؟ وہ میری ماں ہیں اور بس۔ کسی کی کچھ نہیں۔"

وہ روتی ہوئی چیخ پڑی۔ اور فہد وہ اس کے غصے اور نفرت کی پرواہ کیے بغیر رحمٰن صاحب کو اٹھانے بھاگا۔ چند لمحوں میں سب عاشی کے کمرے میں جمع تھے... رحمٰن نے اس کا کمزور ہاتھ تھاما ہوا تھا اور کہہ رہے تھے۔

"عاشی۔ آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو میں تمہارا مانی ہوں۔"

اور نہ جانے ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ بند ہوتا دل ایک بار پھر بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جیسے بجھتے چراغ کی آخری لو۔

"مانی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ میں نے بہت چاہا کہ سب کو اپنا بنالوں مگر یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ شکر ہے تمہارے گھر سے میرا جنازہ نکلے گا!!"

درد کی شدت سے وہ بالکل زرد پڑ چکی تھی۔ اور رحمٰن وہ پورے کے پورے ندامتوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"فہد۔ جلدی گاڑی نکالو۔ ہسپتال چلنا ہے۔"

اور رضیہ جو پاس ہی کھڑی تھی نفرت سے بولی۔ "بنتی ہیں ٹھیک ہو جائے گی۔ آخر اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے!"

اس کی آواز سن کر عاشی نے بڑی بے بسی سے رحمٰن کو دیکھا

"مانی! اب مجھے کہیں نہ لے جائیں۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے... بس... بس... ایک آخری وعدہ کرلو۔ چاہے جھوٹا ہی سہی!"

"بولو عاشی جلدی۔ کیسا وعدہ؟"

رحمٰن بے تابی سے بولے۔

"لو بھلا اب وعدے کرانے کے لئے ڈرامہ کی کیا ضرورت تھی" رضیہ پھر بولی۔

"رضیہ۔ بکواس بند کرو۔ تم سب نے مل کر مجھ سے ایک عظیم گناہ کرا دیا۔ ایک ایسا گناہ جس کی معافی مجھے کبھی نہ ملے گی۔ نکل جاؤ یہاں سے!"

عاشی کی سانس اکھڑنے لگی۔

"مانی!" اس نے رحمٰن کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔ "دیکھو مانی۔ ہمارے پیار کے وہ لمحات جو ہم نے قید کر لئے تھے۔ جنہیں ہم نے امر بنایا تھا... وہ آج بھی زندہ حقیقت بن کر موجود ہیں۔ ہماری نازش کی صورت میں۔ اس لئے میری نازش کی۔ ان حسین لمحوں کی۔ اس پیار کی یادگار کی حفاظت کرنا۔"

"ہاں... ہاں... عاشی... میں نازش کو پیار کروں گا بے پناہ!"

اور وہ اس جھوٹے وعدے پر پُرسکون ہوگئی اس نے ایک نظر نازش کو دیکھا اور اگلے لمحے عاشی کی روح نجانے کیسے چپکے سے اسکے جسم سے آزاد ہوگئی کہ کسی کو پتہ نہ چلا۔ اب اس جگہ صرف بے جان وجود تھا مٹی کا ڈھیر تھا۔

آج ایک وفا کی کہانی ختم ہوگئی تھی۔

ظلم کی داستان ختم ہوگئی تھی۔

ایک مغرب کی بیٹی عورت کی عظمت پر سے قربان ہوگئی تھی۔ اور اس کی اتنی بے بسی کی موت پر آج تو سخت دل اماں بی ابا میاں سب ہی اشکبار تھے۔ بلقیس اور فہد نازش کو سنبھال رہے تھے۔ اب رحمٰن نازش کے پاس جاتے۔ حال پوچھتے۔ مگر وہاں تو بس ایک گہری خاموشی تھی۔ ایک چپ تھی۔ اس کے ذہن میں ہر وقت جھکڑ سے چلتے رہتے۔ وہ کسی طرح سنبھل ہی نہ پا رہی تھی۔ اور سنبھلتی بھی کیسے۔ اجنبیت کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ اب ان کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ فہد نے بہت چاہا کہ وہ سب میں گھل مل جائے۔ اس طرح اس کا دکھ کچھ دور ہوگا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ رضیہ کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ انہیں آج تک یہ نہ معلوم ہوسکا وہ ان کی اپنی بہن ہے۔ ان کے ذہن میں تو بچپن سے نفرت کے بیج ڈال دیئے گئے تھے۔ کچھ دن تو سب نے ہمدردی کی اور پھر وہی پرانی ڈگر پر سب رواں ہوگئے۔ انہی دنوں اس کا سیکنڈ ایر کا رزلٹ آگیا۔ وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئی۔ اس دن عاشی کی تصویر کو سینے سے لگا کر بے تحاشہ روئی۔ "ممی میں کیسے جیوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے!" وہ کافی دیر روتی رہی۔ پھر نجانے کیا سوچ کر دادی اماں کی طرف چل دی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں سب موجود تھے۔ سب نے حیران ہو کر دیکھا۔ ایک لمحہ کو وہ بھی لڑکھڑا گئی۔ آج پہلی بار وہ یوں سب کے سامنے آئی تھی۔

"آؤ بیٹے کیا بات ہے؟" رحمٰن بولے۔ اس کے ہاتھوں

میں اخبار تھا۔ آسمانی لباس میں وہ بے حد تھکی تھکی اور زرد لگ رہی تھی۔ زیادہ رونے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"پاپا۔ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمشن دلادیں۔"

"تم نے بی اے پہلے انٹر تو کر لو۔" رضیہ بولیں۔

"وہ تو کر لیا۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ہیں کیا رزلٹ آگیا؟" رحمٰن بولے۔

"جی۔" اس نے اخبار آگے کر دیا۔

اس کی فرسٹ کلاس دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ مگر اور کوئی کچھ نہ بولا۔

"ٹھیک ہے لے لو ایڈمشن۔" رحمٰن بولے

"میرا تو خیال ہے اب پڑھائی ختم کرو۔ کچھ گھر داری سیکھو۔ نماز روزہ سیکھو۔ ورنہ سب کی ناک کٹواؤ گی کہ کس ماں کی بیٹی ہو۔" رضیہ نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"یہ سب کچھ مجھے میری ماں سکھا کر گئی ہے۔" اس نے نہایت ضبط سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

یونیورسٹی میں ایڈمشن کیا لیا۔ ہر وقت طنز کی بارش۔ امریکن ماں ہونے کا طعنہ۔ انہی دنوں پھر بلقیس اور فہد آئے ہوئے تھے فہد کی خواہش تھی کہ وہ نازش سے شادی کر لیں اور ان کی یہ خواہش ہی کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ اس دن وہ یونیورسٹی سے آکر بیٹھی ہی تھی کہ بلقیس بیگم اس کے کمرے میں آگئیں۔

"آئیے پھپھو۔" وہ حیران سی کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔"

"خیریت، کیا بات ہے؟"

"دیکھو نازش مجھے تم سے پیار ہے مگر پھر بھی میں تم کو بہو نہیں بنا سکتی۔ اور فہد کی ضد ہے کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔" اسے تمہاری سادگی، تمہارے حسن نے پاگل بنا دیا ہے اور تم اپنی ماں کا حشر دیکھ چکی ہو۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم انکار کر دو۔"

"میں نے ہاں کب کی ہے جو آپ انکار کا کہہ رہی ہیں پھپھو مجھے اس خاندان سے نفرت ہے۔ آپ سمجھتی ہیں میں شادی کروں گی۔ نہیں۔ اگر آپ کا بیٹا مر بھی جائے تو ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس کا انکار جب فہد نے سنا تو تڑپ اٹھا۔ اف۔ آخر یہ لڑکی ہر ایک کو اپنے باپ جیسا کیوں سمجھتی ہے۔ خیر میں خود بات کروں گا۔ اور دوسرے دن وہ موقع پا کر اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ اسی وقت نماز پڑھ کر اٹھی تھی۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں اور چہرہ گم دکھائی دے رہا تھا۔

"نازش میں اندر آسکتا ہوں؟" وہ ابھی تک دروازے میں کھڑے تھے۔

"جی آئیے!"

"میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔" وہ بیٹھ گئے۔

"کہیے۔ ویسے معلوم ہے آپ کیا کہنے آئے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"نازش تم نے انکار کیوں کیا؟"

"ضروری نہیں کہ میں ہر بات کی وجہ بتاؤں۔ ویسے بائی دی وے آپ کو بے وقوف بنانے کو کیا اور کوئی نہیں ملا۔"

"کیا کہہ رہی ہو نازش۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ایک امریکن عورت کی بیٹی میں آپ کو کیا خوبی نظر آئی جو اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔"

"تمہاری سادگی۔ تمہاری حیا!"

"ہونہہ سادگی۔" وہ طنز سے ہنسی۔

"فہد صاحب غور سے سنیے۔ میں کسی پاکستانی سے شادی نہیں کروں گی۔ جو غلطی میری ماں نے کی وہ میں نہیں کر سکتی۔ اس لیے آپ چلے جائیے۔ میں ابھی اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ آپ سے شادی کروں۔"

اور فہد وہ اپنی توہین پر تلملا گئے۔

"ٹھیک ہے۔ اچھا ہوا جو تم نے خود کہہ دیا ورنہ میں اپنی امی کو چھوٹا سمجھتا۔" اور وہ باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی وہ سسک پڑی۔ فہد تم نے اچھا کیا جو بدگمان ہو گئے۔ ورنہ شاید تمہارے پیار اور چاہت پر اعتبار کر کے میں بھی اپنی ماں کی طرح برباد ہو جاتی۔ اور دوسرے دن ہی مجھ پر کوئی دوسری رضیہ بیگم مسلط کر دی جاتیں۔ فہد میں نے تو تمہارے جذبوں کو تمہاری آنکھوں سے بہت پہلے پڑھ لیا تھا۔ مگر جان کر انجان بنی رہی۔ حالانکہ اس دل میں تمہاری بے پناہ چاہت اور محبت ہے مگر شاید تم کبھی نہ جان سکو۔

سب خوش تھے کہ نازش نے خود انکار کر دیا۔ اس نے اب باہر کی دنیا میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ وہ کافی دیر سے گھر آتی اور پھر دیر تک گاڑی لے کر نکل جاتی۔ سب ہی اس کی تبدیلی پر حیران تھے۔

ایک دن وہ لابی میں اپنے پورے گروپ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"فرازیہ تم اتنی سگریٹ کیوں پیتے ہو، لگتا ہے کوئی الجھن پال

بیٹھا ہے۔"
اس نے غور سے فراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیوں۔ خیریت؟"
"ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔"
"سکون کے لئے۔" فراز نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
"ہائیں کیا کہا۔ کیا اس سے سکون ملتا ہے؟"
"کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"اس لئے کہ میں بھی بے سکون ہوں۔"
"اف۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ناہید بولی۔
"محترمہ! کل سے آپ بھی سکون کے لئے سگریٹ پیجئے گا۔"
"فراز پلیز ایک سگریٹ۔"
اور سب اچھل پڑے مگر وہ اپنی دھن میں سگریٹ سلگا کر اپنے لبوں پر لگا چکی تھی۔ اور ایک لمحہ میں سارا حلق کڑوا ہو گیا زبردست کھانسی اٹھی۔ آنکھوں سے ... بہہ نکلا۔
"ارے تمہیں خدا ... پھینکو۔" ناہید چیخی۔ مگر وہ آنکھوں کو مسل کر ہنس پڑی۔
"ارے ایمان سے فراز بڑا مزہ آیا۔ بڑی اچھی چیز ہے یہ تو۔"
"میں دیکھ رہی ہوں تم اب بگڑتی جا رہی ہو۔ اتنے خوبصورت بال تھے لے کر کٹوا ڈالے۔ لباس نہایت بے ڈھنگا پہننے لگی ہو۔ اور اب سگریٹ نے تو ساری کسر پوری کر دی۔" دن بدن تم پہ مغربیت چھاتی جا رہی ہے۔ ورنہ لوگ تمہاری مثال دیا کرتے تھے۔
"سنو ناہید ڈیر۔ میں ایک مغربی عورت کی بیٹی ہوں۔ اور مجھے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ چلو اب تم لوگ مجھے گھر ڈراپ کر دو۔"
اور سب اٹھ گئے۔ اس وقت اس کے چہرے پر دنیا جہان کا کرب تھا۔ شکست تھی۔
وہ فراز کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سب خاموش تھے۔ جب گھر آیا تو اس نے دیکھا اوپر ٹیرس پر فہد کھڑے تھے اور اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اسے جانے کیا سوجھی۔ اترتے ہوئے بولی۔
"اچھا دوستو بائے بائے۔"
اور اپنا ہاتھ فراز کی طرف بڑھا دیا۔ سب حیران اسے دیکھ رہے تھے۔
"ملاؤ ہاتھ عجیب مشرقی لڑکے ہو۔"
اس نے زبردستی ہاتھ ملایا اور ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لے کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ فراز غصے سے دیکھ رہا تھا۔
"خدا رحم کرے اس پہ۔" اس نے زیر لب کہا اور گاڑی موڑ لی۔
فہد نے یہ سب دیکھا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دیں۔ حد ہوتی ہے آزادی کی۔ بس ماموں جان سے خود کہوں گا آج۔
آہستہ آہستہ پورے گھر میں سب کو اس کی عادات اور شغلوں کا علم ہو گیا۔ آتے جاتے طنز کے تیر ہر کوئی اس پر برساتا۔ مگر اس نے تو اب کان بند کر لئے تھے۔ تم سب یہی تو چاہتے تھے سو اب پریشان کیوں ہو؟"
آج وہ بہت خوش تھی۔ امریکہ سے اس کے نانا کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا۔
" نازش بے بی۔ ایک بار آ کر مل جاؤ۔ ریٹا کی موت ہم پر قیامت لے آئی ہے۔ میں نے اپنی ساری دولت، مکان سب تمہارے نام کر دیا ہے اور مرنے سے پہلے تم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آ جاؤ بے بی صرف ایک بار۔"
اس نے سوچا ٹھیک ہے۔ آج میں پپا سے بات کروں گی اور کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔
ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی بے تحاشہ سگریٹ پھونک رہی تھی کہ رحمٰن آ گئے۔
"نازش!"
انھوں نے غصے سے آواز دی۔
"جی۔"
وہ سکون سے بولی۔
"تم نے جو روش اختیار کی ہے وہ آج تک ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کی۔ تمہاری وجہ سے سارا خاندان بدنام ہو رہا ہے۔"
"پپا۔ میں امریکہ جا رہی ہوں۔" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے نانا نے بلایا ہے۔ پھر کبھی نہیں آؤں گی۔ بس آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"
"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"
"جی ہاں۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا۔
اور وہ چلے گئے اور ڈھیر سارے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ "یا اللہ! پپا نے مجھے ذرا بھی نہ روکا۔" اور اس رات وہ بہت بے چین رہی۔ عاشی کی تصویر کو سامنے رکھے ڈھیروں

...آ رہی ... سارے سگریٹ پھونک ڈالے اور تیز آواز میں ریکارڈ سن رہی تھی کہ بیگم رحمٰن آ کر چیخ گئیں۔

اس نے کروٹ بدلی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور آج خلافِ معمول سب جلد جاگ گئے تھے۔ اس نے کھڑکی کے پردے سرکائے اور نیچے دیکھا۔ گاڑی میں سب لوگ کھانے پینے کا سامان رکھ رہے تھے۔ اس کے تینوں بہن بھائی، پپا رفیعہ بیگم، فہد، بلقیس سب شاید کہیں پکنک منانے جا رہے تھے۔ فہد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اوپر دیکھا وہ کھڑی تھی۔ اور جیسے ہی نظریں ملیں، وہ فوراً ہٹ گئی۔ اور دوبارہ سو گئی۔ چاہنے کے باوجود نیند نہ آ رہی تھی۔ اس نے تین چار گولیاں کھائیں۔ ایک عجیب قسم کی بے چینی اور اداسی پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ دس بجے فون کی بیل چیخ اٹھی۔

"ہیلو، کیا بات ہے ناز۔ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟" ناہید نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ناہید بس دل بڑا گھبرا رہا ہے۔"

"ارے تو آ جاؤ۔ اور سنو ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔"

"میرے لیے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں بھئی اتنی حیران کیوں ہو؟"

"اس لیے ناہید کہ سوچ رہی ہوں کہ کسی خوشی کے ملنے پر میرا دل اتنا گھبرا رہا ہے... تو... تو.... اگر دکھ ملنے والا ہو تو کیا ہو گا۔"

"اچھا بکواس بند کرو۔ سنو ابو نے تمہارے امریکہ جانے کے سب انتظامات مکمل کروا دیئے ہیں اور پرسوں تمہاری فلائٹ ہے۔"

"پرسوں۔ اتنی جلدی۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"اے بابا تم تو عجیب ہو۔ اس دن تو میرا دماغ کھا رہی تھیں کہ بس انکل سے ایک دن میں کروا دو۔ اب کیا ہوا۔ کیا فہد صاحب نے کوئی پٹی پڑھا دی۔"

"ارے نہیں ناہید ڈیئر۔ مجھے روکنے والا کوئی نہیں۔ بس میری ممی اکیلی رہ جائیں گی۔ دیکھو ناہید تم کبھی کبھی ان کی قبر پر جانا اور فاتحہ پڑھنا۔ ویسے مجھے معلوم ہے ممی مجھ سے

...ہوں گی یہاں... جاتے پر" اور وہ فون پر ہی ...کر رو دی اور ریسیور رکھ دیا۔

"...ازش بی بی" کریم بابا لگاتار آوازیں دے رہا تھا۔

"...ہیں" وہ جو بے ترتیب سی بیڈ پر پڑی تھی چونک گئی۔

"بی بی۔ اٹھیں تو غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا بابا؟"

وہ ابھی تک غنودگی میں تھی۔

"وہ جی ابھی ابھی ہسپتال سے فون آیا ہے کہ صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کیا کہا ایکسیڈنٹ۔ پپا کا۔ کہاں؟ کب؟ کیسے؟" وہ ایکدم کھڑی ہو گئی۔ "بابا کس کا فون تھا؟"

"پتہ نہیں جی۔ بس یہ کہا کہ اماں بی کو اور بڑے صاحب آپ... کے دادا جان کو بتا دوں ... مگر میں نے ان لوگوں کو نہیں بابا ابھی تک۔ سوچا پہلے آپ سے پوچھ لوں۔"

"...بابا۔ تمہاری مرضی بتا دو۔ مجھے تو ان لوگوں نے اس قابل بھی نہ سمجھا۔ خیر میں ہسپتال جا رہی ہوں۔"

کریم بابا اماں بی کو بتانے چل دیا اور وہ برق رفتاری سے ہسپتال کی طرف چل دی۔ وہ اپنے بے ترتیب حلیے کی پرواہ کیے بغیر اندر... تی چلی گئی۔ سامنے ہی رحمٰن صاحب کے کچھ دوست تھے۔

"انکل۔ پپا" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"بیٹے۔ تم ساتھ نہیں تھیں کیا؟"

"نہیں انکل۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ لوگ کہاں جا رہے تھے۔ ایکسیڈنٹ کہاں ہوا؟ انکل سب کیسے ہیں؟ جلدی بتائیے۔"

آنسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

"بیٹے تمہارے بھائی ٹیپو اور فہد کی حالت بہت نازک ہے۔ تمہارے پپا، امی، اور تمہاری پھوپی خطرے سے باہر ہیں۔ ان کے لئے دعا کرو۔"

"انکل۔ کیا یہ لوگ ہوش میں ہیں؟"

"نہیں بیٹے ابھی نہیں۔"

اتنے میں دو تین ڈاکٹر ان کے قریب آئے۔

"کہیے ڈاکٹر۔"

"...صاحب۔ آپ دو مریضوں کو اگر ان کے گروپ کا ... نہ ملا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ باقی لوگوں کو شام تک ہوش آ جا...

مگر فہد صاحب اور بچے کو خون ملنا بہت ضروری ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی تک ناکام ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ پلیز میرا خون ٹیسٹ کرلیں۔ شاید مل جائے"
وہ ایکدم ڈاکٹروں کے سامنے آگئی اور تینوں ڈاکٹروں نے حیران ہوکر اس نازک سی لڑکی کو دیکھا جو دکھ اور پریشانی سے زرد ہو رہی تھی۔

"آپ کون ہیں خاتون؟"

"ڈاکٹر صاحب پلیز میرا انٹرویو بعد میں لیجئے گا پہلے خون لے لیجئے۔"

"افوہ بھئی کیسے لیں۔ آخر آپ کون ہیں اور پھر آپ اتنی تندرست تو نہیں کہ دو مریضوں کے لیے خون دے سکیں۔"

"ارے ڈاکٹر صاحب آپ لیں تو سہی۔ ایمان سے کچھ نہیں ہوگا... اور وہ..... وہ میرے بھائی ہیں۔" وہ رو پڑی۔

"اچھا چلیئے۔"

اور وہ بھاگ کر ڈاکٹروں سے بھی آگے ہوگئی۔ پھر اچانک پلٹی۔ "انکل! کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں یہاں ہوں اور خون دے رہی ہوں۔ یہ میری التجا ہے۔"

اور سلیم صاحب سوچنے لگے۔ رحمٰن کو خدا نے کتنی پیاری بیٹی دی ہے۔ کاش میرے گھر میں ہوتی مگر رحمٰن تم نے اس کی قدر نہ کی۔

خون ٹیسٹ ہوا۔ اور ٹیپو اور فہد کی قسمت سے اس کا خون انہی کے گروپ کا تھا۔

"بی بی آپ لکھ دیں کہ آپ اپنی مرضی سے خون دے رہی ہیں ورنہ یہ ہماری ذمہ داری نہ ہوگی۔"

اور اس نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر لکھ دیا۔

"ڈاکٹر میرا کون ہے جو پوچھے گا۔ میں تو کسی کی کچھ بھی نہیں ہوں۔" وہ سوچتی رہ گئی

اور پھر رگ رگ سے اس کا لہو کھنچنے لگا اور وہ آنکھیں کھولے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائے خوشی خوشی ڈاکٹر سے کہتی رہی۔ "ڈاکٹر جتنا چاہیے لے لیں... مگر وہ لوگ بس بچ جائیں۔" اور ڈاکٹر حیران تھے کہ اس لڑکی میں اتنی ہمت اور طاقت کہاں سے آگئی۔

ڈاکٹروں نے اس کا خون مریضوں کے جسموں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی نبضیں جو ڈوب رہی تھیں واپس معمول پہ آنے لگیں۔ موت جو اپنے بھیانک پنجے گاڑنے کو ان [illegible] رہی تھی۔ اس نے [illegible] رخ بدل لیا۔

رحمٰن سمیت سب ہوش میں آگئے مگر سب تڑپ رہے تھے۔ رضیہ بیگم ڈاکٹروں سے التجائیں کر رہی تھیں کہ ٹیپو کو دکھا دیں۔ بلقیس بیگم رو رہی تھیں فہد کہاں ہے۔

"آپ کے دونوں بچوں کا خون نہیں مل رہا تھا۔ اگر چند گھنٹے اور نہ ملتا تو ان کا بچنا مشکل تھا۔ مگر ایک لڑکی نے خون دیکر آپ لوگوں پر احسان عظیم کیا ہے۔"

"کون ہے وہ ڈاکٹر صاحب؟" رحمٰن بولے۔

"معلوم نہیں۔ نام نہیں بتایا۔ مگر اتنا خون دیا ہے جو اس کی طاقت سے بہت زیادہ ہے۔"

اسی دم اماں بی اور آپا میاں داخل ہوئے۔ دونوں رو رہے تھے۔ اماں سب کو چوم رہی تھیں۔ "میرا فہد اور ٹیپو کہاں ہے۔؟"

"ان سے آپ کل مل سکیں گی۔"

"اماں۔ نازش کہاں ہے؟ کیا اسے خبر نہیں؟"

"اے بیٹا اس کا نام نہ لو۔ وہ گھر میں ہے ہی کہاں۔ کہیں آوارہ گردی کر رہی ہوگی۔"

اور رحمٰن سوچنے لگے یہ کیسی بیٹی ہے میری۔ مجھے دیکھنے تک نہ آئی۔ نجانے کیوں وہ اس وقت انہیں شدت سے یاد آرہی تھی۔

ڈاکٹر گھبرائے ہوئے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ جس کے لہو نے گھر کے بجھتے چراغوں کو دوبارہ روشن کیا تھا۔ خود بے جان ہوتی جارہی تھی۔ خون کی زبردست کمی کی وجہ سے وہ مسلسل بے ہوش تھی۔

دوسرے دن اس کی فلائٹ تھی۔ مگر جب اس کی طرف سے ناہید کو کوئی پیغام نہ ملا تو وہ گھبراگئی۔ وہاں کریم بابا سے پتہ چلا کہ وہ تو کل سے ہسپتال گئی تھی۔ پھر معلوم نہیں کہاں ہے۔ وہ بھی خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ ہسپتال پہنچ کر وہ دوڑتی ہوئی ہر کمرے میں نازش کو تلاش کرنے لگی۔ جب رحمٰن صاحب کے پرائیویٹ کمرے میں پہنچی تو سب زخمی بہتر تھے۔ اس نے سب کا حال پوچھا۔

"انکل خدا کا شکر ہے آپ سب لوگ ٹھیک ہیں مگر یہ ہوا کیسے؟"

"بس بیٹے۔ صبح کے وقت بہت دھند تھی۔ سامنے سے آتا ہوا ٹرک فہد کو نظر نہ آیا اور جب قریب پہنچنے پر بچایا تو گاڑی

ایک کھڈ میں گر گئی۔ چونکہ ٹیپو اور فہد ہی آگے تھے اسلئے زیادہ چوٹیں آئیں۔ مگر شکر ہے کسی فرشتہ صفت لڑکی کی قربانی سے یہ بچ سکے گئے۔"

"کیا مطلب؟" ناہید چونکی۔

"معلوم نہیں کون لڑکی ہے جس نے اپنا خون دیا اور ابھی ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ اب اس کی حالت بہت خراب ہے شاید اس بدنصیب کا کوئی نہیں ہے۔"

"ٹھہریں انکل میں دیکھتی ہوں۔"

نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ نازش ہی ہوگی۔

وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ "انکل۔ نازش کہاں ہے؟" اس نے ایک لمحے کو رک کر پوچھا۔

"معلوم نہیں کہاں ہے۔ اس سے ابھی تو تم ہو کر دیکھنے تو آئیں۔ ایک وہ کم بخت بیٹی ہے۔" رضیہ بیگم رحمٰن سے پہلے بول اٹھیں۔

"ڈاکٹر صاحب۔ کیا آپ مجھے اس لڑکی سے ملوا سکتے ہیں جس نے خون دیا ہے؟" ناہید نے ایک ڈاکٹر کو روک کر کہا۔

"جی۔ مگر آپ کون ہیں؟ ابھی تک تو اس کے لئے کوئی نہیں آیا۔ شاید وہ لاوارث ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میں اس کی دوست ہوں۔"

"اچھا خیر آیئے۔"

ناہید تیزی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔

"نازش!" وہ چیخ اٹھی اور دوڑتی ہوئی نازش کے خاموش اور ساکت وجود سے لپٹ گئی۔ اس کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ "نازش! ناز! خدارا ہوش میں آؤ۔ تم نے ان پتھروں کے لئے اتنی بڑی قربانی دے دی جو تمہیں اتنا برا سمجھتے ہیں۔"

اس کے آنسو نازش کی پیشانی پر گر رہے تھے۔ نازش نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ "ناہید سب ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں ہاں سب ٹھیک ہیں سوائے تمہارے۔"

"ناہید۔ میری سیٹ کینسل کروا دو۔ میں شاید اب نہ جا سکوں۔ مجھ میں اب ایک قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"میں جا کر ابھی انکل کو بتاتی ہوں کہ نازش یہاں ہے۔ آپ کی بدنصیب اور لاوارث ہستی جس نے دو انسانوں کی جان بچائی۔"

"پلیز ناہید کسی کو نہ بتاؤ۔"

مگر ناہید کھلے دروازے سے نکل چکی تھی۔

"انکل۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ اگر آپ ملنا چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔" اس نے ضبط سے کہا۔

"میں بھی اس کا شکریہ ادا کروں گا۔" فہد بولے۔ سب اس سے ملنے کو بے تاب نظر آ رہے تھے۔

سب ناہید کے ساتھ نازش کے کمرے میں داخل ہوئے

"پہچانیئے آپ سب۔ یہ ہے وہ لاوارث لڑکی جس کا لہو اتنا سستا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کی پرواہ کئے بغیر دے ڈالا۔" ناہید رندھی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

سب حیرت اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔

"میری بچی۔ یہ تم نے کیا کیا؟" رحمٰن صاحب بے تحاشہ اس کی طرف بڑھے۔ یہ ان کی نازش تھی جس کے سارے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ پیشانی پر بے شمار پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"کیا یہ آپ کی بیٹی ہے؟" ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں ڈاکٹر۔ یہ میری بیٹی ہے۔ اسے بچا لیجئے۔ اب میرے خون کا قطرہ قطرہ لے لیں مگر۔۔۔"

"دیکھیں ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ میں سے کسی کا خون لینا ناممکن ہے۔"

رضیہ بیگم، بلقیس دونوں اس کے قدموں کے قریب بیٹھی تھیں۔

"حیرت ہے۔ انھوں نے تو لکھ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے اس کے بازو میں سوئی چبھوتے ہوئے کہا۔

فہد بھی نرسوں کے سہارے وہاں آ گئے تھے۔ نازش کو دیکھ کر وہ لڑکھڑا گئے۔

ڈاکٹر اپنی تمام کوششیں کر کر کے ہار رہے تھے۔ پھر اس کی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ مندی مندی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ اپنے اور پرائے لوگوں کو وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نازش! ناز! بیٹے ہوش میں آؤ۔ میں تمہارا پاپا ہوں۔ مجھے پہچانو۔" رحمٰن صاحب رو رہے تھے۔

"پاپا!" ایک سرگوشی اس کے سرخ ہونٹوں سے آزاد ہوگئی پھر اس کی بے نور آنکھیں قریب بیٹھے فہد پر ٹک گئیں۔

"پپا! مجھے سب لوگ معاف کر دینا۔ میں... میں .... وہ نہیں تھی جو آپ لوگ سمجھتے تھے۔"

وہ ٹوٹتی اور پھولی سانسوں میں لفظ لفظ ادا کر رہی تھی۔

"اتنا مت بولو میری بچی۔ اب میں تمہارے سارے شکوے دور کر دوں گا۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

رضیہ بیگم اور بلقیس بھی اس کے نزدیک آگئیں۔

"آپ لوگوں کو مجھ سے گلہ تھا نا؟ اب سارے گلے دور ہو جائیں گے۔ میں اپنی مما کے پاس جا رہی ہوں۔"

"نہیں بیٹے۔ تم تو میری عاشی کی نشانی ہو۔ میرے حسین لمحوں کی یادگار ہو۔ عاشی کی وفا کی خوشبو ہو۔ میں عاشی کو کیا جواب دوں گا۔"

"آپ کچھ نہ کہئے گا پپا۔ میں ہی سب کہہ دوں گی مما سے کہ.... کہ .... مما..... میرے لاکھ چاہنے کے باوجود فاصلے نہ مٹ سکے .... میرے وجود کو آج تک کسی نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ آپ نے مشرق اور مغرب کا ملن کیوں چاہا تھا۔ جب یہاں کے سب لوگ آپ سے دغا کی توقع رکھتے تھے تو آپ نے وفائیں کیوں کی؟ — آپ سب لوگ تو مجھے اپنے سے جدا سمجھتے تھے۔ عاشی کی بیٹی سمجھتے تھے۔ پھر— پھر جواب دیں کہ میرا خون ٹیپو کے خون سے کیسے مل گیا؟ فہد کی رگوں میں زندگی بن کر کیوں دوڑ رہا ہے؟ — پپا میرا لہو آپ کا ہی تو تھا مگر— آپ نے کبھی پہچانا ہی نہیں۔ فاصلے ایسے تو نہ تھے جو نہ مٹ سکیں مگر... مگر۔"

اب وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ اور اب بولنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ سو اس نے خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔ سب کچھ نہ کچھ بولنا چاہ رہے تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگ لے۔ مگر اس نے کسی کو اتنی مہلت ہی نہ دی۔

اس کا بے جان وجود وہیں تھا سب کے پاس۔ مگر روح اور جسم کا ناطہ ٹوٹتے ہی اتنی دوریاں ہو گئی تھیں جو قیامت تک نہ پاٹی جا سکتی تھیں۔ اور اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔



ہم نے تصویرِ بتاں دل میں چھپا رکھی تھی



رضوانہ خان

اس نے ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے یاسر لاج کے بڑے سے آہنی گیٹ میں قدم رکھا یوں تو اس گھر کی خاص الخاص مکین سلطانہ بیگم اس کے ساتھ تھیں مگر مارے سہم کے اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا نیا گھر نیا ماحول اور نئے لوگ اس کو راس آسکیں گے یا نہیں وہ ان میں ایڈجسٹ ہوسکے گی یا نہیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ وہ سخت ہراساں ہو رہی تھی۔ اس کو جھجکتے دیکھ کر سلطانہ بیگم نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کو قدرے ڈھارس ہوئی اور وہ ان کی ہمراہی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لان عبور کر کے ڈرائینگ روم میں پہنچ گئی۔

مگر ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی وہ بری طرح چونک پڑی۔ ایک نہایت ہی خوبرو، پرکشش اور اسمارٹ سا نوجوان سامنے ہی صوفے پر نہایت ٹھاٹ سے نیم دراز تھا۔

"ارے یاسر بیٹے تم۔" سلطانہ بیگم اس کا ہاتھ چھوڑ کر تیر کی طرح اس کی طرف لپکیں تو وہ تیزی سے اٹھ کر ان سے لپٹ گیا

"تم کب آئے بیٹے۔" انہوں نے بڑی محبت سے اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔

"ابھی تقریباً ایک گھنٹہ پہلے" اس نے ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی بیٹے۔" انہوں نے شکایت کی۔

"میں نے سوچا آپ کو سرپرائز دی جائے۔" وہ شوخی سے مسکرایا پھر اچانک ہی اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دروازے میں کھڑی اس لڑکی پر جم گئیں جو اپنی آنکھوں میں دنیا بھر کی حیرانی چھپائے کچھ الجھی الجھی سی کھڑی تھی۔

"یہ کون ہیں امی۔" اس نے حیرانی سے پوچھا تو سلطانہ بیگم بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں ورنہ بیٹے کے آنے کی خوشی میں تو وہ اسے تقریباً فراموش کر چکی تھیں۔

"ادھر آؤ نا بیٹی وہاں کیوں کھڑی ہو۔" انہوں نے شفقت سے بلایا تو وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی انکے قریب آگئی۔

یاسر ابھی تک سوالیہ نظروں سے انکی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ارے اسے نہیں پہچانا بیٹے یہ صنم ہے حمید بھائی کی لڑکی۔" انہوں نے اس کے سوال کے جواب میں اسکا مکمل تعارف کروایا۔

"اوہ۔" اس نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔ "انکی یہاں تشریف آوری کا مقصد۔" اس نے عام سے لہجے میں اس کے آنے کی وجہ پوچھنا چاہی مگر صنم بری طرح سٹپٹا گئی۔ یاسر کا لہجہ اسے ناگواری اور بیزاری سے بھرپور لگا جیسے وہ اس کے یہاں رہنے پر معترض ہے۔

"بیٹے یہ اکیلی تھی پھر میں تنہا تھی اسی لیے اسے اپنے ساتھ لے آئی کہ ہم دونوں ملکر رہیں گے تو دونوں ہی کی تنہائی دور ہو جائے گی۔" انہوں نے اس کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے گول مول سا جواب دیا پھر اس سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"چلو بیٹی تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ اپنا گھر سمجھ کر رہنا کسی بات میں تکلف نہ کرنا ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔" وہ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھیں تو یاسر چڑ سا گیا۔ وہ جو اس وقت ان کی بھرپور توجہ کا متمنی تھا انکی توجہ بٹتی دیکھ کر ناگواری سے بڑبڑایا۔

"اونہہ اپنے بیٹے کی ذرا پرواہ نہیں ہے اور غیروں کے لاڈ کئے جا رہے ہیں۔"

اس کی آواز کافی تیز تھی دونوں نے بخوبی سنی سلطانہ بیگم تو اس کی بات پر زور سے ہنس پڑیں مگر وہ دہل کر رہ گئی۔

یا اللہ اگر یہ اسی طرح مجھ سے چڑتا رہا ناگواری اور بیزاری کا اظہار کرتا رہا تو میں یہاں کیسے رہوں گی یہ اتنے ڈھیر سارے دن زندگی کے کیسے کاٹوں گی دوسروں کے طنز اور طعنوں کا نشانہ بننے سے بہتر یہی ہے کہ میں واپس چلی جاؤں تنہا ہی زندگی گذاروں۔ وہ سخت پریشانی کے عالم میں سوچتی ہوئی ان کے ساتھ چل رہی تھی کہ اچانک سلطانہ بیگم کی آواز پر چونک پڑی۔

"بیٹی یہ ہے تمہارا کمرہ خوب دیکھ بھال لو اگر پسند نہ ہو

تو دوسرا کمرہ سیٹ کراؤ۔"

"جی جی یہ تو ٹھیک ہے مگر......" وہ ان کے محبت آمیز برتاؤ کے پیش نظر کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو بیٹی کیا بات ہے۔" انہوں نے اس کو رکتے دیکھ کر شفقت سے پوچھا۔

"وہ دراصل میں یہ سوچ رہی ہوں کہ واپس چلی جاؤں۔" اس نے آہستہ آہستہ انکی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟" سلطانہ بیگم حیران رہ گئیں۔ "ابکا ایکی یہ خیال کیونکر آیا تمہیں جبکہ ابھی تو میرے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی تھیں؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھ کر بولیں۔



"وہ شاید یاسر صاحب کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں،" نہایت معصومیت سے اس نے اپنے تردد کی وجہ انہیں بتا دی۔

"ارے پگلی۔" وہ ایکدم ہنس پڑیں۔ "اس کی بات کا برا مان لیا تم نے۔ اس کی تو یونہی مذاق کرنے کی عادت ہے ہر ایک کو تنگ کرنا ہی تو اس کا دلچسپ مشغلہ ہے۔" بڑی محبت سے اسے گلے لگا کر کہا تو بے اختیار ہی اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

"بے وقوف ہو بالکل تم۔" انہوں نے پیار سے اسکے آنسو پونچھے۔ "چلو منہ دھو کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں اتنے میں چائے کے لئے کہہ دوں۔" وہ محبت سے کہتی ہوئی باہر نکل گئیں تو اس نے جلدی جلدی دوپٹہ سے اپنے مسلسل رواں اشکوں کو رگڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔

کافی بڑا تھا یہ کمرہ اور نہایت خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا ہلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے دروازوں اور کھڑکیوں سے لٹک رہے تھے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بیڈ لگا تھا سرہانے ایک کرسی اور میز دھری تھی جس پر ایک انتہائی خوبصورت ٹیبل لیمپ رکھا تھا بیڈ کے دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ایک کپڑوں کی الماری اور بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ دو فوم کے صوفے پڑے تھے کمرے سے ملحقہ ٹوائلٹ تھا۔ اس نے تعریفی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر دروازے کا پردہ برابر کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ تنہائی ملی تو پریشان کن سوچیں پوری طرح اس کے دماغ پر حاوی ہو گئیں۔

وہ بہت چھوٹی سی تھی چھ یا سات ماہ کی جب اس کی امی کا انتقال ہو گیا تھا خاندان والوں نے گھر بار کو سنبھالنے اور بچی کی پرورش کرنے کی خاطر اس کے ابو کو دوسری شادی کا مشورہ دیا بلکہ کافی زور بھی دیا مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی وہ اپنی معصوم پیاری اور بے حد لاڈلی بیٹی کو سوتیلی ماں کے حوالے کرنے پر قطعی رضامند نہیں تھے اسی لئے انہوں نے اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کر بھی پالنے کا مصمم ارادہ کر لیا وہ ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی دو نوکر تو پہلے سے ہی موجود تھے مگر صنم کی امی کی وفات کے بعد انہوں نے بہت چھان پھٹک کر ایک فرشتہ نما نیک پرخلوص بوڑھی آیا اس کی دیکھ بھال کی غرض سے رکھ لی۔ جیسے خوبصورت سی گول مٹول بچی پر ٹوٹ کر پیار آیا اور یوں وہ آیا اور ابو کی محبت میں پروان چڑھنے لگی ابو جب تک آفس میں ہوتے وہ آیا کے ساتھ لگی رہتی اور آفس سے آنے کے بعد تو ابو اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا نہ کرتے روزانہ شام کو اس کو سیر کرانے لے جاتے ڈھیر ساری ٹافیاں اور کھلونے خرید کر دیتے وہ بہت خوش رہتی ہر دم چہکتی پھرتی ذرا سمجھدار ہوئی تو انہوں نے اس کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور اس نے بھی کبھی ان کو مایوس نہیں کیا ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ آئی شرارتوں کے علاوہ اور کوئی بری عادت نہ تھی اس میں۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا جب اس نے میٹرک کیا تو ضعیف آیا بھی اسکا ساتھ چھوڑ گئیں وہ ان کی موت پر بکھر سی گئی مگر ایسے کٹھن وقت میں ابو نے اس کو بھرپور طریقے سے سنبھالا، آیا کے بعد اس کی محبتوں اور شفقتوں کا واحد مرکز ابو ہی تھے جو اس پر پوری توجہ دیتے تھے اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے اس کی ذرا سی بھی تکلیف کو اپنے دل سے محسوس کرتے تھے۔ جب وہ انٹر میں پہنچی تو اس کے ابو کا ٹرانسفر کراچی کر دیا گیا اور یہیں پر سلطانہ بیگم نے ان کے یہاں آنا شروع کیا ابو نے اسے بتایا کہ سلطانہ بیگم اس کی دور کی پھوپی ہیں مگر وہ دور کی تو کسی طرح بھی نہیں لگتی تھیں ابو کو بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح چاہتی تھیں اور اس کو بھی بہت پیار کرتی تھیں بیوہ ہو چکی تھیں ایک بیٹا تھا جو باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ بہت ہی نیک دل اور مہربان خاتون تھیں صنم کو وہ بہت پسند تھیں شاید اس لئے کہ انکے علاوہ وہ اور کسی خاندان والے کو جانتی بھی نہ تھی ابو کے کوئی سگا بہن بھائی تو تھا ہی نہیں اور جو دور کے تھے ابو ان سے اپنی بیگم کی وفات کے بعد ہی کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے ان کو اتنی فرصت ہی کب تھی کہ وہ صنم یا سروس کے علاوہ کسی اور پر توجہ دیتے۔ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باعث خاندان والوں کے یہاں جانا بند کیا تو خاندان والوں نے بھی انکے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ ابو کو انکی پرواہ بھی نہ تھی وہ تو بس ہر وقت صنم میں مگن رہتے ہاں اب جب سے سلطانہ بیگم نے انکے یہاں آنا شروع کیا انہیں خاندان کی تھوڑی بہت خبریں بھی ملنے لگیں جنہیں وہ بغیر کسی دلچسپی یا تجسس کے سن لیتے البتہ وہ سلطانہ بیگم کی بہت عزت کرتے تھے وہ اتنے خلوص سے ملتیں کہ انہیں غیریت کا احساس ہی نہ رہتا بالکل بڑی بہنوں کی طرح انکا کہنا مانتے تھے ان کا

ہر طرح سے خیال رکھتے۔

دن ہنسی خوشی گذرتے رہے۔ صنم بی اے کرنے کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی سوچ رہی تھی کہ اچانک ایک دن یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ اس کے ابو کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو گئے ہیں بہت علاج معالجہ ہوا صنم نے اپنے پیارے ابو کی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کے آگے سربسجود ہو کر لاکھوں دعائیں مانگیں، منتیں مانگیں خیرات بانٹی مگر خدا کی مرضی میں بھلا کون دخل دے سکتا ہے مرض روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

حمید صاحب کو اپنی زندگی سے زیادہ صنم کی فکر تھی ابھی تو وہ تعلیم بھی مکمل نہ کر پائی تھی اپنے گھر بار کی بھی نہ ہو پائی تھی وہ پہروں اس کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے مگر اب کیا ہو سکتا تھا ان کا آخری وقت آچکا تھا دم رخصت انہوں نے سلطانہ بیگم کو ہی اس کا ہاتھ تھمایا تھا اس کا وارث ٹھہرایا تھا اور اس کا بھرپور خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور یوں سلطانہ بیگم نے ان کی موت کے ایک ہفتے بعد اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

ابو کی موت کے بعد وہ ایکدم بجھ کر رہ گئی تھی اپنی محرومیوں کا احساس اسے اب بڑی شدت سے ہونے لگا تھا، سلطانہ بیگم ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگی رہتیں اسے بہلانے کو گھمانے پھرانے لے جاتیں مگر وہ بالکل بے جان بت کی مانند ہو گئی تھی مسکراہٹ تو ہونٹوں سے چھن ہی چکی تھی بات بھی بہت کم کرتی، سلطانہ بیگم خوش رہنے کو کہتیں تو بے اختیار رونے لگتی، ایسی حالت میں جب سلطانہ بیگم نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بکھر کر رہ گئی مزید پریشان ہو گئی اس کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جائے وہ گھر جہاں اس کے پیارے ابو ہوتے تھے اس سے گھنٹوں پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے رات رات گئے تک ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر اس سے مختلف موضوعات پر بالکل دوستوں کی طرح بحث و مباحثہ کرتے تھے یہ گھر جہاں کے ایک ایک کمرے سے ایک ایک چپے سے ابو کی یادوابستہ تھی تو پھر وہ یہ گھر چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی بھلا۔ وہ ان کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی بس آنسو آنکھوں سے بہتے رہے۔

"بیٹی جوان لڑکی کا نوکروں کے ساتھ تنہا رہنا ٹھیک نہیں" انہوں نے پیار سے سمجھایا تو اسے انکی بات معقول لگی واقعی وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی کیسے رہ سکے گی وہ جو بہادر بھی نہیں بڑی ڈرپوک قسم کی لڑکی تھی ذرا سے کھڑکے پر ڈر جاتی تھی ذرا سی آہٹ پر سہم جاتی تھی اور بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سن کر تو اس کا دم ہی نکل جاتا تھا پہلے تو اس کو ابو کا مضبوط سہارا حاصل تھا جو اس کو ڈرتے دیکھ کر ہزاروں تسلیاں اور دلاسے دیتے تھے طرح طرح سے بہلاتے تھے اور اگر پھر بھی ڈر کم نہ ہوتو ساری ساری رات اس کے سرہانے جاگ کر گذار دیتے تھے مگر اب وہ کیا کرتی ڈر لگتا تو کس کے پاس جاتی کس کا سہارا تلاش کرتی یہی سب سوچ کر وہ چاروناچار انکے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی۔

مگر یہاں آکر تو پہلے ہی دن اس پر نئی افتاد آپڑی تھی یاسر کا ناگوار ناگوار، بیزار بیزار اور اکتایا اکتایا سا رویہ اس کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا اگر وہ ایسے ہی بگڑا بگڑا اکھڑا اکھڑا رہا تو وہ یہاں سکون سے کیسے رہ سکے گی اپنی زندگی کے یہ مشکل، پیچیدہ اور پریشان کن دن کیسے گزارے گی۔

وہ نجانے کب سے پڑی سوچ سوچ کر الجھ رہی تھی کہ دستک کی آواز پر چونک پڑی۔

"کون ہے؟" اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"وہ جی آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔" باہر سے نوکر کی آواز آئی۔

"اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔" اس کو جواب دے کر وہ بڑی سرعت سے اٹھی ٹوائلیٹ میں جا کر جلدی جلدی دو چار پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور تولیہ سے منہ پونچھ کر باہر نکل آئی سامنے سے یاسر چلا آرہا تھا بادامی رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس بال بھیگے ہوئے مگر سلیقے سے جمے تھے شاید ابھی نہا کر نکلا ہے اس نے دل میں سوچا اور پھر اس کو نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی

مگر وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا عین اس کے مقابل تن کر کھڑا ہو گیا۔

"لگادی امی سے شکایت آتے ہی پڑوادی مجھ پر ڈانٹ۔" نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا

وہ صرف بے بسی سے پلکیں جھپکاتی رہ گئی اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"اب یہ بھی کہہ دینا اچھا۔" اس کو خاموش کھڑے دیکھ کر اس نے ایک اور وار کیا۔

وہ پہلے بھی چپ رہی تھی [illegible] بھی کیا نہ بولتے ہیں تو وہ اتنے طنز کر رہا ہے اور جو بول دیتی تو پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالتا۔

وہ ایک دو لمحے تک کھڑا اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا رہا پھر اسی کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر خود ہی چلا گیا۔

اور صنم جو اس کے اس بری طرح پیچھے پڑ جانے سے سخت ہراساں ہو گئی تھی دل ہی دل میں اس پریشانی سے نجات پانے کی دعائیں مانگتی ہوئی مرے مرے قدموں سے لان کی طرف بڑھ گئی مگر پھر خلاف توقع اس نے چائے اور کھانے پر کوئی طنز نہ کیا سنجیدہ بنا سلطانہ بیگم سے باتیں کرتا رہا وہ بھی ان کی باتوں میں کوئی دخل دیئے بغیر دونوں وقت خاموشی سے انکا ساتھ دیتی رہی یوں یا سر لاج میں اس کا پہلا دن نہایت پریشانی بوریت اور الجھن میں گذرا۔

دوسری صبح یاسر کی آنکھ بہت جلدی کھل وہ تازہ ہوا کھانے کے لئے لان میں نکلا تو سامنے والی کھڑکی میں نیلا آنچل لہراتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونک گیا مگر دوسرے ہی لمحے اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی وہ صنم تھی اور نماز پڑھ رہی تھی نیلے دوپٹے میں لپٹا ہوا اس کا اجلا اجلا چہرہ ایسی پاکیزہ اور معصومیت کا احساس دلا رہا تھا کہ وہ اس پر سے نظر ہی نہ ہٹا سکا یہ لڑکی جو پہلی ہی نظر میں اپنی آنکھوں میں جہاں بھر کی حیرانی چھپائے ڈری سہمی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی جیسے پہلی ہی بار دیکھتے ہی اپنائیت کا بھرپور احساس جاگا تھا اور بے اختیار دل چاہا تھا کہ اسے ستائے پریشان کرے اور اس سے خوب جھگڑے وہ جو گھر میں کسی بہن بھائی کے نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کے پیار بھرے جھگڑوں سے لطف اندوز نہ ہو سکا تھا اس معاملے میں ایک قسم کی احساس محرومی کا شکار تھا اسے دیکھ کر بے اختیار اپنی یہ حسرت نکال لینے کو مچل اٹھا تھا اسی لئے تو سارے تکلف اور مہمانداری کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ایکدم ہی اس سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا اور پھر امی کی زبانی اس کی کہانی سن کر اسے اس پر اور بھی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ "میں اس کی تمام محرومیوں کو اپنی بے لوث محبت سے دور کردوں گا اس کی زندگی سے اداسیاں مٹا ڈالوں گا اور اسے اتنا پیار کروں گا کہ جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکے گی۔" یہ عزم اس نے اسی لمحے کر لیا تھا۔

وہ جانے کب سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے مختلف باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک صنم نے سلام پھیر کر اسکی طرف نگاہ اٹھائی دونوں کی نظریں ملیں تو یاسر اپنی محویت پر خفیف سا ہو کر آگے بڑھ گیا گیٹ پر کچھ دیر ٹھہر کر جب وہ واپس جانے کے لئے اس کی کھڑکی کے قریب سے گذرا تو اندر سے نہایت ترنم سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آرہی تھی وہ متاثر ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

ناشتے کی میز پر وہ نہایت شرارت سے سلطانہ بیگم سے مخاطب ہوا۔

"امی وہ جو لان کی طرف والا بڑا کمرہ ہے اس میں کچھ اثر وغیرہ ہو گیا ہے کیا۔؟" مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بڑی سنجیدگی سے اس نے پوچھا۔

"کیوں؟" سلطانہ بیگم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "کیا ہوا؟"

"صبح میں ادھر سے گذرا تو اندر سے من من من آوازیں آرہی تھیں شاید کوئی چڑیل بول رہی تھی۔" اس نے شرارت سے کہہ کر صنم کی طرف دیکھا جو بظاہر تو لاتعلق بنی ناشتہ کر رہی تھی مگر دل ہی دل میں اس کا مطلب سمجھ کر کھول گئی تھی۔

"پاگل ہوتے ہو کیا۔" سلطانہ بیگم ہنس پڑیں۔ "وہ کمرہ تو صنم کا ہے اس میں....."

"بس بس امی۔" وہ تیزی سے انکی بات کاٹ کر بولا۔ "پھر تو بات واضح ہو گئی۔"

"کیا؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

"یہی کہ یہ تو بذات خود ایک چڑیل ہیں یہی منمنا رہی ہونگی" وہ سنجیدگی سے بولا تو امی نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کیا اور اس کی دل شکنی کے خیال سے جلدی سے بولیں۔

"واہ میری بیٹی تو پری ہے پری۔ تم خود ہی بھوت ہوگے۔"

"واہ واہ امی۔" وہ بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔ "چڑیل، پری بھوت کیا جوڑ ملایا ہے آپ نے۔" ہنستے ہنستے کہہ کر ایک شوخ نظر صنم پر ڈالی مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا وہ مارے احساس توہین اور بے بسی سے سر جھکائے بڑی روانی سے آنسو بہا رہی تھی وہ شرمندہ سا ہو گیا اس نے تو محض مذاق کیا تھا اسے رلانا یا دکھ پہنچانا ہرگز مقصود نہیں تھا۔

اس کو سنجیدہ دیکھ کر سلطانہ بیگم بھی صنم کی طرف متوجہ ہو گئیں اور پھر اس کو آنسو بہاتے دیکھ کر ایکدم ہی یاسر پر بگڑ اٹھیں۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم اس سے ایسے مذاق نہ

کرنا وہ پہلے ہی پریشان ہے نا کہ تم اسے اور پریشان کر [illegible] ہو اگر وہ ایسے ہی روتی دھوتی رہی تو میں خدا کے یہاں کیا [illegible] دکھاؤں گی کہ ایک ذرا سی بچی کو خوش نہ رکھ سکی۔" انہوں [illegible] سے سختی سے ڈانٹا تو اس نے رونا دھونا بھول کر ڈر [illegible] تے یاسر کی جانب دیکھا جو ناشتہ واشتہ چھوڑ چھاڑ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"یا اللہ انہیں پھر میری وجہ سے ڈانٹ پڑ گئی اب تو یہ مجھ سے اور بھی خار کھا جائیں گے۔" اس نے سہم کر سوچا۔

سلطانہ بیگم کے بگڑ جانے سے ماحول بڑا مکدر ہو گیا یاسر ادھورا ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا تو وہ اور سٹپٹا گئی خواہ مخواہ دونوں ماں بیٹے لڑ گئے اب مجھے اپنے آپ پر قابو پانا چاہیے یاسر کی باتوں کو نظر انداز کر دینا ہی چاہیے یہی بہتر ہے ورنہ اگر ایسے روز روز جھگڑے ہوتے رہے تو کام کیسے چلے گا پھوپھی جان بھی مجھ سے بیزار ہو جائیں گی کہ میری وجہ سے انکے بیٹے کو روز روز ڈانٹ پڑے گی۔ وہ اپنی سوچوں میں الجھتی ہوئی کھڑی ہو گئی تو سلطانہ بیگم نے اسے ٹوک دیا۔

"کہاں جا رہی ہو صنم ٹھیک طرح ناشتہ کرو۔" انکے محبت بھرے لہجے پر وہ شرمندہ ہو گئی۔

"پھوپھی جان میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ [illegible] سے خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو گئی۔" نظریں جھکا کر وہ خجل سے لہجے [illegible]

"ارے نہیں بیٹی تم آرام سے بیٹھو وہ یونہی ذرا [illegible] گیا ہے ابھی دیکھنا دو منٹ بعد ہی ٹھیک ہو جائے گا [illegible] عادت اچھی طرح جانتی ہوں۔" انہوں نے ہنس کر کہا تو وہ [illegible] دوبارہ بیٹھ گئی۔

اور واقعی انہوں نے ٹھیک کہا تھا ناشتے وغیرہ [illegible] سے فارغ ہونے کے تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈرائینگ روم [illegible] اخبار پڑھ رہی تھی تو وہ نہایت آہستگی سے کمرے میں آ [illegible] سے خبر تو جب ہوئی جب اس کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔

"ہوں تو مجھے ڈانٹ پڑوا کر خود آرام سے بیٹھی [illegible] فرما رہی ہیں۔"

اس کی آواز سن کر وہ چونک پڑی مگر اسے [illegible] جواب دینا بیکار تھا لہٰذا اخبار رکھ کر خاموشی سے اٹھ کر باہر چل دی۔

"کہاں چلیں۔" اسے جاتے دیکھ کر وہ تیزی سے بولا اور صنم کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی اس سے نظریں ملانے کی تاب نہ رہی تھی وہ بڑی قہر آلود نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"دوسروں کو ڈانٹ پڑوانے میں ماہر ہیں خود ڈانٹ سننے کا وقت آیا تو کہیں چل گئے۔" اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

"مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو ڈانٹ پڑ گئی۔" اس سے جان چھڑانے کو وہ جلدی سے بولی۔

"صرف افسوس سے کیا ہوتا ہے۔" اس نے سختی سے پوچھا۔

وہ چپ رہی کوئی جواب نہ بن پڑا ویسے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ عجیب ہے یہ شخص معافی بھی مانگو تو اکڑتا ہے معذرت بھی چاہو تو بگڑتا ہے۔

"جواب دو نا۔" اسے خاموش دیکھ کر اس نے جیسے حکم دیا۔

"کیا جواب دوں؟" صنم نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ یاسر نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی مسکراہٹ چھپانے کو ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"میں نے ذرا سا چڑیل کہہ دیا تو بہت برا لگا بہت حسین سمجھتی ہو اپنے آپ کو۔" وہ تمسخر سے بولا تو صنم کھول کر رہ گئی یہ شخص قدم قدم پر اس کی توہین و تذلیل کر رہا ہے اس کی انا پر مسلسل ضربیں مار رہا ہے دل چاہا اسے کوئی کرارا سا جواب دے مگر اپنی مجبوری اپنی بے بسی کی وجہ سے دل پر جبر کر لیا کہ اس کو جواب دینا تو موت کو دعوت دینے یا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہوتا۔

"بولو نا بہت ناز ہے اپنے حسن پر۔" اس کی خاموشی پر چڑ کر اس نے پھر چھیڑا دل ہی دل میں کھسیا رہا تھا کہ عجیب مٹی کی مادھو ہے یہ لڑکی کچھ بھی کہو لڑتی ہی نہیں جواب ہی نہیں دیتی

"آپ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بس رو دو رو دو۔" وہ تلملا کر رہ گیا۔ "تمہیں رونے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے نہ لڑنا نہ بگڑنا۔" جھنجلا کر وہ بولا۔

"جی۔" وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ کیسی باتیں کر رہا ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"جی۔" بڑے معنی خیز انداز میں کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو صنم نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

اف توبہ کتنی سحر انگیز آنکھیں ہیں اور شخصیت بھی تو بڑی

دلکش اور متاثر کن ہے کاش کہ وہ ایسا چڑچڑا اور جھگڑالو نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس کے دل میں نجانے کونسی انوکھی حسرت جاگی کہ وہ خود ہی سٹپٹا گئی۔ نہیں نہیں مجھے کیا جیسا بھی ہو جو بھی مجھے بھلا کیا غرض۔ وہ گھبرا گھبرا کر اپنی خواہش کی خود ہی نفی کرنے لگی۔

یاسر جو غور سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے اس کے تاثرات جاننے کی کوشش کر رہا تھا کچھ نہ سمجھ کر پھر جھنجھلا گیا۔

"تمہارے سر میں عقل نام کی بھی کوئی چیز ہے یا صرف بھُس ہی بھرا ہے۔"

اس کے جھنجھلانے پر وہ صرف ایک نظرِ غلط اس پر ڈال کر رہ گئی۔

"روزانہ بادام گھس کر کھایا کرو جب عقل آجائے تب بات کرنا مجھ سے۔" اس نے بیزاری سے ہاتھ اٹھا کر اسے باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ دل ہی دل میں اسے سینکڑوں صلواتیں سناتی باہر چلی آئی۔

اونہہ جیسے میں ہی تو مری جا رہی تھی ان سے بات کرنے ان کو مخاطب کرنے میری جوتی کو غرض پڑی ہے جو ان جیسے بدمزاج اور چڑچڑے انسان کو منہ لگائے۔

اس دن سلطانہ بیگم نے اپنے بیٹے کی بمعہ انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ واپسی کی خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ صنم نے ہر کام میں انکا بھرپور ہاتھ بٹایا گو کہ کام کے دوران بھی یاسر مسلسل اس پر طنز و طعنے کے تیر برساتا رہا الٹی سیدھی باتیں کر کے اسے چڑاتا رہا مگر اس نے ذرا پروا نہ کی صبر و ضبط کی مکمل تصویر بنی اپنے کام میں مشغول رہی کہ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ تمام انتظامات مکمل کر کے وہ سلطانہ بیگم کے حکم پر کپڑے بدلنے چل دی مگر تیار ہونے کے بعد وہ عجیب مخمصے میں پھنس گئی باہر مہمان آنا شروع ہو گئے تھے تقریباً آدھا گھر مہمانوں سے بھر چکا تھا اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی الجھ رہی تھی کہ باہر کیسے جائے اتنے سارے اجنبی اور انجان لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کیسے کرے کیا پتہ وہ اس کے بارے میں کیا خیال کریں کیسی باتیں بنائیں۔

وہ سوچ سوچ کر گھبرائی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں اپنی ہمت باندھ رہی تھی کہ یاسر بہت تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا مگر ایکدم ہی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ گلابی رنگ کی جدولی کی کامدار بارڈر والی ساڑھی باندھے اور ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ اتنی سندر لگ رہی تھی کہ یاسر کے من میں ایکدم ہی ہلچل مچ گئی یہ روپ یہ نکھار یہ حسن آج سے پہلے اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا چمکیلے بھڑکیلے کپڑے اور میک اپ سے لپے پتے چہرے دیکھ دیکھ کر اس کا دل اوب گیا تھا اس کی سادگی میں بھی وہ حسن تھا کہ یاسر مسحور ہو کر رہ گیا بھرپور ستائشی نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اسے اپنی نگاہوں کے راستے اپنے دل میں جذب کر لینا چاہتا تھا مگر اس کے والہانہ ستائشی انداز اور بہت کچھ کہتی دل میں اترتی نگاہوں کی تپش سے جھینپ کر صنم نے رخ موڑا تو وہ چونک اٹھا۔

"یہ کیا یہ محویت یہ بے خبری خیریت ہو گئی یاسر صاحب ورنہ ابھی راز فاش ہو جاتا اور وہ لڑنے جھگڑنے ستانے چڑانے کی حسرت دھری ہی رہ جاتی۔ وہ خجل سا ہو گیا پھر فوراً ہی اپنی شرمندگی مٹانے کو برا سا منہ بنا کر بولا۔

"توبہ توبہ تمہیں تو کپڑے پہننے کا بھی ڈھنگ نہیں ہے۔"

اس کے کہنے پر صنم نے حیرانگی سے پلٹ کر دیکھا وہ برا سا منہ بنائے تیوریاں چڑھائے پہلے سے بالکل مختلف انداز میں کھڑا تھا عجیب ہے یہ شخص کبھی کچھ کبھی کچھ ابھی چند ہی لمحوں پہلے نگاہیں کچھ اور ہی کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں مگر اب اپنے منہ سے کچھ اور ہی کہہ رہا ہے نگاہوں سے بالکل مختلف اظہار کر رہا ہے ہمیشہ کی طرح تلخی اور ناگواری و بیزاری کا اظہار۔ خیر مجھے کیا انکے کہنے سے میں کپڑے تو بدلنے سے رہی ان کو پسند نہیں تو نہ ہو مجھے کونسی ان کی پسند کی پروا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنا حوصلہ بڑھایا مگر نجانے کیوں اس کی اس بات سے دل دکھ کر رہ گیا تھا وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ کوئی اچھی سی خوبصورت سی بات کہے گا بالکم از کم خاموش ہی رہے گا مگر اس کی ناقدری پر طبیعت بجھ کر رہ گئی۔

"ارے بھئی میں یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ تمہیں امی بلا رہی ہیں مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔" اس نے اسے بجھا بجھا سا محسوس کر کے تو وہ پھر گھبرا گئی۔ یہی تو بات تھی وہ جس کی وجہ سے یہاں دبکی بیٹھی تھی۔

"وہ... وہ باہر کیسے جاؤں۔" گھبرا کر وہ اپنی گھبراہٹ کا اظہار اس پر بھی کر بیٹھی۔

"کیسے جاؤں کیا مطلب۔" اس نے کچھ نہ سمجھ کر پوچھا۔

"وہ میرا مطلب ہے کہ میں ان سب لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں میری تو کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے اپنی پریشانی کی وضاحت کرنے لگی۔

اور یامر کو اس لمحے اس سٹپٹائی سٹپٹائی لڑکی پر ٹوٹ کر پیار آیا جو اس کی تمام کوتاہیوں کو بھولے ہوئے ناگواری اور بیزاری کو نظر انداز کئے ہوئے نہایت اپنائیت سے اس سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھی۔

"پاگل ہو تم۔" اس نے ایک پیار بھری چپت ہلکے سے اس کے سر پر لگائی مگر صنم کو اپنی پریشانی میں اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ اس کے انداز پر غور کرتی۔

"جان پہچان پیدا کرنے سے ہوتی ہے ناکوئی خود سے تو نہیں ہو جاتی۔" اس نے سمجھایا مگر صنم کی گھبراہٹ دور نہ ہوئی۔

"چلو۔" اسے ہچکچاتے دیکھ کر اس نے دوبارہ کہا۔

"میں میں کیسے چلوں۔" وہ اپنی ہمت نہ باندھ پا رہی تھی بے بسی سے بولی۔

"اچھا بابا مت چلو مصیبت میں پھنس گیا میں تو یہاں آکر خواہ مخواہ ہی اتنی دیر تک سر مارا۔"

جھنجلاتا جانے کیا کیا بڑبڑاتا وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ ہراساں سی کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ اگر ایک لفظ بھی تسلی یا دلاسے کا کہہ دیتا تو اس کے خزانے میں کمی تو نہ ہو جاتی۔ اس کی ہیٹی تو نہ ہو جاتی۔ وہ عجیب گومگو کے عالم میں کھڑی تھی کہ سلطانہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ارے بیٹی تم ابھی تک یہیں ہو چلو میرے ساتھ چلو گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ جھجکتی ڈرتی ان کے ساتھ ہولی۔ ساتھ ساتھ سوچتی بھی جا رہی تھی کہ یہ یامر کتنے چالاک ہیں مجھ پر تو یوں جتلا گئے تھے جیسے میری پرواہ ہی نہیں ہے مگر پھوپی جان کو ساری بات بتا دی۔

وہ ان کی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سوچوں کا سلسلہ آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کمرہ جگمگاتے ہوئے لباسوں اور میک اپ سے سجے ہوئے چہروں والی خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ بے باک قہقہوں اور تیز تیز باتوں سے بے ہنگم سا شور برپا تھا مگر اس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے سناٹا سا چھا گیا سب کی نظریں اسی پر مرکوز ہو گئیں کچھ کی نگاہیں تنقیدی تھیں کچھ کی تعریفی۔ وہ اپنے آپ کو ٹارگٹ بنتا دیکھ کر سخت نروس ہوئی مگر سلطانہ بیگم نے پھر اس کو سہارا دیا۔

"گھبراؤ مت بیٹی تھوڑی ہمت سے کام لو۔" انہوں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تو اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

سلطانہ بیگم نے سب کو مخاطب کر کے تعارف کرایا اور پھر اسے لئے لڑکیوں کے گروپ کی طرف بڑھ گئیں۔

"یہ شہلا ہے یہ نازش یہ زرین اور یہ روحی۔" انہوں نے سب کے نام بتائے۔ پھر بولیں۔

"چلو تم اس سے دوستی کر لو اسے بھی اپنے گروپ میں شامل کر لو۔" ان کے کہنے پر سب سے پہلے شہلا نے نہایت گرم جوشی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر نازش اور روحی نے بھی مگر زرین نے ایک ادائے بے نیازی سے صرف ہیلو کہنے پر اکتفا کیا جس سے صنم نے اندازہ لگا لیا کہ یہ نک چڑھی اور حد درجہ مغرور ہے اس کے سرد رویے سے وہ تھوڑی بہت سٹپٹائی مگر شہلا نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر ذرا سی دیر ہی میں اس کی اور شہلا کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ وہ سانولی سلونی مخلص سی لڑکی صنم کو بہت اچھی لگی تھی تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں یوں گھل مل گئیں جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔

"چلو صنم باہر لان میں چلتے ہیں۔" شہلا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو نازش اور روحی بھی ان کے ساتھ ہولیں۔ زرین پہلے ہی باہر جا چکی تھی۔

ان سب کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی ان کی باتوں پر ہولے ہولے مسکراتی ہوئی جب وہ لان میں آئی تو وہاں موجود لڑکوں کے دلوں میں ہلچل مچ گئی۔

وہ اپنے اردگرد اتنے سارے اجنبی لڑکوں کو دیکھ کر خاصی اپ سیٹ ہوئی جا رہی تھی۔

"ارے بھئی یہ صنم ہیں ہماری نئی اور بے حد پیاری سی فرینڈ۔ اور صنم یہ عامر ہیں یہ راحیل یہ ثاقب یہ ندیم اور یہ شیراز۔" نازش نے باری باری سب کے نام بتائے تو وہ ایک زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لاتی ہوئی حلق سے بولی۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔"

"ابھی یہ تو ایک رسمی سا جملہ ہے اب پتہ نہیں آپ کو واقعی خوشی ہوئی یا یونہی رسماً کہہ رہی ہیں۔" عامر نے جھٹ بے تکلفی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

اور اس کی مسکراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سب

تو اس سے مکمل ہی ہو گئے وہ ازراہِ اخلاق میزبانی کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسکرا مسکرا کر ان کی اوٹ پٹانگ باتوں کے جواب دیتی رہی اور عین اسی لمحے ادھر سے گزرتے ہوئے یاسر کی نظر جب اس پر پڑی تو اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کی مرکزِ نظر متاعِ زیست اور دل پسند ہستی کو کوئی اور نظر بھر کر دیکھے بھی یہ اس کو گوارہ نہ تھا چہ جائیکہ باتیں کرنا ہنسی مذاق کرنا وہ برداشت نہ کر سکا دندناتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"تمہیں امی بلا رہی ہیں جاؤ اندر۔" نہایت غضب ناک نظروں سے اسے گھور کر کہا۔

"اچھا۔" وہ ان سب سے معذرت کر کے اندر آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی آیا پر آمدے میں پہنچ کر تیزی سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی راہ روکی کڑے انداز سے اسے گھورا۔ وہ کچھ نہ سمجھ کر تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی۔

"کیا ضرورت تھی ان لوگوں سے بات کرنے کی بہت شوق ہے لڑکوں سے فری ہونے کا۔" زہر میں بجھا ہوا طنز کا تیر پھینکا وہ غصے سے تلملا گئی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی سے بات کرنے کا مہمان سمجھ کر ازراہِ اخلاق بات کر رہی تھی۔" وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکی شدید برہمی سے بولی۔

"جی ہاں سارا اخلاق تو آپ ہی پر ختم ہو گیا ہے نا اور سب تو بغیر اخلاق کے ہیں۔" اس نے ایک اور نشتر مارا وہ خاموش کھڑی گھورتی رہی اس سے بحث بیکار تھی ورنہ اس کی ذہنیت پہ ماتم کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ہونہہ جیسے خود ہیں ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں" اس نے جل کر سوچا۔

"اب نہ دیکھوں بات کرتا ہوا تمہیں۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہہ کر زور زور سے پیر مارتا چلا گیا تو اس نے ایک طویل سانس لی موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا مگر مہمانوں کی خاطر اسے سنبھالنا ہی پڑا شکستہ قدموں سے دوبارہ شہلا وغیرہ کے پاس آ گئی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس کی نظر لان کے سرے پر نیم کے درخت کے نیچے کھڑے یاسر اور زرین پہ ٹھہر گئی یاسر جو ابھی چند لمحے پہلے ہی اس پہ بگڑ کر گیا تھا خود نہایت بے تکلفی سے زرین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا زرین اورنج کلر کی میکسی پہنے شانوں تک کٹے ہوئے بالوں اور گہرے گہرے میک اپ کے ساتھ یاسر کو لوٹ لینے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی۔

[...] کے دوران یاسر نے زرین کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ [...] تے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ اونہہ ذرا ا[...] رہے ایسی حرکتیں کرتے ہوئے" اس نے جل کر [...] پھر تمام وقت اس نے یہ نوٹ کیا کہ یاسر زرین کی طرف [...] متوجہ ہے ہر دو چار منٹ کے بعد وہ زرین کے پاس پہنچ جاتا، دو چار باتیں کرتا دو چار قہقہے لگاتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ کھانے پر بھی وہ خاص طور سے بڑھ بڑھ کر زرین کو ڈشش پیش کر رہا تھا جسے وہ نہایت ادا سے قبول کرتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ واقعی اس میں انٹرسٹڈ تھا یا محض اسے دکھانے کو دلچسپی لے رہا تھا بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ صنم کے لئے نہایت تکلیف کا باعث تھا جانے کیوں یہ سب دیکھ کر اسے دکھ ہو رہا تھا عجیب قسم کی کوفت و الجھن ہو رہی تھی وہ وجہ سمجھتے ہوئے بھی منکر ہو رہی تھی انجان بنی رہنا چاہتی تھی کہ یاسر کا رویہ تو اسے اسی بات پہ آمادہ کر رہا تھا مگر ہزار کوششوں کے باوجود بھی وہ ابتک اس میں ناکام رہی تھی نگاہیں بار بار اپنے اندر ہزاروں شکوے چھپائے یاسر پر جم جاتیں دل دھڑک دھڑک کر اس انوکھے اور اچھوتے جذبے کو بیان کرنے کے لئے بیتاب ہوا جا رہا تھا کہ جو جانے کب چپکے چپکے ہی اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا اور جس نے آج اتنی شدت سے سر ابھارا تھا کہ اس کی شدت اور تیزی کا اندازہ کر کے وہ خود گھبرا اٹھی تھی بری طرح پریشان ہو گئی تھی یا اللہ اس کا انجام کیا ہو گا اس بے تحاشہ مگر یکطرفہ خاموش چاہت کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

رات گئے مہمان رخصت ہوئے تو وہ لوگ ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھ گئے سب تھکن سے چور تھے مگر ایسے وقت بھی یاسر اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آیا۔

"[...] کافی کا موڈ ہو رہا ہے۔" اس نے جھٹ فرمائش کی جانتا تھا کہ کافی صنم کو ہی بنانا پڑے گی۔

ادھر [illegible] ہوا ادھر وہ جیسے ہی اٹھنے لگیں صنم نے فوراً اپنی خدمات [illegible] پیش کر دیں۔

"آپ بیٹھیں میں بنا کر لاتی ہوں۔"

"شاباش بڑے کام کی بیٹی ہے۔" وہ پیار سے بولیں۔

"اونہہ بڑے کام کی ہیں۔" وہ چڑانے کو بولا۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آئی حالانکہ کام کر کر کے نڈھال ہو چکی تھی مگر اپنی موجودگی میں سلطانہ بیگم کا کافی بنانا اچھا نہیں لگا کچن

ہیں اُٹھ کر جلدی جلدی دو پیالیوں میں کافی بنائی اور ان دونوں کو جا کر دے دی۔

"تم نہیں پیو گی بیٹی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔" آہستہ سے کہہ کر وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"توبہ توبہ یہ کافی بنائی ہے۔" پہلا گھونٹ لیتے کے ساتھ ہی یاسر نے بڑا برا سا منہ بنایا۔

"اچھی خاصی ہے۔" سلطانہ بیگم حیرانی سے بولیں۔

"خاک اچھی ہے۔" اس نے ہونٹ سکوڑے۔ "ان سے ذرا سے کام بھی سلیقے سے نہیں کر سکتیں۔" ناگواری سے کہا تو وہ چپ چاپ باہر نکل آئی کہ اگر وہاں بیٹھی رہی تو وہ مسلسل زہر اُگلتا رہے گا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو بیٹے۔" انہوں نے ملامت آمیز انداز میں اسے گھورا تو وہ دل کشی سے ہنس پڑا۔

"کیا ملتا ہے تمہیں اس بیچاری کو ستا کر۔" اس کی ہنسی پر چڑ کر بھی سے پوچھا۔

"کوئی بیچاری وچاری نہیں ہے امی وہ بنتی زیادہ ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"یاسر میں نے تمہیں ہزار بار کہا ہے اور آج پھر کہہ رہی ہوں کہ تم اسے خواہ مخواہ پریشان کرنا چھوڑ دو وہ پہلے ہی اتنی حساس ہے نا کہ تم اور اسے پریشان کر دیتے ہو۔" اسے تنبیہ کر کے وہ غصے سے باہر جانے لگیں تو یاسر نے تیزی سے بڑھ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"امی خفا ہو گئیں۔" بچوں کی سی معصومیت سے بولا۔

"خفا وفا نہیں ہوں بیٹے بس تم اس سے الجھنا چھوڑ دو، اسے خواہ مخواہ تنگ نہ کیا کرو۔" اس کی محبت کے آگے وہ پھر نرم پڑ گئیں۔

"کان پکڑتا ہوں امی آئندہ نہیں کروں گا۔" اس نے شوخی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا تو وہ بھی مسکرا دیں۔

یاسر نے سروس پر جانا شروع کر دیا تھا اس لیے اب صنم سے الجھنا کافی حد تک کم ہو گیا تھا وہ صبح آٹھ بجے کا گیا دن کو دو ڈھائی بجے تک واپس آتا لہٰذا اب وقت ہی بہت کم ملتا تھا اسے ستانے، چڑانے کو البتہ آتے جاتے یا واپس آنے کے بعد اس کا جب بھی صنم سے سامنا ہوتا تو ایک دو چبھتے ہوئے فقرے کسنے سے باز نہ آتا مگر صنم اب کافی حد تک اس کی تلخ و ترش باتوں کی عادی ہو چکی تھی لہٰذا زیادہ اثر نہ لیتی یوں بھی اثر لینے سے حاصل کیا ہوتا سوائے دکھ اور تکلیف کے جو ابو کی وفات کے بعد اس کی تقدیر ہو چکا تھا اسی لیے وہ نہایت صبر و ضبط کے ساتھ اس کی تلخ، طنزیہ اور دل کو چھید دینے والی باتیں سنتی اور سہتی اور پھر اب تو یاسر نے الجھنا بہت کم کر دیا تھا تو وہ پہلے کی طرح اپنے آپ کو کافی پرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کرتی اب اس نے گھر کے کافی کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی سلطانہ بیگم کے چھوٹے موٹے کام اور ان کی خدمت کرنے کے بعد اسے جو کچھ وقت ملتا وہ گھر کی صفائی ستھرائی پودوں کی کٹائی چھٹائی یا کڑھائی بنائی کر کے گزار دیتی سلطانہ بیگم اس سے بہت خوش تھیں وہ جو پہلے نوکروں کی کام چوری اور بدسلیقگی کی وجہ سے سخت نالاں تھیں اب ہر دم اس کی سلیقہ شعاری اور ہنرمندی کی تعریف کیا کرتیں اس نے نہ صرف گھر کو چمکا کر رکھ دیا تھا بلکہ صوفوں اور کرسیوں کے کشن اور تکیے کے غلاف نہایت خوبصورتی سے کاڑھ کر ان کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ کتنی سلیقہ مند باکمال اور پیاری لڑکی ہے۔ وہ اکثر سوچتیں۔ کاش کہ یاسر کا دماغ صحیح ہوتا تو پھر وہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لیتیں وہ اس کے وجود کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ اب اس کی غیر موجودگی برداشت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ اکثر ایک انوکھی سی خواہش ان کے دل میں جنم لینے لگتی مگر یاسر کے رویے کی بدولت انہیں اپنی خواہش کی تکمیل بہت مشکل نظر آتی یاسر جو پہلے دن کی طرح ہنوز اس سے چڑا رہتا اس کی ہر بات میں مین میخ نکالتا اور اس کے ہر کام پر تنقید کرتا ابھی دو تین دن پہلے ہی کی تو بات تھی جب یاسر نے اس پر تنقید کر کے بلاوجہ اس کے کام میں کیڑے نکالے تھے اس نے گلابی ٹی کوزی پر کالے ریشم سے نہایت نفاست سے ایک بلی کاڑھ کر جب اسے چائے دانی پر چڑھایا تو سلطانہ بیگم نے اس کی سینکڑوں تعریفیں کر ڈالیں مگر شام کو چائے پر جب وہی ٹی کوزی یاسر نے دیکھی تو بھڑک اٹھا۔

"توبہ توبہ یہ بلی کوزی بنائی ہے۔" اس نے بڑے تمسخر سے ہاتھ اٹھایا۔ بھلا ٹی کوزی پر کالی بلی بنانے کی کیا تک ہے وہ بھی کالی بلی جو نحوست کا نشان ہوتی ہے تم کیوں ہمارے گھر کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ وہ تو نان اسٹاپ بولے جا رہا تھا اور سلطانہ بیگم نے محسوس کیا کہ صنم جو تھوڑی دیر پہلے ہشاش بشاش تھی اب بجھ کر رہ گئی ہے جیسے یاسر کی باتوں سے دل پر چوٹ پڑی ہو جبھی وہ موقعہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جھٹ سے

اس کی حمایت سے بیٹھیں۔

"اتنی پیاری تو لگ رہی ہے فی کوزی۔ تم ہی بدذوق ہو گئے ہو جو ہر اچھی چیز میں عیب نکالنے لگے ہو۔" انہوں نے تیزی سے کہا تو وہ ایکدم چپ ہو گیا اسے تو خیال ہی نہ رہا تھا کہ امی بھی بیٹھی ہیں بس فی کوزی دیکھتے ہی رگ شرارت پھڑکی تو اسے چھاڑنے لگا پھر امی نے دخل اندازی کی تو اس نے چپ ہو جانا ہی بہتر سمجھا ورنہ کیا فائدہ تھا کہ وہ کچھ اور اسے کھری کھری سناتا تو امی ناراض ہو جاتیں۔

ویسے سلطانہ بیگم اس کی مسلسل بیزاری اور ناگواری سے کافی فکر مند ہو گئی تھیں وہ جتنا اسے صنم کی طرف مائل کرنا چاہتیں اس کی تعریفیں اور اچھائیاں کر کے اسے اسکی طرف متوجہ کرنا چاہتیں وہ اتنا ہی لاپرواہ ہو جاتا اس کی طرف ذرا توجہ دینا گوارہ نہ کرتا۔

اس دن صنم کو اون خریدنے جانا تھا سلطانہ بیگم نے سوئیٹر کی فرمائش کی تھی جانے کا وقت آیا تو انہوں نے یاسر کو اس کے ساتھ جانے کو کہہ دیا وہ انکا حکم سن کر چپ رہا ویسے ناگواری کے آثار صاف اس کے چہرے پر پیدا ہو گئے تھے جنہیں محسوس کر کے صنم فوراً بولی۔

"پھوپی جان میں اکیلی چلی جاؤں گی۔"

"نہیں بیٹی جب گھر میں کار موجود ہے تو پھر تم کیوں رکشہ ٹیکسی کے لیئے پریشان پھرو۔ جاؤ یاسر اس کے ساتھ۔" انہوں نے اس کی بات کی تردید کر کے یاسر کو حکم دیا جو بڑا برا سا منہ بنائے کھڑا تھا۔

"چلیئے چل کر بیٹھئے کار میں۔" وہ بڑے طنز سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق جا کر کار میں بیٹھ گئی حالانکہ اس کا دل ہرگز نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس جیسے بددماغ اور چڑچڑے شخص کے ساتھ ایک لمحہ بھی گذارے مگر سلطانہ بیگم کے حکم کے آگے انکار کی بھی گنجائش نہ تھی۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر تیزی سے کار کے قریب آیا اور پھر اسے پچھلی سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر بھڑک گیا۔

"میں آپ کا شوفر نہیں ہوں سمجھیں۔" کڑے تیور لیئے اسے گھورا "چلو آگے بیٹھو سیدھی طرح۔" بڑی دھونس سے کہا۔

وہ چپ چاپ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو وہ بھی غصے کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے دھم سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، زور سے دروازہ بند کر کے کار ریورس کی اور زن سے لے اڑا۔

"یا الہٰی۔" وہ اس کی تیز رفتاری سے خاصی بدحواس ہو کر رہ گئی تھی۔ آج ضرور کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ دل ہی دل میں وہ اپنی خیر و عافیت کی دعائیں مانگنے لگی۔

"کہاں جانا ہے؟" تھوڑا راستہ طے کرنے کے بعد اس نے بڑے اکھڑ لہجے میں پوچھا، نگاہیں ونڈ سکرین پر جمی تھیں اور پیشانی پر شکنیں ڈالے لب بھینچے وہ بڑے خطرناک موڈ میں بیٹھا تھا۔

"کہیں نہیں۔" وہ سٹپٹا کر بولی۔

"کیا مطلب؟" غضب ناک نظروں سے اسے گھورا۔ "کہیں جانا نہیں تھا تو ساتھ کیوں آئیں بہت شوق ہے میرے ساتھ گھومنے پھرنے کا۔" بڑے طنز سے بولا۔

وہ غصے سے کھول گئی۔

"میں ایسے واہیات شوق نہیں رکھتی۔" غصے کی زیادتی میں بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"خوب۔" اس نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی اور جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ "تو پھر تشریف لے جایئے۔" نہایت کھردرے لہجے میں کہہ کر اسے گھورا۔

"جی۔" وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی جو بیچ سڑک پر بڑے آرام سے اسے اتر جانے کو کہہ رہا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ایک بھرپور چانٹا اس کے رسید کر دے اور پھر بیچ میں گاڑی سے اتر جائے مگر وہ اتر بھی جاتی تو جاتی کہاں کسی عزیز اقارب کسی رشتہ دار تک کو تو وہ جانتی نہ تھی اسی لیئے اپنی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔ مگر اپنی شدید توہین کے خیال سے دل بھر بھر کے آ رہا تھا۔

"اب کیوں نہیں اتر رہیں؟" اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر اس نے پھر چھیڑا۔

"یہاں کہاں اتروں۔" مارے احساس بے بسی کے اس کی آواز رندھ گئی۔

"پھر کہاں اتریں گی بتا دیجئے تاکہ وہاں اتار کر میں اپنا پیچھا چھڑاؤں۔" وہ بڑی بیزاری سے بولا۔

"جہنم میں اتار دیجئے آپ مجھے۔" وہ پھر جھلا گئی اور اس کے بگڑے ہوئے موڈ پر یاسر کو مسکراہٹ آ گئی جسے چھپانے کو اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے وہ سختی سے بولا۔

"سوری میری گاڑی وہاں نہیں جاتی آپ کوئی دوسری گاڑی پکڑ لیجئے۔"

اور صنم ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی ویسے غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے آنسو چھلک پڑے تھے جنہیں چھپانے کو وہ منہ پھیر کر جلدی جلدی ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔

یاسر نے اسے دیکھا روتے ہوئے تو اپنے رویئے پر پشیمانی سی محسوس کرنے لگا اور اسے رلا دینا تو اسے ہرگز مقصود نہ تھا وہ تو یونہی منہ کا مزا بدلنے کے لئے اس سے دو چار کھری کھری باتیں سننے کا متمنی تھا اس سے جھگڑنا اور لڑنا چاہتا تھا مگر وہ تو عجیب ہی قماش کی لڑکی تھی لڑنا جھگڑنا غصہ کرنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ تو بہ حد ہوتی ہے برداشت کی بھی اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ایک دو دفعہ کے بعد ایسی صلواتیں سناتا کہ ساتوں طبق روشن ہو جاتے۔ اس نے کھسیا کر سوچا۔

"آخر تمہیں جانا کہاں تھا بھئی۔" اپنی پشیمانی وہ اس پر جھلا کر اتارنے لگا۔

"اون خریدنے۔" وہ ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"تو پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا خواہ مخواہ ہی اتنی جھک جھک کی۔" اس نے برا سا منہ بنایا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے مسلسل بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کر رہی تھی سرخ چہرے اور بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ یاسر کا بے اختیار دل چاہا کہ سارا لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر اس سے صلح کر لے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا آخر یہ مجھ سے لڑتی کیوں نہیں جھگڑتی کیوں نہیں مجھے اپنا کیوں نہیں سمجھتی مجھ سے غیریت کیوں برتتی ہے پاگل کہیں کی پیار بھی نہیں سمجھتی محبت بھی نہیں پہچانتی عجیب بے حس لڑکی ہے۔ سوچتے سوچتے اس نے اپنی جیب سے رومال گھسیٹا اور صنم کی طرف بڑھا دیا۔

صنم چونک پڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا نظریں ملیں تو ٹھٹھک کر رہ گئی بے اختیار نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی یاسر کی آنکھوں میں کوئی انوکھی بات تھی کوئی نرالی چمک تھی ایسی چمک جو اس نے پارٹی والے دن بھی دیکھی تھی یہ حقیقت ہے یا نظر کا دھوکہ یہی جاننے کے لئے اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا مگر وہ سنبھل چکا تھا بڑی بے نیازی سے سامنے دیکھ رہا تھا رومال والا ہاتھ ابھی تک اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

"یہ... یہ رومال۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"آنسو پونچھ لو اس طرح ہرگز نہیں لے جاؤں گا دکاندار سمجھے گا مار کے لایا ہوں۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا تو صنم نے چپ چاپ اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا۔ اس کے بعد سارا راستہ خاموش رہی۔ ایک بڑی سی دکان کے آگے یاسر نے کار روکی اور اس سے مخاطب ہوا۔

"جاؤ جا کر خرید لو میں یہیں بیٹھا ہوں۔" اس کا حکم سنتے ہی وہ چپ چاپ اتر گئی دکان میں جا کر مختلف کوالٹیز اور کلرز کے اون دیکھ کر اس نے ہلکا کریم کلر کا اون پسند کیا اور قیمت ادا کر کے واپس آ گئی۔

یاسر کار میں بیٹھا سگریٹ پیتے ہوئے آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا صنم آ کر بیٹھی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا کیا خریدا؟" اس کے ہاتھ میں بڑا سا پیکٹ دیکھ کر اس نے پوچھا لہجہ غیر معمولی طور پر نرم تھا۔

"صرف اون۔" اس نے آہستہ سے کہہ کر پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

یاسر نے تھوڑا سا پیکٹ کھول کر اندر جھانکا اور پھر پیکٹ اسے واپس کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی مگر عین اسی لمحے ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب پھول لے لیجئے۔" لڑکے کا انداز خوشامدی تھا۔

"نہیں بھائی معاف کرو۔" یاسر نے اسے ہاتھ سے پرے ہٹا کر کار آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا ٹس سے مس نہ ہوا۔

"صاحب لے لیجئے بیگم صاحبہ پر بہت اچھے لگیں گے۔" لڑکے نے فوراً ہی کہا اور یاسر اس کی غلط فہمی اور برجستگی پر جھینپ سا گیا چور نگاہوں سے صنم کی طرف دیکھا جو اس کے تاثرات جاننے کے لئے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی نظریں ملتے ہی وہ بڑی دلکشی سے مسکرا دیا پھر فوراً ہی لڑکے کی طرف گھوما۔

"لو یار اب بیگم صاحبہ کا نام لیا ہے تو لینا ہی پڑیں گے زرین کو دے دوں گا۔" وہ اس کو سنانے کو قدرے تیز آواز میں بولا لڑکے کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھا اور پھول لے کر اپنے اور اس کے بیچ میں رکھ لئے نہایت شان سے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے دھیمے سروں میں گنگنانے لگا۔

"اونہہ..." صنم کا دل جل کر خاک ہو گیا۔ "ذرا اچھے نہیں لگ رہے ایسی حرکتیں کرتے ہوئے۔" اس نے جل کر سوچا اور پھر لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے شانے جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ گھر پر اتر کر یاسر نے پھول اٹھائے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تب وہ بھی بے دلی سے پیکٹ اٹھا کر بوجھل قدموں سے اندر آ گئی۔

چوتھے ہی روز اس نے سوئیٹر مکمل کر لیا اور جب سلطانہ بیگم کو پہنایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ اس نے بڑا خوبصورت ڈیزائن ڈالا تھا نہایت نفاست اور دیدہ ریزی کا مظاہرہ کیا تھا رنگ بھی بڑا پیارا منتخب کیا تھا ان پر بڑا بھلا لگ رہا تھا سلطانہ بیگم نے اس کو بے شمار دعائیں دے ڈالیں شام کو یاسر آیا تو اسے بھی بڑے فخر سے وہ سوئیٹر دکھایا۔ سوئیٹر دیکھ کر وہ تمام عیوب ہو گیا واقعی بڑا خوبصورت سوئیٹر بنا تھا دل ہی دل میں اس کی تعریف کی مگر لفظا ظاہر کوئی تاثر نہ دیا حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ اپنے لئے بھی بنوا لے مگر پھر وہ سمجھ جاتی کہ اسے بھی پسند آیا ہے اسی لئے خاموش رہا کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تو صنم نے اطمینان کی سانس لی۔ شکر ہے زبان قینچی کی طرح نہیں چلی ورنہ وہ تو بھی رہی تھی کہ آج پھر اس کی بدسلیقگی اور بدعقلی پر لمبا چوڑا لیکچر دیا جائے گا۔

ادھر سلطانہ بیگم یاسر کے رویے سے اب کافی تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں یاسر تو کسی طرح اس کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا اس کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دیتا تھا پھر بھلا وہ صنم کو زندگی بھر کے لئے اپنے پاس رو کنے کا جواز پیش کر بھی زبردستی کی وہ ہرگز قائل نہ تھیں کہ زبردستی کے سودوں کا انجام بڑا بھیانک ہوتا ہے اور خدانخواستہ یاسر اس سے یونہی بیزار و عاجز رہا اور اسے خوش نہ رکھ سکا تو وہ قیامت کے دن حمید بھائی کو کیا جواب دیں گی کہ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر ان کی بیٹی کی زندگی کیوں برباد کی اپنے آرام و آسائش کے لئے ایک معصوم و مظلوم کی زندگی کیوں داؤ پر لگائی؟ یہی سب باتیں آجکل انہیں پریشان کئے رکھتیں اور آخر کار بڑی سوچ بچار کے بعد تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد صنم کی شادی کر دیں گی تاکہ وہ اپنے فرض سے بھی سبکدوش ہوں اور صنم بھی اپنے گھر کی ہو کر سکون و چین کی سانس لے۔

سلطانہ بیگم کا اشارہ پاتے ہی صنم کے کئی اچھے رشتے آئے انہوں نے ایک دو کو موزوں سمجھتے ہوئے صنم کا عندیہ لینا چاہا تو وہ ان کی بات سن کر شرمانے گھبرانے یا خوش ہونے کے بجائے ساکت سی بیٹھی رہ گئی دل میں جو انوکھی اچھوتی اور نرالی سی خواہش تھی وہ ان کی بات سے بری طرح مجروح ہو گئی تھی اس نے کیا چاہا تھا اور کیا ہو رہا تھا شاید اس نے اپنی حیثیت اور اپنے مقام سے بڑھ کر چاہا تھا، فرش پہ ہوتے ہوئے عرش کی تمنا کی تھی، جھونپڑے میں رہتے ہوئے محلوں کی آرزو کی تھی پھر اس کا انجام یہی ہونا تھا اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کو یونہی پامال ہونا تھا۔ وہ سن سی بیٹھی سوچتی رہ گئی۔

"بیٹی میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔" سلطانہ بیگم نے اصرار کیا تو وہ منتشر منتشر سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھوپھی جان جو آپ کی مرضی ہو کریں میں ہرگز انکار نہیں کروں گی۔" اپنے ہی سے ہاتھ مسلتے ہوئے وہ بڑی سوگواری سے کہہ کر کمرے سے باہر آ گئی اور پھر اپنا کمرہ بند کر کے وہ کتنی ہی دیر تک روتی رہی، یہ آنسو یاسر کی بے مروتی و بے اعتنائی پر نکل رہے تھے یا اپنی بدبختی و بدنصیبی پر وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

یاسر نے سنا تو وہ دم بخود رہ گیا امی نے اسے یہ خبر رات کے کھانے کے بعد اس وقت بتائی جب صنم اٹھ کر جا چکی تھی۔

"امی اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا اسے تو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی انتہائی قدم اٹھا لیں گی۔

"جلدی تو کوئی نہیں تھی بیٹے مگر میں نے سوچا کہ جتنا جلد اس کام سے فارغ ہو جاؤں اتنا ہی اچھا ہے تاکہ میرا بھی فرض پورا ہو اور صنم بھی سکون سے رہ سکے۔" انہوں نے بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کیا جو اس خبر سے خلاف معمول بجھ سا گیا تھا۔

"صنم کو یہاں کیا پریشانی ہے آرام سے تو رہتی ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یہاں آرام سے نہیں رہتی بیٹے بہت پریشان دبی دبی رہتی ہے تمہارے ناروا رویے کی وجہ سے تمہاری بیزاری اور ناگواری کی وجہ سے میں نے اکثر اسے تنہائی میں بھی روتے دیکھا ہے۔" انہوں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ سا ہو کر چپ ہو گیا اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ جلد از جلد اسے یہاں سے رخصت کر دوں ورنہ میری تو خواہش تھی کہ......" وہ کہتے کہتے خود ہی چپ ہو گئیں مگر وہ چونک پڑا۔

"کیا؟" تیزی سے پوچھ بیٹھا۔

"کچھ نہیں چھوڑو اس موضوع کو۔" انہوں نے اسے ٹالا یکدم ہی انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اب ایسی بات کہنے کا کیا فائدہ جو پوری نہ ہو سکتی ہو۔

"نہیں امی بتائیں نا آپ کی کیا خواہش تھی۔" وہ بچوں کی طرح مچل کر بولا اسے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ بات شاید اس کے مطلب ہی کی ہے۔

"میری خواہش سے آخر تمہیں کیوں اتنی دلچسپی ہے۔" وہ اس کی بے چینی دیکھ کر مسکرا دیں۔

"آپ بتائیں تو پھر بتاؤں گا۔" بیقراری سے کہتے ہوئے جواب طلب نظریں ان کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"بیٹے میری تو خواہش یہ تھی کہ صنم ہمیشہ یہیں رہے۔" انہوں نے حسرت سے کہا۔

"تو وہ تو اب بھی رہ سکتی ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ان کی خواہش سن کر وہ بھی آج ہی بات صاف کر لینا چاہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ذرا سی چوک سے صنم کسی اور کی بیاہی جائے اور وہ یونہی منہ دیکھتا رہ جائے۔

"کیسی باتیں کرتے ہو یاسر۔" وہ اس کی نا سمجھی پر جھلا گئیں۔ "لڑکیاں بھلا ساری عمر کیسے رکھی جا سکتی ہیں ہاں تم سے شادی ہو جاتی تو اور بات تھی۔" انہوں نے آخری فقرہ بڑی آہستگی سے کہا۔

"وہی تو میرا مطلب بھی ہے امی کہ شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے بڑی تیزی سے کہا مگر پھر اپنی بات پر غور کر کے خود ہی جھینپ گیا۔

"کیا۔" سلطانہ بیگم تو حیران ہی رہ گئیں۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں امی۔" وہ مدھم آواز میں ان سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"مگر تم تو اس سے نفرت کرتے ہو۔" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"کون کمبخت نفرت کرتا ہے اس سے۔" وہ پھر جوش میں آ گیا۔

"کیا تم نفرت نہیں کرتے؟" وہ ابھی تک حیران تھیں۔ "تو پھر وہ ستانا وہ رلانا اور بات بے بات پر غصہ کرنا وہ سب کیا تھا آخر۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھنجلا کر پوچھ بیٹھیں۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے، سر کھجا کر خجالت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر بڑی دلکشی سے مسکرا دیا۔

"بتاؤ نا پھر تم اسے اتنے دن تک کیوں خوامخواہ تنگ کرتے رہے۔" انہوں نے کڑے انداز میں پوچھا۔

"وہ مجھ سے لڑتی کیوں نہیں آخر، میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتی۔" وہ یکدم ہی جھنجلا اٹھا۔

"ارے کیا پاگل ہو گئے ہو بیٹے وہ تم سے لڑے بدتمیزی کرے یہ تم چاہتے ہو؟" وہ اس کی نرالی منطق پر ششدر رہ گئیں۔

"ہوں۔" اس نے بڑی معصومیت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آخر کیوں یہ کونسی خواہش ہوئی بھلا۔" انہوں نے قدرے جھلا کر پوچھا۔

"وہ دیکھئے نا امی میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ کوئی مجھ سے یوں اپنائیت بھرے انداز میں لڑے جھگڑے مگر اپنا تو کوئی بہن بھائی ہی نہیں تھا جس سے یہ خواہش پوری کرتا مگر اب یہ یہ۔۔۔۔" وہ بڑی محرومیت سے کہتے کہتے خود ہی چپ ہو گیا آگے جو اظہار کرنے جا رہا تھا وہ امی کے سامنے ہرگز زیب نہ دیتا اسی لئے جھجک گیا۔

"تو ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی اس سے کہ اب کے صاحبزادے بات کریں تو ایسا تھپڑ مارنا کہ زندگی بھر یاد رکھیں۔" امی نے کچھ اس کی محرومیت کا احساس کم کرنے کو اور کچھ اس کی نرالی سی خواہش پر جھنجلا کر کہا تو وہ بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا پھر فوراً ہی سنبھل کر بڑے خوشامدی انداز میں ان کے گھٹنے پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

"امی آپ ابھی اسے اس بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔" بڑی منت سے بولا۔

"کیوں؟" انہوں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بس امی پلیز آپ کو میری قسم۔" اس نے بڑی خوشامد سے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے تو وہ سرشاری سے مسکرا دیں۔

"شریر کہیں کے۔" کہتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"ہوں شادی کرنے کا بڑا شوق ہے تمہیں۔" وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ اچانک یاسر کی تیز کرخت آواز سن کر بری طرح اچھل پڑی۔ وہ سامنے ہی دروازے پر دونوں بازو سینے پر لپیٹے بڑی شان سے کھڑا تھا۔

وہ نظریں جھکا گئی کوئی جواب نہ دیا اسے دیکھ کر اب اسے غصہ آنے لگا تھا وہ جو اتنا بے حس اور سرد تھا کہ اس کی طرف کبھی توجہ نہ دیتا تھا اول دن سے یوں لاپرواہ بنا ہوا تھا جیسے اس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو جبکہ بڑے بڑے اسمارٹ اور رئیس لوگ ایک نظر میں اس کی من موہنی اور پرکشش صورت دیکھ دل وجان سے فریفتہ ہو جاتے تھے۔ اسے اپنانے کے لیے ہزاروں جتن کر ڈالتے تھے۔ اسے یاد تھا کالج کے زمانے میں بیسیوں لڑکوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اس سے لفٹ لینا چاہی تھی مگر اس نے کسی کو بھی حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اس قماش کی لڑکی ہی نہ تھی ان سب باتوں کو بہت برا سمجھتی تھی مگر اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی تھی وہ جس کے لیے بڑا پاکیزہ معصوم اور پیارا سا جذبہ دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ اتنا پتھر دل بے حس اور اکھڑ شخص تھا کہ اس کو خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب اس کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی کوئی مقام نہ رہا تھا اب تو وہ ان کے رحم وکرم پر پلنے والی ایک بے سہارا اور بے یار ومددگار لڑکی تھی وہ خاموش بیٹھی ماضی اور حال کا موازنہ کرتی رہی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر یاسر آہستہ آہستہ چلتا ہوا عین اس کے مقابل صوفے پر بیٹھا تو صنم کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اخبار اپنے چہرے کے سامنے کرنا چاہا مگر برق کی تیزی سے یاسر نے اخبار چھین کر سینٹر ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"جواب کیوں نہیں دیتیں بہت شوق ہے شادی کرنے کا بڑا ارمان ہے دلہن بننے کا۔" اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا صنم کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

"جی نہیں مجھے ایسا کوئی ارمان نہیں اس قسم کے شوق آپ ہی کو مبارک ہوں۔" کافی تیز لہجے میں وہ بولی۔

"شوق نہیں ہے تو پھر حامی کیوں بھر لی انکار کیوں نہ کر دیا۔" اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"میں نے صرف پھپھو جان کے اصرار پر حامی بھری ہے ورنہ مجھے ایسی کوئی تمنا نہیں۔" وہ اپنی صفائی میں جھٹ بولی۔

"سب بہانہ سب جھوٹ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بڑی ادا سے بولا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں ایسی چالیں۔" اسے مزید چڑایا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" نہایت طیش کے عالم میں صنم نے اسے گھورا۔

"مطلب یہی ہے کہ اگر آپ کو ایسا کوئی ارمان کوئی شوق نہیں تو آپ انکار کر دیجیے۔" بڑی دیدہ دلیری سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے کاٹ دار انداز میں بولا۔

وہ چپ ہو گئی اب بھلا کہتی بھی کیا وہ انکار کیسے کر سکتی جبکہ کل ہی ان کو اپنی رضامندی دے چکی ہے ان کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار دے چکی ہے اور پھر اگر وہ انکار کی ہمت کر بھی لیتی تو کس کی خاطر، کس کے لیے جیسے وہ چاہتی تھی وہ تو اس کا اپنا نہ ہو سکتا تھا اور باقی سب تو پھر برابر ہی کی حیثیت رکھتے تھے جس کے بھی پلے باندھ دیا جاتا گزارا تو کرنا ہی پڑتا۔

"کیوں نکل گئی نا جان انکار کے نام سے۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ بڑے تمسخر سے مسکرا دیا۔

"آپ مجھ سے بات مت کیا کیجیے۔" تلملا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"اور جب کوئی جواب بن نہ پڑا تو یہ کہہ دیا، بات تو میں ضرور کروں گا کچھ کر سکتی ہو تو کر لینا۔" بڑی دھونس سے وہ بولا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا تھا لہٰذا کمرے سے نکل گئی اس کے آخری فقرے پر وہ جھلس گئی تھی بھلا میں حقیر وکمتر سی لڑکی تمہارا کر بھی کیا سکتی ہوں میں جو تمہارے گھر میں تمہارے رحم وکرم پر رہ رہی ہوں اور تمہارے احسانوں تلے دبی جا رہی ہوں تو بھلا مجھ میں کہاں ہمت کہاں مجال کہ میں تمہارا کچھ کرنے کے متعلق سوچوں بھی۔ بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے میں آ گئی یاسر کی باتیں دل ودماغ میں ہلچل سی مچا رہی تھیں سخت بے چینی واذیت کا احساس دلا رہی تھیں۔

یاسر تم بہت دکھ دیتے ہو پریشان کر دیتے ہو ایسی تکلیف دیتے ہو جو سہی نہیں جاتی ناقابل برداشت ہوتی ہے دل ہی دل میں اس سے سینکڑوں شکوے کر رہی تھی آنسو پلکوں پر چھلک آئے تھے اور ایسے میں جو سلطانہ بیگم کمرے میں آ گئیں تو وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔

"کیا بات ہے بیٹی۔" انہوں نے بڑی محبت سے چمکار کر کہا۔

"کچھ نہیں کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی جلدی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ اسے گھبراہٹ تو اس بات کی تھی کہ اگر انہوں نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ کیا جواب دے گی یاسر کا نام تو لے نہ سکتی تھی جانتی تھی کہ اگر انہوں نے اسے کچھ بھی کہہ دیا تو وہ اس کا جینا حرام کر دے گا۔

"میں سمجھ گئی ضرور یاسر نے کچھ کہا ہو گا۔" وہ ایکدم ہی بھانپ گئیں۔

"نہیں نہیں انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ان سے تو میری بات ہی نہیں ہوئی۔" بوکھلا بوکھلا کر وہ جلدی سے بولی

"سچ کہہ رہی ہو؟" بڑے تاڑنے والی نگاہوں سے انھوں نے اسے گھورا۔

"جی ہاں۔" اس نے بڑے پُرزور انداز سے سر ہلایا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ نرمی سے پوچھنے لگیں۔

"وہ میرے سر میں بڑے زور سے درد ہو رہا ہے میں نے گولی بھی کھائی پھر بھی کم نہ ہوا۔" نظریں جھکا کر وہ نہایت صفائی سے جھوٹ بول گئی۔

"اوہ۔" انھوں نے تشویش سے ہونٹ سکوڑے "کونسی دوا کھائی؟"

"وہ کیا نام تھا ہاں پیراباڑین۔" وہ جلدی سے یاد کرکے بولی۔ دل ہی دل میں تہت خوفزدہ ہو رہی تھی ایسا نہ ہو کہ بھانڈا پھوٹ جائے جھوٹ پر جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا اس کی تو شامت ہی آگئی تھی اور اگر نہ جھوٹ بولتی تب بھی شامت ہی تھی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی وہ تو۔

"اچھا بیٹی تم لیٹ جاؤ میں چائے کے ساتھ دوسری گولی بھیجتی ہوں اگر پھر بھی درد کم نہ ہوا تو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔" وہ اس کو تسلی دیتی ہوئی باہر چلی گئیں تو وہ ہزاروں شکر ادا کرتی ہوئی بستر پر دراز ہوگئی۔

اسی دن رات کو کھانے پر یاسر بڑی بیباکی سے سلطانہ بیگم سے مخاطب ہوا۔

"امی آپ اپروں غیروں کی شادی کرا رہی ہیں اپنے بیٹے کی کوئی فکر نہیں ہے آپ کو۔"

اس کے کہنے پر صنم کا دل جل کر خاک ہوگیا اس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی اس کا پیچھا نہ چھوڑنے کی۔ اس نے سلطانہ بیگم کی طرف دیکھا جو اس کی بات پر دلکشی سے مسکرا رہی تھیں مسکرا تو وہ بھی رہا تھا دونوں کو مسکراتا دیکھ کر وہ اور زیادہ جل گئی۔ مگر لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے دوبارہ پلیٹ پر جھک گئی۔

"پہلے بیٹی کے فرض سے تو سبکدوش ہو جاؤں پھر تمہاری بھی فکر کروں گی۔" انھوں نے بڑی پیار بھری نظر خاموش بیٹھی صنم پر ڈالی۔

"نہیں امی پہلے میری کیجیے۔" وہ بچوں کی طرح مچل اٹھا۔

اور صنم دل ہی دل میں حیران رہ گئی کیسا بے شرم و بیباک انسان ہے اپنی ماں سے شادی کے ذکر پر یوں بحث کر رہا ہے جیسے وہ ماں نہیں کوئی برابر کی بے تکلف دوست ہوں۔

"کیوں کیا کوئی لڑکی وڑکی پسند کرلی ہے؟" انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا اور صنم ایک بار پھر حیرت میں پڑ گئی سلطانہ بیگم کی باتیں اسے سخت متعجب کر رہی تھیں وہ تو ایسی الٹی سیدھی باتوں پر یاسر کو ڈانٹ دیا کرتی تھیں نا کہ خود آج اس سے مذاق کر رہی تھیں اس کی اوٹ پٹانگ باتوں میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

"جی امی اسی لیے تو جلدی کر رہا ہوں۔" وہ بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

"کون ہے وہ؟" انہوں نے پوری پوری دلچسپی ظاہر کی۔

"زرین۔" بڑی دیدہ دلیری سے کہہ کر وہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"دیکھیے دیکھیے امی آپ اسے بُرا نہ کہیے گا ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔" نہایت بے شرمی سے اس کی طرفداری کرتے ہوئے وہ انہیں دھونس دے بیٹھا۔

"اچھا بابا نہیں کروں گی۔" مصالحت آمیز انداز میں کہہ کر وہ میز سے اٹھ گئیں تو وہ مزید الجھ کر رہ گئی۔ اپنی پلیٹ میں نکلا ہوا کھانا جلدی جلدی ختم کرکے اٹھنے لگی تو یاسر اچانک ہی براہ راست اس کو مخاطب کیا۔

"کیوں زرین کیسی ہے؟" غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے پتہ نہیں۔" بیزاری سے کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گئی۔

"کیوں جل گئیں۔" بڑے دل جلانے والے انداز میں وہ ہنسا۔

"میں کیوں جلوں گی بھلا آپ کسی کو بھی پسند کریں مجھے کیا؟" وہ سلگ اٹھی بڑے تنفر سے کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی مگر یاسر کا بھونڈا قہقہہ کافی دور تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اور اس دن کے بعد سے تو اسے تنگ کرنے کے لیے یاسر کو ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا وہ جب بھی دکھائی دیتی یا تو اس کی شادی کے بارے میں ایک دو جلے کٹے فقرے سُنا دیتا یا پھر اپنی شادی کا ذکر کرکے دل جلاتا رہتا۔ صنم عاجز آچکی تھی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ دنیا کے کس کونے میں چھپ جائے جو اس جنجالی دوپالی شخص سے پیچھا چھوٹے۔ اوپر سے تقدیر بھی ہمیشہ اس کے خلاف ہی جاتی تھی وہ جتنا اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تقدیر اتنے اس کو مواقع فراہم کرتی کہ وہ دل کھول کر اس کو پریشان کرے۔

آج بھی وہ سلطانہ بیگم کے جانے کی خبر سن کر وہ اپنی

تقدیر کو بُری طرح کوس چکی تھی ایک وہی تو تھیں جو اس کو اس کے عتاب سے بچا لیا کرتی تھیں اور اب ان کے جانے کے بعد تو اسے کھلی چھوٹ مل جائے گی، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہوگا تو وہ تو اور شیر ہو جائے گا اور پھر یقیناً اس سے بچا پھرانے کے لیے تو دُگنی ہی کرنا پڑے گی۔ وہ ان کے جانے کے خیال سے سخت ہراساں ہوئی جا رہی تھی ان کو روک بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کا جانا بہت ضروری تھا دراصل سلطانہ بیگم کی بڑی بہن رئیسہ بیگم کو اچانک ہی دل کا دورہ پڑ گیا تھا وہ ہسپتال میں داخل تھیں گھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کے پاس رہتا دو بیٹیاں تھیں مگر دونوں ہی کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے لیے سسرال شوہر اور بچوں کو چھوڑنا بہت مشکل تھا اسی لیے رئیسہ بیگم کے شوہر نے سلطانہ بیگم کو گاڑی بھیج کر بلوایا تھا اور ان کا جانا لازمی ہو گیا تھا ویسے وہ بھی صنم کی پریشانی کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اسی لیے چلتے چلتے یاسر کو بلا کر نہایت لہجے میں سمجھایا۔

"یاسر اگر میرے پیچھے صنم کو ستایا تو پھر سمجھ لو کہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"جی بہت بہتر۔" اس نے نہایت سعادت مندی سے سر جھکا لیا اور صنم کھول کر رہ گئی سمجھ رہی تھی کہ صاف ایکٹنگ کر رہا ہے کرے گا وہی جو اس کی مرضی ہوگی۔

"زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔" سلطانہ بیگم کو بھی اس کی سعادت مندی پر شک پڑ گیا تھا۔ "یہ سمجھ لو اگر اس سے جھگڑے تو تمہاری خیریت نہیں ہے میں واپس آکر اچھی طرح خبر لوں گی۔"

"جی اچھا میں نہیں لڑوں گا مگر ان سے بھی کہہ دیجیے کہ میرا ہر کام وقت پر خود بخود ہی کر دیں تاکہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" اس نے بھی موقعہ غنیمت جان کر جھٹ اپنا اُلّو سیدھا کیا۔

"کیوں وہ ملازمہ تو نہیں ہے یہ سارے کام کرنا اس کی ذمہ داری نہیں۔ تمہارے تمام کاموں کی ہدایات میں نوکروں کو دے چکی ہوں وہ کیا کریں گے خبردار جو تم نے اس پر حکم چلایا۔" انھوں نے کڑے انداز سے اسے گھور کر سختی سے کہا تو وہ چپ ہو گیا۔

اس کو اچھی طرح سمجھا کر وہ صنم کے پاس آگئیں۔

"بیٹی تم قطعی پریشان نہ ہو اگر اس نے تمہیں کچھ کہا تو میں اس کا دماغ درست کر دوں گی۔" انھوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دی تو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے۔

"رونا بالکل نہیں بیٹی ورنہ میں وہاں سکون سے نہ رہ سکوں گی" انھوں نے پیار سے اس کے آنسو پونچھے اور پھر دونوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئیں جہاں رئیسہ بیگم کا ڈرائیور پہلے سے ہی کار کا دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا۔

سلطانہ بیگم کے باہر نکلتے ہی وہ ضبط کے تمام بندھن توڑ بیٹھی بے حال سی ہو کر صوفے پر گری اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بُری طرح رو دی یاسر اس کے اس طرح رونے پر خاصا سٹپٹا گیا تھا ہق دق کھڑا اس کی صورت دیکھ رہا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیسے چپ کرائے زیادہ پیار جتانے سے بھانڈا پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے قریب جا کر وہ بے قابو ہو جائے گا اور بے ساختگی میں کچھ الٹ سلٹ منہ سے نکل گیا تو اتنے دن کی محنت برباد ہو جائے گی اور اس کو یوں روتا بھی نہیں دیکھ سکتا اس کے آنسو بھی برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا وہ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا۔

"کیوں رو رہی ہو بھئی اس طرح کوئی نوکر دیکھ لے گا تو سمجھے گا کہ میں ظلم توڑ رہا ہوں امی سے شکایت کر دی تو خواہ مخواہ ہی میری شامت آ جائے گی۔" اس کا انداز جھنجلایا ہوا سا تھا۔

صنم نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا مسلسل روتی رہی۔

"ارے بابا اب چپ بھی ہو جاؤ میں کونسا تمہیں کھائے لے رہا ہوں جو یوں رو رو کر اپنی مظلومیت ظاہر کر رہی ہو۔" وہ بُری طرح جھلا گیا۔

اور صنم نے اس کے جھلانے پر بڑی شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایکدم ہی نظریں چرا گیا اس کی حسین آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں اور بے شمار شکووں گلوں کو دیکھ کر اسے ایکدم ہی اپنی زیادتی کا شدت سے احساس ہوا صنم نے بس ایک ہی لمحے تک اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور وہ وہیں کھڑا اپنے رویے پر شرمندہ ہوتا رہا۔

اور پھر واقعی اس دن کے بعد سے یاسر نے اسے کچھ نہیں کہا نہ کوئی طنز کیا نہ کوئی طعنہ دیا اور نہ ہی ڈانٹا وہ جب دو واپس آتا تو صنم نہایت خاموشی سے کھانا لگا دیتی اور پھر کھ

بھی بڑے سکوت کے عالم میں کھایا جاتا۔ یاسر نہ اس سے کچھ کہتا نہ کچھ پوچھتا بس چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھ جاتا ویسے صنم اب اس کی خاموشی سے اور زیادہ ہراساں ہو گئی تھی وہ سوچتی کہیں یہ خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔ وہ اکثر اسے غور سے دیکھتی اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ وہ واقعی ٹھیک ہو گیا یا محض امی کے خیال سے ضبط کر رہا ہے اور ایسے میں اگر کبھی دونوں کی نظریں مل جاتیں تو یاسر بڑی ناگواری سے اپنا منہ پھیر لیتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی خدا سے دعا کرتی کہ سلطانہ بیگم جلدی سے لوٹ آئیں تاکہ یہ ہر وقت کے سہم اور خوف سے دل آزاد ہو۔

مگر سلطانہ بیگم لاہور جا کر جیسے سب کچھ بھول چکی تھیں ان کو گئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور اس عرصے میں انکا ایک ہی خط آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ رئیسہ بیگم کی حالت بہت نازک ہے اور وہ ابھی تک ہسپتال میں داخل ہیں لہذا انہیں وہاں کم از کم ایک مہینہ ضرور لگ جائے گا۔ اور اس خبر سے جہاں صنم کا خوف دو چند ہو گیا تھا وہاں یاسر بھی بے چین ہو گیا تھا اب تک وہ بڑی مشکل سے اپنی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اور بے قابو ہوتے ہوئے دل کو قابو میں کئے ہوئے تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امی کے پیچھے اس سے الجھے کیونکہ امی ہوتی تھیں تو کم از کم لڑائی جھگڑے کے بعد اسے ڈھیروں تسلیاں تو دے دیتی تھیں مگر ابھی تو وہ بالکل تنہا تھی روتی تو کوئی چپ کرانے والا بھی نہ ہوتا۔ مگر پھر اس خبر سے کہ وہ ایک مہینے بعد آئیں گی ضبط کا یارا نہ رہا تھا ایک منٹ کو نچلا نہ بیٹھنے والا شخص دو ہفتے تک خاموش رہا تھا یہی کیا کم تھا کہ اب مدت اور طویل ہو گئی تھی تو اب تو صبر کا پیمانہ لبریز ہونا ہی تھا چنانچہ دن کو جب کھانے پر بیٹھا تو پہلا نوالہ لیتے ہی بہت برا سا منہ بنایا۔

"توبہ توبہ یہ سالن ہے؟" اس نے کہا تو صنم چونک پڑی یہ آج دو ہفتے بعد قفل کیسے کھلا وہ حیران تھی۔

"کس نے پکایا ہے؟" اس نے خاموش دیکھ کر پوچھا

"کریمن نے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تو کبھی آپ بھی دیکھنے کی زحمت کر لیا کریں کہ کیا پکایا ہے کیسا پکایا ہے مگر آپ کو تو خود کسی کام کا سلیقہ نہیں ہے آپ بھلا دوسروں کو کیا دیکھیں گی۔" اس نے بولنا شروع کیا تو حسب عادت نان اسٹاپ ہو گیا۔

صنم ابھی تک اس کی اچانک تبدیلی پر کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی ویسے یہ سوچ کر خاصی پریشان بھی ہو گئی تھی کہ اب اس کی شامت آ گئی اب جبکہ اس نے طنز اور طعنوں کا آغاز کر ہی دیا ہے تو اس کی زندگی تو جہنم ہی بن جائے گی چونکہ جان یہاں نہیں ہیں جو اسے کوئی اس کے عتاب سے بچائیں اب تو اگر وہ بگڑا تو اس کی اچھی خاصی درگت بن جائے گی۔

"کیا سوچ رہی ہو کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟" اس نے اسے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔

"کھا چکی۔" اس نے آہستگی سے ہاتھ کھینچ لیے۔

"ضرور کھا چکو اور بعد میں امی سے شکایتیں لگانا کہ مجھ کو فاقہ سے مار دیا مجھ کو کھانا نہیں دیا۔" اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ حسب معمول چپ ہی رہی۔

"چلو بیٹھو پورا کھانا ختم کرو زیادہ نخرے مت دکھایا کرو" بڑے رعب سے اس نے حکم دیا۔

وہ بھلا کر رہ گئی مگر مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق کھانا زہر مار کرنا ہی پڑا۔

اس روز صبح سے گہرے گہرے بادل گھر کر آ رہے تھے ہر طرف کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں یاسر دفتر جا چکا تھا اور موسم کی حالت دیکھ دیکھ کر صنم کا دل ہول رہا تھا ڈر کے مارے برا حال ہو رہا تھا کہ بارش ہوئی تو گرج چمک بھی ضرور ہو گی اور گرج کڑک سن کر تو اس کا دم ہی فنا ہو جاتا تھا اس پہ آج وہ تنہا بھی تھی بالکل اکیلی کوئی تسلی دلاسہ دینے والا نہ تھا کوئی ہمت بندھوانے والا نہ تھا ایسے کسمپرسی کے عالم میں اسے ابو بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے جو ایسے وقت میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے بڑی پیار و محبت سے تسلیاں دیتے تھے اس کا ڈر کم کرنے کے لئے اسے ہزاروں قصے سناتے تھے اور ساری ساری رات اس سے باتیں کر کے بتا دیتے تھے مگر آج وہ قطعی بے یار و مددگار تھی وہ گھبرا گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھتی اور پھر خوف سے آنکھیں بھینچ لیتی تھوڑی دیر میں ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں تو اس نے گھبرا کر تمام کھڑکی دروازے بند کر دیئے اور صوفے پر بیٹھ کر کانوں میں انگلیاں دے کر پوری قوت سے آنکھیں بھینچ لیں پھر بھی ڈر کم نہ ہوا تو گھبرا کر رونے لگی۔

جانے کتنی دیر تک بارش ہوتی رہی اسے کچھ ہوش

نہ رہا وہ نیچے کے قریب جب یاسر گھر آیا تو اسے ایسی حالت میں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا آج کا موسم بڑا حسین و سہانا تھا اور وہ بڑے خوشگوار موڈ میں سیٹی پر شوخ سی دھن بجاتا گھر میں داخل ہوا تھا مگر اسے ایسے بیٹھے دیکھ کر تو وہ خاصا گھبرا سا گیا تھا۔

"یہ کیا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا مگر صنم بدستور ویسے ہی بیٹھی رہی ظاہر ہے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں اور آنکھیں بند تھیں تو نہ اسے آتے دیکھا اور نہ ہی اس کی بات سنی۔

"کیا بات ہے صنم۔" کوئی جواب نہ پا کر یاسر نے آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی جلدی سے آنکھیں کھول کر کانوں میں سے انگلیاں نکال کر اسے دیکھا۔

یاسر نے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں چہرہ خوف کی وجہ سے پیلا پڑا ہوا تھا ہونٹ خشک تھے وہ بڑی ڈری سہمی اور خوفزدہ سی لگ رہی تھی۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے کیا ہوا؟" وہ بے اختیار جھک کر پوچھنے لگا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے ہمدردانہ رویے پر آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

"کیوں، کس سے؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

"وہ اتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔" وہ خوف سے بولی۔

"کیا!؟" وہ پوری آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ "بارش سے ڈرتی ہو؟" حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں بجلی کے کڑکنے اور بادل کے گرجنے سے۔" بڑی معصومیت سے اس نے جواب دیا۔

اور یاسر کو اس کی معصومیت پر ڈھیر سارا رحم آ گیا۔

"مگر بارش تو کب کی رک چکی۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولنے لگا۔

"اچھا مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔" حیرانی سے کہتے ہوئے اس نے سہمے سہمے انداز سے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

"تمہیں پتہ بھی کیسے چلتا جبکہ سب کھڑکی دروازے بند کئے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بیٹھی تھیں۔" وہ کہتے کہتے بڑی دلکشی سے مسکرایا مگر صنم کی طرف سے پشت تھی وہ مسکراہٹ نہ دیکھ سکی البتہ لہجے سے تو یہی سمجھ میں آیا کہ وہ اس کے خوف کا مذاق اڑا رہا ہے۔

"آج کھانا وانا بھی ہو گا یا نہیں۔" وہ یکدم ہی اس کی طرف گھوما تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی نجانے کیوں اب اسے کافی ڈھارس ہو گئی تھی خوف بڑی حد تک دور ہو گیا تھا اور وہ اپنے آپ کافی پر سکون محسوس کر رہی تھی جانے یہ یاسر کی موجودگی کا اثر یا بارش کے رک جانے کا وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"کریم نے پکایا ہو گا لگواتی ہوں۔" کہتی ہوئی وہ باہر گئی تو یاسر بھی کپڑے بدلنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا

مگر پھر رات کو بارش شروع ہو گئی وہ لوگ وغیرہ کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ بڑے زور سے بادل اور موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں صنم کی خوف کے مارے نکل گئی وہ ہاتھ دھو کر آئی تھی جلدی سے دن والی پوزیشن صوفے پر بیٹھ گئی۔

یاسر ڈرائینگ روم سے ملحقہ غسل خانے میں ہاتھ رہا تھا چیخ سن کر تیزی سے اندر آیا مگر اسے دن وا پوزیشن میں بیٹھا دیکھ کر سارا جغرافیہ سمجھ گیا اس نے کچھ ہاتھ پونچھ کر خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا اور نہایت انہماک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا وہ جانتا تھا وہ ڈر رہی ہے اسی گیا تھا اس سے بے پناہ پیار جو تھا پھر اس کو یوں ڈرتا ہوا چھوڑ سکتا تھا البتہ اس پر ظاہر نہ کرنے کے لئے اخبار اٹھا لیا تھا۔

صنم نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر اس کو بیٹھا دیکھ کر دل ہی دل میں شکر ادا کیا اس کی موجودگی میں عجیب محسوس کر رہی تھی اسی اثنا میں بجلی چمکی تو وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑ بند کرنے لگی۔

"ہوں ہوں۔" یاسر نے ٹوکا۔ "ابھی میں موجود ہوں سمجھیں چلا جاؤں جب بند کرنا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا تو وہ بند کر کرتے رک گئی خوف کہہ رہا تھا کہ سب کھڑکیاں درواز کر دے مگر اس کا حکم تھا کہ کھلی رہنے دے عجیب گو نا گوں عالم میں وہ کھڑی تھی اچانک بجلی زور سے کڑکی تو وہ ایک ڈری سی چیخ مار کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا پاگل پن ہے۔" یاسر نے گھبرا کر اس کو زور سے "ایسا بھی ڈر کس کام کا کہ انسان اپنے ہوش و حواس ہی کھو د اس نے غصے سے گھورا۔

"سچی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" سہمے سہمے انداز میں اور پھر اس کی طرف دیکھ کر وہ بے بسی سے رو پڑی یاسر کو اپنے لہجے پر افسوس ہوا مزید کچھ کہے بنا اٹھ کر کھٹاک کھٹاک کھڑکیاں بند کر دیں۔ پھر اس کی طرف مڑا۔

"اب تو بیٹھ جاؤ آرام سے عجیب مصیبت میں پھنس

ہوں میں تو۔" وہ جھنجلایا اس پر رحم بھی آ رہا تھا مگر اپنی نازک پوزیشن پر جھنجلاہٹ بھی۔

وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی وہ کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا اور صنم کا تو دم ہی نکل گیا۔ آخری سہارا بھی چھوٹ گیا تھا رات تنہائی اور پھر اتنی زبردست گرج چمک اس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ بے ساختگی میں کوئی اول جلول حرکت کرتی یاسر دوبارہ کمرے میں آ گیا اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک کمبل تکیہ اور موٹی سی کتاب تھام رکھی تھی۔

"یہ لو۔" اس نے کمبل اور تکیہ اس کی طرف اچھال دیا "اور اب یہیں صوفے پر لمبی لیٹ جاؤ خبردار جو چیخیں ماریں۔" اس نے ہمدردی بھی دکھائی تو کرختگی کے ساتھ نیکی بھی کی تو دھونس کے ساتھ۔

اور صنم کے لئے تو اتنا ہی بہت تھا کہ یاسر غصے میں ہی سہی مگر اس کی خاطر یہاں رک تو گیا تھا اس نے تشکرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ تو کمال بے پروائی سے کتاب دیکھ رہا تھا جیسے اس سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

"سنیئے۔" اس نے بڑی ہمت سے اتنے عرصے میں پہلی بار اسے خود سے مخاطب کیا۔ "آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں جا کر سو جائیں میں یہاں سو جاؤں گی۔" وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

"جی نہیں۔" وہ تڑ سے بولا۔ "آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں میں ابھی پڑھ رہا ہوں جب نیند آئے گی تو چلا جاؤں گا، میں ان میں سے نہیں ہوں جو خواہ مخواہ کسی کے لئے پریشان ہوں اپنا چین آرام حرام کر لیں۔" بڑی تلخی سے اس کی غلط فہمی دور کرنے کو وہ اچھا خاصا لیکچر دے بیٹھا۔ صنم خفیف سی ہو گئی ابھی محبت سی محسوس ہوئی خواہ مخواہ ہی اس سر پھرے سے بات کی میری طرف سے جہنم میں جائے میری بلا سے۔ اس نے جھنجلا کر تکیہ میز پر رکھا اور سر سے کمبل تان کر لیٹ گئی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلے نگاہ اس صوفے کی طرف اٹھ گئی جہاں رات یاسر بیٹھا تھا اور وہ یہ دیکھ کر چونک گئی کہ وہ اب بھی وہیں موجود تھا مگر اس پوزیشن میں کہ کتاب نیچے قالین پر پڑی تھی گردن صوفے پر ٹکی تھی اور وہ بے خبر سو رہا تھا جانے رات کے کون سے پہر پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی وہ غیر ارادی طور پر اس کے قریب آ گئی جھک کر غور سے اسے دیکھا سوتے ہوئے وہ بڑا معصوم لگ رہا تھا چہرے پر کرختگی و سختی کا تمام وقت ان تک نہ تھا بلکہ بڑی معصومیت اور ملاحت بکھری ہوئی تھی۔ آج پہلی بار اس کو اتنے قریب سے دیکھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا وہ جو اس کو بے حد محبوب تھا دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھا مگر وہ کتنا سنگدل اور ظالم تھا کہ اس کے معصوم جذبات کی پرواہ ہی نہیں کرتا تھا اس کی قربت اس کا خلوص اور اس کا پیار حاصل کرنے کی وہ اب تک حسرت ہی دل میں لئے بیٹھی تھی مگر وہ اس کی دسترس سے دور تھا بہت دور۔ وہ اس کو دیکھتے ہوئے کھو چکی تھی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں مگر ذہن کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا اور ایسے میں جب اچانک ہی اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے یا ویسے ہی یاسر نے آنکھیں کھول دیں تو وہ چور سی بن گئی اپنی چوری پکڑے جانے پر بری طرح شرمندہ ہو گئی

"کیا بات ہے؟" یاسر نے سرخ سرخ آنکھوں سے پوچھا۔

"وہ آپ رات یہیں سو گئے آپکی کتاب نیچے گر گئی تھی میں وہ اٹھانے آئی تھی۔" وہ گھبرا گھبرا کر بولی ڈھنگ کا بہانہ بھی سوچ نہ سکا۔

"اوہ ہاں۔" وہ یکدم ہی سیدھا ہو گیا۔ "یاد ہی نہیں پڑھتے پڑھتے جانے کب آنکھ لگ گئی کیا ٹائم ہو رہا ہے۔" جھک کر کتاب اٹھاتے ہوئے وہ لاپرواہی سے بولا۔

"چھ بج رہے ہیں۔" اس نے سامنے لگی وال کلاک کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بارش رک گئی؟" اس نے غور سے اسے دیکھا۔

"جی۔" وہ جھینپ سی گئی۔

"ارے تو کھڑے منہ کیا دیکھ رہی ہو جا کر جلدی سے ناشتہ کا انتظام کرو۔" اس نے یکدم ہی تیور بدل کر اسے گھورا تو اس کا موڈ بگڑ گیا صبح ہی صبح وہ ایسی بات سننے کی ہرگز متوقع نہ تھی کھسیا کر پلٹ گئی مگر کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے سنا وہ تیز آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

"توبہ توبہ صبح ہی صبح صورت دکھ گئی اب پتہ نہیں دن کیسے گذرے گا۔" اس کا دل دکھ کر رہ گیا پتہ نہیں یہ شخص کب ٹھیک ہو گا اس کی نفرت اس کی بیزاری کبھی ختم بھی ہو گی یا نہیں وہ شکستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس دن کے بعد سے پھر بارش نہ ہوئی لہٰذا کوئی ایسا واقعہ بھی پیش نہ آیا یاسر کے وہی شب و روز تھے ہر دم اس کو

پریشان کرنا اس پر طنز کرنا اور بلاوجہ اس کو ڈانٹنا جھڑکنا اس پہ سے شامت یہ ہوئی کہ کریمن بیمار پڑ گئی اور کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی اسی کے سر پر آپڑی۔ اسے کھانا پکانے میں کوئی عار نہ تھا مگر غصہ اس بات پہ آتا تھا جب وہ اس کی محنت پہ پانی پھیر دیتا تھا لقمہ لیتے ہی کھانے میں ہزاروں نقص نکال دیتا کبھی کہتا نمک زہر ہو گیا ہے کبھی کہتا مرچیں تیز ہو گئی ہیں تو کبھی یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوتا کہ گوشت گلا نہیں ہے یا چاول کچے رہ گئے ہیں وہ عاجز آگئی تھی اس کی بیہودگی پہ سخت غصہ آتا مگر برداشت کر جاتی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی کہ نہیں چاہتی تھی کہ سلطانہ بیگم کی عدم موجودگی میں کوئی طوفان اٹھ کھڑا ہو مگر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے وہ جو اتنے دن سے اس کی تمام ناانصافیاں، جھڑکیاں، بدتمیزیاں اور بیہودگیاں بڑے صبر و سکون سے سہتی چلی آ رہی تھی اس کے ایک جملے پر بکھر کر رہ گئی برداشت کی حدوں کو چھو گئی وہ جملہ اس کے دل کے پار ہو گیا تھا اس کے پورے وجود کو طوفانی جھٹکوں کی نذر کر گیا تھا اس کے ذہن کو جھنجھوڑ گیا تھا اور اس کی سماعت پہ ہتھوڑے سے برسا گیا تھا۔

ہوا یوں کہ اس دن وہ دفتر سے جلدی گھر آ گیا وہ اس وقت کھانا پکانے میں مصروف تھی کہ وہ ایکدم ہی اس کے سر پر پہنچ کر بڑے تلخ لہجے میں بولا۔

"ابھی تک کھانا تیار نہیں ہوا ساڑھے بارہ ہو گئے ہیں۔"

"بس ابھی ہوتا ہے۔" وہ جلدی جلدی روٹی بیلتی ہوئی بولی۔ "آپ آج جلدی آ گئے ہیں۔"

"ہاں پھر تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" بڑے تیکھے لہجے میں بولا۔

"جی نہیں مجھے بھلا کیوں اعتراض ہو گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ خلاف معمول خاموش رہا مگر وہیں اس کی پشت پر ہی ڈٹا کھڑا اسے گھورتا رہا وہ سخت نروس ہو رہی تھی اس کی قربت اور اس کی نظروں کی تپش سے بوکھلائی جا رہی تھی۔

اور اسی بوکھلاہٹ میں جب وہ روٹی توے پر ڈالنے لگی تو اس کا ہاتھ گرم دہکتے ہوئے توے سے چھو گیا ساتھ ہی روٹی بھی ٹیڑھی ہو گئی۔

"ہلکی سی "سی" کی آواز کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ کھینچا ساتھ ہی یاسر کا طنز میں ڈوبا ہوا زہریلا فقرہ کانوں سے ٹکرایا۔

"ماشاء اللہ یہ روٹی ہے یا [illegible] کا نقشہ [illegible] میں [illegible] آئے گا نجانے کس بیچارے کا نصیب پھوڑو گی۔"

ایک تو گھبراہٹ ہاتھ کی جلن اس پر سے ایسا فقرہ وہ برداشت نہ کر سکی۔

"آپ کیوں سر پر سوار ہیں جائیے یہاں سے۔" تلخ کافی تیز لہجے میں اس نے کہا۔

"کیوں جاؤں میں یہ میرا گھر ہے میری جہاں مرضی ہو گی کھڑا ہوں گا تم کون ہوتی ہو مجھے نکالنے والی ہاں البتہ یہ اختیار مجھے پہنچتا ہے۔" وہ اس کو چڑانے کو کچھ زیادہ ہی اوور ہو گیا حد سے گزر گیا اور اس کا یہی فقرہ صنم کے دل و دماغ کی دنیا میں ہلچل مچا گیا وہ سارے تمیز تہذیب و ادب و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کے سے ہی اکھڑ گئی۔

"آپ انتہائی گھٹیا اور چھچھورے آدمی ہیں۔" بڑے تلخ لہجے سے بولی۔

"دیکھئے دیکھئے محترمہ میں ایسی بدتمیزیوں پہ ہاتھ مار دیا کرتا ہوں۔" اس نے دھونس جمائی لیا

"اونہہ۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے "مجھ بھی اللہ نے ہاتھ دیئے ہیں مسٹر اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے اگر میں نے بھی پلٹ کر ایک دو ہاتھ مار دیئے تو آپ کی اچھی خاصی بے عزتی ہو جائے گی۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ماشاء اللہ آج تو قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے" وہ دلچسپی سے مسکرایا اس کو لڑانے میں کامیاب جو ہو گیا تھا اسی دل ہی دل میں بے حد مسرور تھا مگر اس کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔

"بالکل چلے گی بلکہ قینچی سے بھی تیز چلے گی اتنے دن تک میں آپ کی جا اور بے جا باتیں اس لئے برداشت کرتی کہ مجھے اسی گھر میں رہنا تھا آپ ہی لوگوں سے نباہ کرنا تھا اب جبکہ میں نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں آپ کی ایک نہیں سنوں گی۔" بڑے کڑوے لہجے میں بولی۔

"اچھا کب کیا یہ فیصلہ۔" اس نے اس کی بات کا مذاق اڑایا

"ابھی اور اسی وقت۔" وہ عزم مصمم سے بولی۔

"اونہہ بہت دیکھے ہیں جانے والے۔" اس نے چڑایا۔

"تو بس پھر مجھے بھی دیکھ لیجئے گا آپ کی صورت آپ کی اور آپ کی شخصیت سے مجھے نفرت ہے شدید نفرت

...سے ... کرتا ہوا چیخ سی پڑی۔

"اچھا بس زیادہ بڑبڑ مت کرو کھانا نکالو کھانا مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے اس کے غصے کو نظر انداز کر کے بڑی شان سے حکم دے دیا۔

"میں آپ کی ملازمہ نہیں ہوں سمجھے ہرگز کھانا نہیں پکاؤں گی۔" اس نے بھی جیسے آج ساری بھڑاس نکال لینے کی ٹھان رکھی تھی ویسے وہ دل ہی دل میں خاصی حیران بھی ہو رہی تھی کہ خلاف معمول وہ اور زیادہ بگڑنے یا بھڑکنے کے ٹھنڈا پڑ گیا تھا اس کے تکڑے تکڑے جوابوں پر چراغ پا ہونے کے بجائے نہایت ٹھنڈے لہجے میں بول رہا تھا۔

"کیا!" اس نے آنکھیں نکالیں۔ "یعنی آج کھانا نہیں ملے گا۔"

"جی ہاں ہوٹل میں کھائیے یا کسی ملازمہ کا بندوبست کیجیے میں آپ کی نوکر نہیں۔" نہایت رکھائی سے کہہ کر وہ کچن سے نکل گئی۔

اور یاسر کا جی چاہا کہ خوشی سے جھوم جھوم جائے مسرت سے چیخے چلائے اور اوپر نیچے قہقہے لگائے بالآخر اتنے دن کی محنت اور تگ و دو کے بعد وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا اپنے ارادے میں فتحیاب ہو گیا تھا جی چاہ رہا تھا ابھی جا کر اس کو اپنی کامیابی کی خوشخبری سنائے۔ اتنے دن کی بے نیازی لاپرواہی اور سنگدلی کا ایک منٹ میں ازالہ کر دے انہیں پیار محبت خلوص و چاہت میں بدل دے مگر مشکل تو یہ تھی کہ ابھی وہ سخت غصے میں تھی اور وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں بات بگڑ نہ جائے اسی لئے اس کے پاس جانے اور اسے منانے سے گریز کر رہا تھا کہ دو تین گھنٹے بعد جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب بات کرے گا فی الحال تو اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور پیٹ پوجا کرنے کی کوئی سبیل بھی نہ تھی ابھی تک صرف سالن ہی پکا تھا اور روٹی تو ہنگامہ کی نذر ہو گئی تھی مرتا کیا نہ کرتا بازار سے روٹی لے کر آیا۔

کھانے بیٹھا تو خیال آیا کہ وہ بھی بھوکی ہے ایک پیار بھری مسکان اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اٹھ کر اس کے کمرے میں پہنچا وہ پلنگ پر پیر لٹکائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے گم صم سی بیٹھی تھی اس نے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا تو صنم نے سر اٹھایا اف آنکھیں جیسے شعلے سے برسا رہی تھیں وہ ایک لمحے کو سٹپٹا گیا۔

"فرمائیے۔" اس نے بڑے طنز سے کہا۔ "ابھی کچھ طعنے، گھڑکیاں، جھڑکیاں باقی تھیں کیا جو آپ یہاں تشریف لے آئے مجھے حکم دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتی۔" اس کا لہجہ بے حد زہریلا اور کاٹ دار تھا یاسر جل سا ہو گیا۔

"میں یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ چل کر کھانا کھا لو۔" اس کی تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"جی نہیں یہ احسان مجھ پر نہ ہی کریں تو بہتر ہے آپ تشریف لے جائیں میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔" اس نے بڑے تنفر سے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

"دیکھو میں بڑی محنت سے روٹی لے کر آیا ہوں کہیں مل ہی نہیں رہی تھی۔" اس کا انداز منت شدی تھا۔

"تو میں کیا کروں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"چلو اب غصہ تھوک دو۔" وہ مکمل طور پر مصالحت پر آمادہ تھا۔ "لڑائی مجھ سے ہوئی ہے کھانے سے تو نہیں۔" پیار چھلکاتی نگاہ اس پر ڈالی۔

"میں نے کہہ دیا ہے میں نہیں کھاؤں گی۔" اس کا لہجہ مضبوط ارادہ اٹل تھا۔

"دیکھو خواہ مخواہ کی ضد نہ کرو۔" اس نے نرمی سے سمجھایا۔

"آپ جائیے جائیے خدا کے لئے چلے جائیے۔" وہ بے بس سی ہو کر چلا پڑی تو وہ لوٹ آیا اکیلا کھانے کو جی ہی نہیں چاہا بھوک اچانک ہی ختم ہو گئی تھی کھانا واپس رکھ کر وہ صوفے پر دراز ہو گیا وہ بڑی سنجیدگی سے ناراض ہو گئی تھی اور وہ اس کو منانے کے مختلف طریقے سوچنے لگا۔

صنم رات تک اپنا کمرہ بند کئے پڑی رہی نہ کھانا کھایا نہ چائے پی اور اس کی وجہ سے یاسر کو بھی بھوک ہڑتال کرنا پڑی وہ چاہتا تو کھا پی لیتا مگر صنم کے بغیر کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا خود بھی چپ چاپ پڑا رہا وہ اس انتظار میں تھا کہ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گا اور وہ باہر نکلے گی تب وہ اس سے بات کرے گا۔

مگر صنم کو آج جو غصہ چڑھا تھا وہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ تھوڑی دیر بعد اتر جاتا یاسر کے طنز نے اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا روح کو مجروح کر دیا تھا اور اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ آج رات وہ ضرور یہ گھر چھوڑ دے گی چاہے کہیں بھی جا کے نوکری کر کے کھائے یا بھیک مانگ کے مگر اس گھر میں رہنا ہرگز گوارہ نہیں کر سکتی تھی جہاں قدم قدم پر دکھ ملیں طنز اور طعنوں

سے دل چھلنی کیا جائے آرزوئیں پامال کی جائیں اور تمنائیں کچل دی جائیں۔ اسے سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا تھا کہ جس نے اس کی روح کو گھائل کیا تھا جذبات کو کچلا تھا دل کو چھلنی کیا تھا جس کی وجہ سے وہ گھر تک چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئی تھی وہ کوئی غیر نہیں تھا اسکا اپنا تھا جسے وہ دل کے بے حد قریب محسوس کرتی تھی جسے وہ روح میں بسا چکی تھی اور جو اس کی دھڑکنوں کی پکار بن چکا تھا کاش کہ وہ اتنا ظالم سنگدل اور سنگدل نہ ہوتا تو وہ یوں دربدر نہ ہوتی وہ نجانے کب تک اپنی تقدیر پر ماتم کرتی رہی اچانک دور کہیں چوکیدار نے ڈنڈا مارا تو اس نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے اور یہی وہ وقت تھا جب وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی اپنے فیصلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی۔

وہ تیزی سے اٹھی ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں اپنے چند جوڑے کپڑے نکالتے ہوئے یاسر کا رومال گر گیا وہی رومال جو ایک دفعہ اس نے آنسو پونچھنے کے لئے اسے دیا تھا اس نے رومال اٹھایا سونگھا اس میں سے یاسر کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی وہی مسحور کن خوشبو جو اسکے قرب سے بھی آتی تھی وہ چند لمحوں تک رومال کو غور سے دیکھتی رہی پھر نجانے کس جذبے کے تحت اسے بھی سوٹ کیس میں ڈال لیا۔ سوٹ کیس بند کر کے پرس اٹھایا اس میں سلطانہ بیگم کے دیئے ہوئے نوٹ کافی تعداد میں موجود تھے اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ ان کو خرچ کرے اس نے چیزیں تیار کر کے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں یاسر کے کمرے کی طرف آگئی۔ اس کے کمرے کی لائٹ آف تھی اور دروازہ بند تھا یقیناً وہ سو گیا تھا وہ اطمینان کر کے اپنے کمرے میں واپس آگئی سوٹ کیس اٹھایا پرس کندھے سے لٹکایا اور باہر آگئی۔ چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی اس سناٹے میں صرف جھینگروں کی جھائیں جھائیں یا کبھی دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی۔ اس نے جیسے ہی برآمدہ عبور کر کے لان کی طرف سیڑھیوں پر قدم رکھا یاسر کی تیز گونجتی آواز سناٹے کا سینہ چیر گئی۔

"کون ہے؟"

وہ جہاں تھی وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی یاسر ابھی تک جاگ رہا ہوگا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر یاسر نے تیزی سے لائٹ آن کر دی سارا برآمدہ جگمگا اٹھا اور یہ دیکھ کر تو یاسر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ وہ... سوٹ کیس ہاتھ میں لئے پرس کندھے سے لٹکائے سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی گویا واقعی جا رہی تھی۔

"تو.... تو تم واقعی جا رہی ہو؟" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"جی ہاں۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

"کہاں جاؤ گی؟" اس نے اپنے حواس درست کئے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

"خدا کی دنیا بہت وسیع ہے یاسر صاحب کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی ہر جگہ آپ جیسے انسان نہیں ہو سکتے۔" اس نے بھرپور طنز کیا وہ شرمندہ ہو گیا۔

اس سے مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھ کر سوٹ کیس لینا چاہا۔

"چھوڑ دیجئے۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

"چھوڑ کیسے دوں۔" وہ یکایک ہی پینترا بدل کر بولا "ذرا دیکھ تو لوں کہ کیا کیا چرا کر لے جا رہی ہو، کتنی نقدی زیورات اور قیمتی اشیا لے کر فرار ہو رہی ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا تو وہ تلملا کر رہ گئی۔

"لیجئے یہ حسرت بھی پوری کر لیجئے۔" اس نے غصے سے سوٹ کیس اس کے سامنے پٹخ دیا۔

"انشاء اللہ منہ کی ہی کھائیں گے۔"

"وہ تو ابھی تم کھاؤ گی جب ڈیڑھ دو لاکھ کی مالیت کا سامان برآمد کروں گا۔" شرارت سے کہہ کر اس نے بڑے اطمینان سے اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر بڑی شان سے بولا۔

"اندر چلو آرام سے دیکھوں گا کہیں جلدی میں کوئی چیز رہ نہ جائے۔" اس سے کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے اندر آگیا تو وہ بھی طوعاً و کرہاً بیزار بیزار سی اس کے پیچھے چلی آئی ڈرائننگ روم میں آکر اس نے سوٹ کیس سینٹر ٹیبل پہ رکھا اور خود گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ کر اسے کھولا اور پھر نہایت انہماک سے اس کے کپڑے الٹنے پلٹنے لگا وہ پاس ہی کھڑی قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہی تھی سارے کپڑے الٹ پلٹ کرنے کے بعد یکایک اس کی نظر سب سے کونے میں پڑے ہوئے اپنے رومال پر پڑ گئی۔

وہ مارا۔" اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ایک چیز برآمد ہو گئی۔" فخر سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے رومال

کر اس کے سامنے لہرایا۔

"یہ میرا رومال اور آپ کے سوٹ کیس میں۔" اس نے خبر لینے والے انداز میں پوچھا۔

"آپ ہی نے دیا تھا میری الماری میں پڑا تھا کپڑوں کے ساتھ آگیا ہوگا۔" اس نے لاپروائی سے وضاحت کی۔ ویسے دل ہی دل میں اس کی حرکت پر کھول گئی تھی۔

"اونہہ کپڑوں کے ساتھ آگیا ہوگا۔" وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا سب کچھ سمجھ چکا تھا "کیوں جھوٹ بول رہی ہو خواہ مخواہ" اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جی نہیں مجھے کیا ضرورت پڑی جھوٹ بولنے کی اور پھر اس میں کونسے لعل ٹکے ہیں جو میں لے جاتی۔" نہایت صفائی سے کہہ کر اس نے رومال چھین کر دور پھینک دیا۔

"ہوں۔" اس نے گہرے انداز میں کہا۔ "ویسے یہ لعل سے بھی زیادہ ہے کسی کے لئے۔" ذومعنی فقرہ کہہ کر بڑی دلکشی سے مسکرایا۔

"ہوگا مجھے کیا۔" اس نے لاپرواہی کے اظہار میں شانے جھٹکے۔ "آپ جلدی سے اپنی پیکنگ مکمل کیجیے کہیں اور کوئی چیز نہ ہو۔" بڑے زہریلے لہجے میں بولی۔

"اوہ ہاں۔" وہ پھر سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہوگیا کافی دیر کی جدوجہد کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آیا تو مایوس ہوکر سوٹ کیس بند کردیا۔ صنم نے جھپٹ کر سوٹ کیس اٹھایا اور واپس جانے کو مڑی۔

"ارے ارے کہاں چلیں۔" اس کو جاتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے مقابل آیا۔

"کیوں اب کیا بات ہے؟" اس نے شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے گھورا وہ الجھا الجھا سا کھڑا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"سنو کیا تم واقعی جا رہی ہو؟" وہ ایکدم ہی سنجیدہ ہوگیا۔

"جی ہاں۔" اس نے بلا حیل و حجت سخت لہجے میں جواب دیا۔

"اور اگر میں روک لوں تو؟" گہری گہری نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کو کوئی ایسا حق نہیں پہنچتا سمجھے آپ۔" وہ بگڑ گئی۔

"کیوں نہیں پہنچتا یہی تو تمہاری عقل کا پھیر ہے یہ حق سب سے زیادہ مجھ ہی کو تو پہنچتا ہے۔" اس کے بگڑنے پر وہ بھی جھنجلا گیا۔

"جی۔" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔ "آپ ہوش میں تو ہیں۔" غصے سے اسے گھورا۔

"ہاں میں بالکل ہوش میں ہوں۔" اس نے بڑے یقین سے کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "یہاں بیٹھ جاؤ پھر آرام سے سکون سے اور ٹھنڈے دل کے ساتھ میری بات سنو۔" اسے شانوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"سنو گی نا میری بات۔" اس پر قدرے جھک کر پوچھا

"سنائیے!" وہ کوفت سے بولی۔

"تم بہت بیوقوف ہو صنم بے حد احمق۔" اس نے بڑے پیار سے سرگوشی کی، "ابتک میرے پیار محبت خلوص و چاہت کو پہچان ہی نہ سکیں۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

"جی۔" اس پر تو جیسے بم گر گیا حیران بیٹھی اس کی صورت تکتی رہ گئی۔

"ہاں صنم میں آج اس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ میں تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے اس کے سامنے اقرار کرلیا۔

"جھوٹ مت بولئے۔" ایکدم اس کی حیرانی غصے میں بدل گئی۔ "جس شخص نے اتنے دن تک میری زندگی کو عذاب بنائے رکھا میں اس کی بات کو سچ ہرگز نہیں مان سکتی۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اسکا لگایا ہوا ایک ایک زخم ابھی تازہ تھا پھر وہ کیسے اتنی جلدی اس کی بات کو صحیح مان لیتی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے صنم سچ ہے حقیقت ہے۔" وہ اس کو یقین دلانے کے لئے جلدی جلدی بولا۔

"میں قیامت تک نہیں مان سکتی۔" اس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ "آپ جو مجھ سے اتنی شدید نفرت کرتے ہیں!"

"کون کمبخت تم سے نفرت کرتا ہے صنم۔" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "وہ سب تو صرف تمہیں لڑانے کی ایک اسکیم تھی میں ہمیشہ سے اس گھر میں اپنائیت اور خلوص بھرے جھگڑے چاہتا تھا ایسے جھگڑے جن سے پیار بڑھے محبت پروان چڑھے، میری تمنا تھی کوئی مجھ سے بھی لڑے جھگڑے بگڑے روٹھے اور پھر گھل مل جائے لیکن بدقسمتی سے اللہ میاں نے کوئی بہن بھائی ہی نہ دیا جس کے ساتھ مل کر میں اپنی یہ حسرت نکالتا مگر اس دن تمہیں دیکھ کر جانے کیوں پہلی ہی نظر میں اپنائیت کا احساس جاگا تھا تم

اچانک ہی دل سے اتنے قریب محسوس ہوئی تھیں کہ بے اختیار تم سے لڑ جانے کو دل مچل اٹھا تھا مگر تم تو ایسی مٹی کی مادھو تھیں کہ میری بری سی بری بات بھی خاموشی سے برداشت کر لیتی تھیں کبھی لڑتی ہی نہ تھیں اسی لئے میں نے عہد کر لیا تھا کہ تمہیں لڑا کر رہوں گا اور آج جبکہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو تم ناراض ہو گئی ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں صنم کہ وہ سب مذاق تھا محض مذاق۔"

شدت جذبات سے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی آخری فقرہ کہتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"مگر آپ تو زرین سے محبت کرتے ہیں زرین کو چاہتے ہیں۔" وہ ابھی تک شکوک و شبہات کے سمندر میں بہہ رہی تھی۔

"نہیں صنم نہیں۔ صرف تمہیں چڑانے کو کہا تھا وہ بھی مذاق ہی تھا۔" اس نے بڑے جوش سے انہیں یقین دلایا۔

"کیا پتہ یہ بھی مذاق۔" اس کے دل میں ایک نئے خدشے نے سر ابھارا۔

"اُف۔" وہ سر تھام کر رہ گیا۔ "تمہیں کس طرح یقین دلاؤں اچھا یہ بتاؤ تمہیں میری آنکھوں میں میرے انداز میں پیار کبھی دکھائی نہ دیا؟" اس نے جنونی انداز میں اس کے دونوں ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے انکار میں سر ہلا دیا۔

"یہی تو تمہاری نظروں کا پھیر ہے۔" اس کا لہجہ شکایت سے بھرپور تھا۔ "اچھا سنو اس دن تیز بارش والے دن جو میں ساری رات جاگتا رہا تو کس کی خاطر اور اس سے پہلے پارٹی والے دن جب میں نے تمہاری پریشانی دیکھ کر امی کو بھیج دیا تو کس لئے اور اسی دن جب میں نے تمہیں دوسرے لڑکوں سے باتیں کرنے کو منع کیا تھا تو کس جذبے کے تحت اسی لئے نا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری پسند میری محبت میں کوئی اور دلچسپی لے اور سنو اس روز جو تمہیں شادی سے انکار کر دینے کو کہا تھا تو اسی وجہ سے نا کہ تمہیں تو میں اپنانا چاہتا تھا پھر یہ کیسے گوارہ کرتا کہ تم کسی اور کی ہو جاتیں۔ ایسی ہزاروں چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں صنم تم نے کبھی محسوس کرنے کی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ ضرور جان لیتیں میرے دل میں امڈتے ہوئے پیار کے جذبے کو ضرور پہچان لیتیں اور پھر ان سب باتوں کو چھوڑ کر آج ہی کی بات لے لو ایمان سے تم نے ابتک کچھ نہیں کھایا تو میں بھی ویسے ہی بیٹھا ہوں حالانکہ اتنے زور کی بھوک لگ رہی تھی مگر تمہارے بغیر کچھ کھانے کو جی ہی نہ چاہا۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت دھیمے انداز میں اسے گذری ہوئی باتیں یاد دلا رہا تھا، اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا اور وہ سحر زدہ سی بیٹھی سن رہی تھی اسکا چہرہ اس کی آنکھیں اس کے انداز اور اسکا ایک ایک جملہ اس کی سچائی کی گواہی دے رہا تھا اس کے بے لوث پیار کا مظہر تھا اور اس کی دیوانہ وار محبت کا ٹھوس ثبوت پیش کر رہا تھا اور اس حقیقت کا یقین ہو جانے کے بعد اس کا دل مسرت سے لبریز اور روح سرشار ہوئی جا رہی تھی انگ انگ فخر و انبساط سے جھوم اٹھا تھا آپ ہی آپ اس سے شرم سی آنے لگی نظریں حیا کے بوجھ سے جھک جھک گئیں۔

"بتاؤ نا صنم تمہیں میری بات پر یقین آیا کہ نہیں۔" اسے خاموش سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر بیتابی سے پوچھا۔

اور صنم کو ایکدم ہی شرارت سوجھ گئی اس نے اتنے دن تک جو اسے پریشان کئے رکھا تھا تو تھوڑا بہت حق تو اسے بھی پہنچتا تھا اسے ستانے کا۔ اچانک ہی وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھ گئی اور نظریں جھکائے جھکائے بڑی کرختگی سے بولی۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں جو میں نے فیصلہ کیا ہے اس کو ترک نہیں کر سکتی۔"

"یا اللہ میں پاگل ہو جاؤں گا اپنا سر پھوڑ لوں گا۔" وہ دیوانگی کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر چیخ سا پڑا تو صنم کو بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ اور وہ اس کی مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ گیا پورے جسم میں سکون و طمانیت کی لہر سی دوڑ گئی مگر اس سے کچھ کہے بنا کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی لاپرواہی سے بولا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی مگر ذرا جلدی چلی جاؤ کیونکہ آسمان پر بڑے گہرے گہرے بادل چھائے ہیں زبردست گرج چمک کے ساتھ بارش ہوگی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بارش کی وجہ سے تمہیں رکنا پڑے۔" بڑی سنجیدگی سے آسمان کو تکتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"واقعی۔" اس کی بات سن کر وہ تیزی سے قریب آئی اس کے برابر ہی کھڑکی میں کھڑے ہو کر آنکھیں پھیلا

آسمان دیکھنے لگی. مگر اندھیرے میں بھلا بادل کہاں نظر آتے مایوسی سے پاسر کی طرف دیکھا تو وہ والہانہ نظروں سے تکتے ہوئے بڑی دلکشی سے مسکرا رہا تھا وہ بھی جھینپ کر مسکرا دی. سمجھ گئی تھی کہ جھوٹ بول رہا ہے.

"کیوں نہیں جا رہی ہو؟" اس نے انگلی سے اس کا چہرہ اٹھایا آنکھوں میں جھانک کر پوچھا.

اس نے بڑے شرمیلے انداز میں گردن نفی میں ہلا دی.

"گڈ ویری گڈ۔" اس نے سرشار سے اس کے ہاتھ تھام کر زور سے دبائے. گھبرا کر اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا.

"ہوں ہوں خبردار جو ہاتھ چھڑایا۔" اس نے پہلے والے انداز میں حکم دیا چند لمحوں تک غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی بڑی سنجیدگی سے بولا.

"اسے اتارنا نہیں سمجھیں۔"

"یہ بہت ڈھیلی ہے کہیں گر جائے گی۔" وہ پریشانی سے بولی. واقعی اس کے ہاتھ میں اس کی موٹی مردانہ انگوٹھی بہت ڈھیلی تھی.

"چھوٹی کرا دوں گا۔" وہ پیار چھلکاتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا.

"وہ... وہ سنیئے۔" وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی "جس دن پھوپھی جان آئیں گی میں یہ انگوٹھی اتار دوں گی۔" بڑی ہمت سے اس نے کہہ ہی دیا.

"کیوں؟" اس نے آنکھیں نکالیں.

"مجھے شرم آئے گی۔" وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا.

"پاگل انہیں سب کچھ پتہ ہے ان سے کیا چھپانا۔" وہ پیار سے اس کے بال بکھرا کر مسکرایا.

اس کے سارے چہرے پر سرخی سی پھیل گئی.

اور وہ نہایت دلچسپی سے اس کے چہرے پر پھوٹتی شفق کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا.



بزدل

بشریٰ دعا



اپنی بہت پیاری نیرہ کے نام جس کو میرے خلوص پر شک ہے۔

تکیوں میں منہ چھپائے وہ کتنی دیر سے مسلسل زیب کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نورتن شاپنگ کے لیے جا رہی تھی چابیوں کا گچھا گھماتی وہ اس کے قریب آئی اسے مدہوش دیکھ کر احتیاط سے کمبل اس پہ ڈال کے وہ دبے قدموں سے باہر نکل گئی۔ نوبل جب مطمئن ہو گیا تو اس نے منہ اوپر اٹھایا سوز سے آنکھیں جل رہی تھیں، زخمی روح کی آنچ آنکھوں میں سلگ رہی تھی وہ آج سے ٹھیک پانچ ماہ پہلے بھی اسی طرح تکیوں میں منہ چھپائے پڑا تھا جب امی زور شور سے اس کی شادی کا سوانگ رچانے میں مصروف تھیں ان دنوں اس گھر میں نورتن کے ہنگامے نہ تھے۔ انجو چپکے چپکے بھیا کی شادی کے کارڈ بکھیرے بیٹھی تھی نوبل جو ازل سے بزدل تھا بچپن سے ہی ڈرا سہما بڑا ہی فرمانبردار قسم کا بچہ جس نے کبھی اماں کے سامنے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھا۔ بابا بچپن میں ہی جدائی کا درد دے گئے اور اس نے ساری توجہ ساری محبت صرف اماں سے وصول کی تھی، دادی اماں انکے پاس رہتی تھیں۔ آج سے پانچ ماہ پہلے جب وہ اپنی کم ہمتی پہ ندامت سے چور چور تکیوں میں منہ چھپائے پڑا تھا تو انجو نے آہستہ سے اس کی مردانگی پہ گہری چوٹ لگائی تھی۔

"بھیا ایک کارڈ زیب کو بھی بھیج دوں؟"

نوبل نے تڑپ کر نگاہ اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں کسی زخمی تمنائیں تھیں، آہوں کا منجمد دھواں تھا۔ انجو بینڈل بند کرتے ہوئے چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔ کاش نوبل بھائی تم اتنے کم ہمت نہ ہوتے۔ انجو کارڈ دے کر جانے لگی تو ایک بار پھر مڑی ایک زخمی نگاہ مجھ پر ڈالی شادی کے سنہری کارڈ اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگے اس کے لرزتے ہونٹوں پر بہت شکوے مچل رہے تھے مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور چلی گئی۔ وہ بھی دکھی تھی، مگر نوبل کا دکھ تو اس سے سوا تھا یہ دکھ تو اس کی اپنی ذات کا دکھ تھا جو روح میں کہرام مچا رہا تھا جس نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس وقت نورتن موجود نہ تھی ابھی اماں اس کے سوا گت کے انتظام کر رہی تھیں۔ انجو چلی گئی پیاری سی بہنا روتے ہوئے شادی کے کارڈ تقسیم کرنے گئی۔ بہنوں کو کتنے ارمان ہوتے ہیں لیکن وہ تو رو رہی تھی! اور نوبل بھی رو رہا تھا۔ دل کے زخمی تار سے زیب زیب کی آوازیں آ رہی تھیں دل تنہائی سے فائدہ اٹھا کر محو گفتگو ہو گیا تھا۔ ضمیر کچوکے لگانے لگا تھا۔ نوبل اپنی بے بسی اور بزدلی پر خود ہی کڑھ رہا تھا۔ دل بار بار طنز کرتا "جب نے حالات کے آگے سپر ڈال کے اسے گنوا ہی دیا ہے نوبل تو اس کے متعلق بار بار مت سوچو اسے ایک جھوٹے سپنے کی طرح خاموش کر دو تم نے اسے چاہا ضرور تھا مگر وہ تمہاری منزل نہ تھی۔ منزل انکے نصیب میں ہوتی ہے جو ہمت اور ثابت قدمی سے اس کی جانب بڑھتے ہیں"

نوبل نے کروٹ بدلی، کیلنڈر پہ نگاہ ڈالی۔ آج واقعی ۲۷ تاریخ تھی۔ اور زیب —— آج سے پانچ ماہ پہلے اس کی زندگی سے چپکے چپکے نکل گئی تھی ماضی اس کی نگاہوں میں رہ گیا۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں یوں کھویا کہ اماں اور نورتن کا خیال مٹ گیا۔ نوبل کو وہ خواب سے لمحے یاد آ گئے جب سہمی سہمی زیب منہ میں انگوٹھا دیتے انکے گھر آئی تھی وہ ان دنوں تقریباً دس سال کا تھا لمبا سا فراک پہنے وہ چپ چاپ نگینہ پھوپھو کا دوپٹہ پکڑے کھڑی تھی۔ نگینہ پھوپھو رو رو کے اسے ساتھ لے جانے پر بضد تھیں مگر دادی اماں نے اس ننھی منی پوتی کو اپنے بیٹے کی امانت سمجھ کے کلیجے سے لگا لیا نوبل ان دنوں اتنا چھوٹا نہ تھا مگر سمجھدار ضرور تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شبیر چچا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ اپنے تین بیٹوں اور بیوی کے ساتھ ملک عدم کو سدھار گئے ہیں۔ حادثہ اتنا ہولناک تھا کہ خاندان بھر میں کہرام مچ گیا تھا زیب بد نصیب بچ گئی اور آج وہ چپ چاپ مجرم بنی نگینہ پھوپھو کے آنچل سے لپٹی کھڑی تھی پھر وہ اس گھر میں رہنے لگی جہاں اسے اماں کی شفقتوں کے ساتھ ساتھ دادی کا دلار بھی ملا۔ وہ بہت ہی بے ضرر اور معصوم بچی تھی بہت جلد اس نے گھر میں اپنے لیے جگہ بنا لی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رو دیتی کئی دفعہ چیخ کر اٹھ جاتی اور اس سمے دادی اس سہمی چڑیا کو کلیجے میں

چھپا لیتیں۔ چھوٹی عمر سے ہی اس نے گڑیوں کو تیاگ دیا اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے وہ کئی کام کرتی سکول سے آکر انجو کے ساتھ کھیلتی شام کو اکثر وہ دادی کو کہانیاں سُناتی اور اس سمے نوید بھی پاس بیٹھ جاتا وہ محسوس کرتا زیب کی ہر کہانی میں ایک چھوٹی بچی اکیلی رہ جاتی اور وہ اماں کو خواب میں دیکھ کر روتی۔ دراصل زیب تین بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ امی کی لاڈلی تھی اور اس کے ذہن میں یہی بات آئی تو وہ بار بار ایسی لڑکی کی کہانی سناتی جس کی ماں بچپن میں ہی مر گئی اور یہ کہانی سناتے وقت اس کے چہرے پہ کئی رنگ آتے اور جاتے، دادی اماں نماز شروع



کرتیں تو وہ چپکے چپکے زیب کو باغیچے میں لے جاتا اور پوچھتا۔
"کیا تمہیں شفقت چچی بہت اچھی لگتی تھیں؟"
وہ ہولے ہولے سر ہلاتی اور بے تحاشہ بہنے والے آنسوؤں کو فراک کے دامن سے پونچھ لیتی۔ تائی اماں اسے بہت پیار کرتی تھیں مگر وہ ابھی تک اپنی ماں کی خوشبو نہیں بھولی تھی اپنے بھائیوں کو نہیں بھولی تھی جو ایکدم اس سے روٹھ گئے تھے جو بھی زیب کو دیکھتا ٹھنڈی آہیں بھرتا اس کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی شعور بیدار ہوتا گیا گھر کے بہت سے کام اس نے بن کہے سنبھال لیے۔ میٹرک کے بعد اس نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ سلائی کڑھائی میں اس نے مہارت حاصل کی۔ باغیچہ اس نے طرح طرح کے پھولوں سے آباد کیا گھر میں ایک مخصوص قسم کی نفاست آگئی وہ بڑی تندہی سے سب کام کرتی۔ اماں کے بہت سے کام وہ کرتی، انجو کی سہیلیاں اس کی بنائی ہوئی چائے پہ مرنے لگیں دادی اماں کا وضو تک وہی کرواتی، نوفل کے سب کام اس کے ذمہ تھے مگر وہ پھر بھی گھر میں یوں صاف ستھری رہتی کہ لوگ مانتے ہی نہ کہ وہ اتنے کام کرتی ہے۔ وہ اتنے میٹھے اتنے ٹھنڈے مزاج والی تھی کہ جو بھی دیکھتا اس کی تعریف ہی کرتا۔

ان ہی دنوں اس پر ایک قیامت ٹوٹی دادی اماں بھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں وہ تڑپ تڑپ کر روئی اور رو رو کر تڑپی۔ ماں کے بعد وہ اس وجود سے بہت مانوس تھی دادی اماں کی موت نے اسے بیمار کر دیا دو ماہ بستر سے نہ اٹھی۔ تائی اماں نے سو طرح اس کی دلجوئی کی۔ انجو اپنی پیاری آپی کی بیماری سے پریشان ہو گئی سب ہی اس کی علالت سے پریشان تھے انہی دنوں راتوں کو جب وہ بے طرح تڑپتی اور امی ابو کو یاد کرتی دادی اماں کے لیے بچوں کی طرح مچل مچل کے روتی نوفل نے اس کے اشک اپنے دامن سے پونچھے۔ وہ پہلے بھی نوفل کو بہت اچھی لگتی تھی مگر اب تو اس نے بیمار زیب کی اس طرح مسیحائی کی ایسے انداز سے اس کی اشک شوئی کی یوں اس کے لہولہو دل پہ پیار کا مرہم رکھا کہ وہ از سر نو جینے کی تمنا کر بیٹھی وہ ایسا چارہ گر تھا جس نے اس کے زخموں کو دل کا نذرانہ پیش کیا اور یوں دل کی سونی کائنات میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ تبسم نا آشنا لبوں نے مسکراہٹوں کے خزانے لوٹ لیے۔ آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ جلنے لگے اور وہ بدلی ہوئی کائنات کے حسین رنگ میں کھو گئی۔ انجو نے کئی بار بھیا کو آپی کی مسیحائی کرتے دیکھا تھا۔ کبھی بھیا کی کوئی سرگوشی جب آپی کے چہرے پر دھنک رنگ بکھیر دیتی تو وہ پورا آنکھوں سے انہیں دیکھتی۔ جب وہ انجو کے سامنے ہی بیباک ہو جاتا تو زیب گھورتی۔۔۔۔ نوفل ایک بے ساختہ قہقہہ لگاتا اور انجو کو پکڑ کر پاس بٹھا لیتا۔

"ارے یہ تو اپنی انجو ہے زیب اس سے شرمانا کیا۔"

زیب کی زندگی میں چمکنے والا وہ پہلا چاند ——— پرخلوص نوفل ——— وہ جو دل کا رازداں تھا ——— اس کے دلنواز جملے اس کی پرخلوص باتیں زیب کا سرمایہ تھیں سارا دن وہ کاموں میں الجھی رہتی، ہنستے مسکراتے اپنے فرائض ادا کرتی رہتی نوفل جب آفس سے آتا تو گرم گرم چائے لے کر جاتی وہ کوئی سندر سا جملہ کہہ دیتا لطیف انداز میں روح کے تاروں کو چھیڑتا تو اس کے طویل انتظار کو جیسے صلہ مل جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ سارا دن صرف اسی معاوضے کے لیے کام کرتی رہی ہو۔ وہ جب اپنائیت سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اس کے کاموں کو سراہتا۔ اس کی تھکن کا احساس کرتا تو زیب کی روح تک سرشار ہو جاتی۔ نوفل اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی چائے پلاتا چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا آفس کی ساری باتیں اسے سناتا۔ دن یونہی گذرتے گئے دل کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ریکھائیں ملن کا پتہ ہی نہیں دیتیں۔ ان دونوں دونوں ہی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ قسمت ان کی راہوں میں پھول بچھائے گی، انہی دنوں نوفل کو آفس کی طرف سے چھ ماہ کے کورس پر کراچی جانا پڑا تو وہ خود الجھ گیا وہ دل ہی دل میں سوچتا شاید زیب جدائی کی اس طویل شام سے گھبرا جائے مگر وہ بہت ہمت والی نکلی خاموش خاموش وہ اس کی تیاری کرتی رہی۔ اس کی خاموشی سے تنگ آکے نوفل نے خود ہی بات چھیڑی۔

"میں چھ ماہ کے لیے جا رہا ہوں زیبو۔ اداس تو نہیں ہو جاؤ گی!" نوفل نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "میں تو اس تصور سے ہی گھبرا رہا ہوں بتاؤ تم اتنے دن کیسے گذارو گی؟"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے آنکھیں اوپر کیں کمال کا ضبط تھا۔ اداس آنکھیں نوفل پر جماتے ہوئے حسرت سے مسکرائی:

"دیوار پر لگا یہ کیلنڈر دیکھ رہے ہیں نا، ہر گزرنے والے دن پہ نشان لگا کے میں دل کو تسلی دے لوں گی کہ اب جدائی کا ایک دن کٹ گیا۔"

نوفل نے بیتاب ہو کے ان ساحر آنکھوں میں جھانکا تھا۔ میں نوفل کی چاہت دیپ بن کے روشن تھی۔ چھ ماہ وہ کراچی رہا واپسی پہ اماں انجو کے لیے چیزیں خریدیں زیب کے لیے

شاکنگ پنک کی ساڑھی اور شاکنگ پنک لپ اسٹک خریدیں اور اچانک ہی آگیا۔ زیب کچن میں مصروف تھی انجو کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں وہ ٹرے لیکر بڑھی تو ایکدم سامنے نویل کھڑا تھا دل خوشی سے دھڑک دھڑک کر بے قابو ہونے لگا اس کے چہرے پہ پھیلے دھنک رنگ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اس کی خوشیوں کی ترجمان تھی چمکتی آنکھوں میں سارے جذبے سموئے فرقتوں کے سارے راز بساتے وہ ایک ٹک نویل کو دیکھے جا رہی تھی نویل نے آگے بڑھ کے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"کچھ تو بولو زیب۔ دیکھو میں آگیا ہوں۔"

ایک آسودہ مسکراہٹ لبوں پہ سجا کے اس نے آہستگی سے خود کو چھڑایا۔

"آپ کمرے میں چلئے میں اماں اور انجو کو بتاؤں۔"

اپنے کمرے میں جا کے دل خوش ہو گیا صاف ستھرا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں بھی موجودگی کا تاثر دے رہا تھا نویل کی روح تک سرشار ہو گئی۔ اس نے سوچا دل تک رسائی کے بہت سے راستے ہوتے ہیں شاید زیب ہر راستے سے واقف ہے۔

انجو اور اماں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اماں نے بلائیں لیتے ہی اسے سنا دیا کہ اب وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ شادی کے نام پر اس نے کنکھیوں سے زیب کی طرف دیکھا۔ انجو نے شرارت سے زیب کو دیکھ کر آنکھ دبائی۔ وہ جھینپ گئی، کانپتے ہاتھوں سے چائے بڑھائی اور باتھ روم میں اس کے کپڑے رکھنے چلی گئی۔

شام ڈھلے وہ سو کر اٹھا۔ مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتی زیب چائے لے کر آگئی۔ چائے کے ساتھ خاص اہتمام تھا۔ نویل نے اٹیچی میں سے اس کا پیکٹ نکالا سنہری بارڈر والی شاکنگ پنک ساڑھی اور لپ اسٹک نکالی۔ اپنا تحفہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی نویل نے ایکدم پہن کر دکھانے کی فرمائش کر دی تو وہ گھبرا گئی۔

"نہیں نویل بغیر کسی فنکشن کے اتنے شوخ کپڑے کیسے پہنوں؟"

"کیا ہے ایک تو تم پاکستانی لڑکیوں پر ہر دم مشرقیت سوار رہتی ہے شادی سے پہلے شوخ کپڑوں اور لپ اسٹک سے الرجک رہتی ہیں۔" نویل جھلایا۔ "تو کیا اب شادی کے بعد پہنو گی یہ ساڑھی؟"

زیب نے شرما کے سر ہلایا۔

"اور شادی نہ ہوئی تو؟" نویل شرارت سے بولا۔

"تو پھر جب شادی کی امید نہ رہی تو اسی دن پہن لوں گی۔"

زیب مسکرائی۔

اچھے دنوں کی امید میں بہت سے دن گذر گئے۔ انہی دنوں شمسہ خالہ کے میاں ٹرانسفر ہو کے لاہور آ گئے۔ خالہ کا نویل کے گھر بہت آنا جانا ہو گیا ان کی فتنہ ساماں بیٹی نورتن نویل کے گرد حصار کھینچنے لگی، وہ کترا تا رہا۔ وہ تو اپنی زیب کی امانت تھا۔ اس کے ٹوٹے دل کا سہارا تھا، اس کے زخموں کا چارہ گر مسیحا تھا وہ بھلا کیسے اس سے منہ موڑ لیتا۔ شمسہ خالہ بات بے بات زیب کو ٹوکتیں۔ جب آتیں زیب اور نویل پر کڑی نگاہ رکھتیں۔ اماں خاموش رہتیں۔ انجو کڑھتی رہتی مگر نویل کبھی خالہ کے سامنے نہ بول سکتا۔ کبھی زیب کی حمایت میں نہ بولتا۔ وہ دل ہی دل میں کئی باتیں سوچتا کئی طرح کے جواب دینے کا فیصلہ کرتا مگر خالہ اور اماں کے سامنے جھاگ کی طرح مٹ جاتا۔ زیب تو ان دنوں کچھ چپ چپ رہنے لگی تھی انجو اماں کے رویے پہ حیران ہوتی رہتی۔

وہ ایک بہاروں میں مہکی گلابی شام تھی۔ انجو اور زیب گھر پر موجود نہ تھیں انجو کی سہیلی نے انھیں برتھ ڈے پہ مدعو کیا ہوا تھا۔ نویل آفس سے آیا تو خالہ اور اماں کو سر جوڑے بیٹھے دیکھا۔ اماں نے اسے چائے کی پیالی تھما دی۔ وہ پیالی لے کر اٹھا ہی تھا کہ خالہ نے بٹھا لیا۔ ابھی وہ اس پل بیٹھنے کا مطلب بھی نہ سمجھا تھا کہ اماں نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی۔

"نویل بیٹے اب تم کماؤ ہو باپ تمہارا مجھے بہت پہلے چھوڑ گیا تھا میں نے زندگی بھر کوئی خوشی نہیں دیکھی اب میری حسرت ہے کہ تمہارے سہرا باندھ لوں، پھر انجو کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے۔ نورتن تیری خالہ زاد ہے ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے میں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا ہے اب تو یہ بتا دے کب تک شادی کی تاریخ مقرر کروں؟"

نویل گھبرا گیا اس نے حیران ہو کے سر اٹھایا اور ماں کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماں یہ فیصلہ سادگی میں کر رہی ہیں یا دیدہ و دانستہ اسے بے موت مار رہی ہیں۔ مگر اماں کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا وہ الجھ گیا کیا اماں اتنی ہی نا سمجھ ہیں وہ زیب کے ساتھ میری وابستگی نہیں جانتیں جب اس کی سوچ طویل ہو گئی تو خالہ نے سکوت توڑا۔

"بیٹا تم تو لمبی سوچ میں پڑ گئے۔"

نویل نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"اماں آپ نے میری شادی کا ارمان بھی دل میں بسایا اور

انجو کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتی ہیں مگر زیب کے متعلق آپ نے کوئی فیصلہ ......"

"بیٹے یہ ہمارے سوچنے کی باتیں ہیں۔" خالہ نے جملہ اچک لیا۔

"اماں زیب کو ہمارا سہارا چاہیئے۔" وہ دبے دبے لفظوں میں احتجاج کرنے لگا۔ خالہ نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا۔ اور بہت پیار سے نوفل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ آجکل کے لڑکوں کی طرح تو بھی عشق کا دُم چھلا ساتھ لگائے پھرتا ہے۔ زیب تمہارے ٹکڑوں پہ پلنے والی لڑکی ہے جس کی اوقات ایک ملازمہ سے زیادہ نہیں تم اس کے لئے اتنے فکر مند کیوں ہوتے ہو؟"

"لیکن زیب کو اس گھر میں ایک حیثیت حاصل ہے۔" نوفل نے تردید کرنا چاہی۔

"یہ سب آپا جان کی مہربانیاں ہیں جو اس منحوس لڑکی کو گھر میں رکھے ہوئے ہیں ورنہ اس کا سایہ ہی ایسا ہے کہ لوگ پناہ مانگیں۔ اگر تم نورتن کے ساتھ شادی نہ کرنا چاہو تو الگ بات ہے مگر شادی تمہاری زیب کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتی۔ تمہیں نہیں معلوم تین لڑکوں کے بعد پیدا ہونے والی لڑکی کتنی منحوس ہوتی ہے جب وہ کچھ اوپر ہوتی ہے تو خاندان پر کسی بجلی کی طرح گرتی ہے۔ ثبوت سامنے ہے وہ بڑی ہوئی اور ماں باپ اپنے تینوں بھائیوں پر قہر بن کے ٹوٹی۔ اب میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ نحوست کا ڈھیر تم زندگی بھر کے لئے خود پر مسلط کر لو۔"

خالہ نے لمبی چوڑی تقریر کی۔ اماں تو سدا کی توہم پرست تھیں بہن کی ہاں میں ہاں ملاتی گئیں۔ نوفل حیران رہ گیا اماں تو زیب پر فدا تھیں یہ خالہ نے کیسے ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ نوفل نے نظروں میں التجا سمو کے اماں کو دیکھا مگر وہ تو سفاک بنی بیٹھی تھیں اس کے خاموش پیغام پر فیصلہ سنانے لگیں۔

"نوفل تم میری بیوگی کی تمام پونجی ہو اگر تمہیں زیب سے اتنی محبت ہے تو پھر مجھے چھوڑ دو، میرے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھو، انجو کو بے سہارا کر دو، میری جائیداد، زیور اور کپڑوں سے دستبردار ہو جاؤ۔ اگر تم زیب کے سوا زندہ نہیں رہ سکتے تو میں آج ہی انجو کو لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اور یاد رکھو دودھ بھی نہ بخشوں گی مرتے دم تک تم سے ناراض ہی رہوں گی اور روز حشر تمہارا گریبان پکڑ لوں گی۔"

اماں منہ پر پلّو ڈال کے رونے لگیں۔ نوفل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دل و دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔ دل کہتا اٹھ کر ماں کے پیر پکڑ لو۔ اسے سمجھاؤ کہ اس جنت سے بے دخل ہونا بھی موت ہے اور زیب کو ٹھکرانا بھی سولی پہ چڑھنے کے برابر ہے۔ بزدل دماغ سب ہتھیار پھینک بیٹھا۔ جگ ہنسائیوں سے ڈر گیا۔ اطاعت اور سعادت مندی کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے۔ اونچے مقام چھوڑ کر نافرمانی اور بغاوت کی دلدل میں اترنا اسے بہت ہی مشکل لگا۔ دل بار بار اپنی مجبوری کا احساس دلانے لگا، وہ پوری طرح سے زیب زیب چلانے لگا مگر عقل نے اسے لاجواب کر دیا۔ وہ زمانے کی مجبوریوں کا احساس دلانے لگی۔ دراصل انسان سب ہی بزدل ہوتے ہیں اوپر سے لاکھ بہادری کے خول چڑھائے رکھیں حقیقت میں سب اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ لفظوں سے ڈرتے ہیں اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ اچھے لفظوں کی توقع کرتے ہیں۔ اور دنیا میں اچھا کہلانے کے لئے کبھی کبھی دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی بھی نیلام کر دیتے ہیں۔ نوفل بھی انسان تھا بزدل نکلا وہ باوفا نہ بن سکا فرمانبردار بیٹا بن گیا۔ وہ لوگوں کے اندھے نظریات سے ڈر گیا اس نے زندگی کو ٹھکرا کر خود ہی موت کو گلے سے لگا لیا۔ زیب کے بغیر زندگی زندگی کب تھی موت تھی۔ مگر وہ چند لمحوں میں سب کچھ ہار کے فیصلہ نورتن کے حق میں کر بیٹھا دل کی بساط لٹ گئی اجڑ گئی تو وہ پشیمان سا اپنے کمرے میں آگیا۔ خالہ خوشی خوشی گھر واپس چلی گئیں۔ انجو اور زیب واپس آئیں تو اماں نے انجو کو سب کچھ بتایا اس نے رو رو کے کہرام برپا کر دیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں آئی اس سے سب کچھ پوچھا نوفل بزدل بنا بیٹھا رہا۔ اس کا سر احساس جرم سے جھکا ہوا تھا۔ انجو اس کی خاموشی پہ دیوانی ہو گئی۔ زیب نے آکر اسے سنبھالا وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔ آنکھیں جھکائے ہوئے وہ بڑی ہی ویران ویران لگ رہی تھی۔ دوسرا دن بڑا ہی قیامت کا تھا۔ انجو نے رو رو کے آنکھیں سجا لی تھیں۔ زیب بہت ہی خاموشی سے گھر کے سب کام کرتی پھر رہی تھی اماں بہت خوش تھیں دو دن بعد منگنی تھی، اماں ہر کام کے لئے بار بار تاکید کر رہی تھیں، وہ اپنا آپ مٹا کے سب کاموں میں پیش پیش تھی۔ انجو منہ لپیٹے پڑی تھی زیب اپنے ارمانوں کا لاشہ اٹھائے اماں کے ساتھ سب کام کروا رہی تھی اماں خود بازار گئیں اور زیب کو دوپٹہ دے گئیں کہ وہ گوٹا لگا

وہ برآمدے میں دوپٹہ لے کر بیٹھی اس پر گوٹا لگا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا بار بار۔ آنکھیں مل کے پورے انہماک سے دوپٹہ بنانے لگتی۔ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تو وہ کبھی بھی نہ تھی مگر قسمت یوں پر کے لگاتے کی یہ اُسے امید نہ تھی۔ وہ یونہی خیالوں کے تانے بانے میں الجھی بیٹھی تھی کہ نوبل آگیا۔ نوبل کو دیکھ کر وہ پھر دوپٹہ بنانے لگی ایک اداس نگاہ اس پر ڈال کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ پھر دو قدم واپس آکر اسے اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اٹھی وہ اس ستمگر کا کوئی بھی حکم بغیر مانے نہیں رہ سکتی تھی۔ نوبل بیڈ پہ بیٹھا تھا۔ زیب اس سے کچھ فاصلے پہ قالین پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے وہ سوچتا رہا۔ تمہید باندھتا رہا۔ دل ہی دل میں جملے دہراتا رہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ آخرکار اپنی ہمت جمع کر کے بولا۔

"زیب یہ جو کچھ بھی ہوا میری مرضی کے خلاف ہوا۔ اماں نے دودھ نہ بخشنے کا تہیہ کر لیا تو میں نے ہار مانی۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم سے جدا ہونا بھی میرے لئے سوہان روح ہے مگر مجبور ہوں۔ سارا دن میں سوچ سوچ کے پاگل ہو گیا ہوں۔ تمہارے لئے پریشان ہوں۔ تم کہاں جاؤ گی؟ تمہارا کیا بنے گا؟ میری مانو زیب۔"

وہ رُکا۔ زیب ٹکر ٹکر اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"میری مانو زیب تم بھی شادی کر لو۔"

نہایت احمقانہ جملہ اس کے منہ سے نکلا۔ زیب ساکت سی اُسے تکی گئی اور پھر تو جیسے اس پر دیوانگی طاری ہو گئی —— وہ ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی نوبل پہ جھپٹ پڑی۔ اس کا گریبان پکڑ کے جھنجھلے دبتی ہوئی وہ دیوانی دیوانی انکھیاں اس پہ جمائے ٹھہری جامد آواز میں سوالوں پہ سوال کئے جا رہی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو تم — بتاؤ کم ظرف —— یہ کیسا سبق مجھے دے رہے ہو یہ ہرجائی پن جو تم جیسے بزدل مردوں کا شیوا ہے اپنے پاس رکھو مجھے تم سے نفرت ہے —— مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہے کہ میں تم جیسے ہیچ انسان کو پوجتی رہی ہوں — تم مرد شیشہ گری کے فن سے ناواقف ہوتے ہو۔ تم سجے بنائے شیش محل کو کرچی کرچی تو کر سکتے ہو، مگر اپنی ہمت سے کھنڈر کو شیش محل نہیں بنا سکتے۔"

اس کا نازک وجود شدت غم سے ہچکولے کھا رہا تھا — یونہی بلکتی جھکتی وہ اوندھی گری۔ نوبل ساکت کھڑا رہا۔ چند لمحے کمرے میں ناقابل برداشت سکوت طاری رہا پھر وہ اس وقت چونکا جب وہ اس کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھے جھکی جھکی سسک رہی تھی

"بتاؤ تم نے ایسا کیوں کہا —— کیوں کہا تھا —— ؟ کیا میں تم جیسی ہوں —— ایسا کیسے کروں؟ کیا میں ایسا کر سکوں گی؟ کیا میں کسی اور کی دلہن بن سکوں گی؟ دلہن بن کے کیسے جاؤں؟ دلہنیں تو گھونگھٹ میں منہ چھپا کے جاتی ہیں —— مجھے بتاؤ میں تار تار آنچل کا گھونگھٹ کیسے بناؤں؟ وہ اجنبی جو مجھے زندگی بھر کا تحفہ دے گا اس کے پاس خالی ہاتھ کیسے چلی جاؤں۔ جب ہاتھوں میں وفا کی مہندی نہ ہو گی۔ آنکھوں میں چاہتوں کا کجرا نہ ہو گا۔ مانگ میں آرزوؤں کا سیندور نہ ہو گا تو ایسی لٹی لٹی دلہن کو کون قبول کرے گا؟ سارے مرد تمہاری طرح بزدل نہیں ہوتے سارے مرد اپنی ماؤں سے اتنا نہیں ڈرتے۔ وہ میری اجڑی صورت دیکھ کر ماں سے ڈر کے چپ نہیں ہو جائے گا اور —— شادی کوئی کھلونا نہیں۔"

زیب کی سسکیوں میں ڈوبی اونچی اونچی آوازیں نوبل سُن رہا تھا —— غور سے دیکھا وہ تو سونا نہیں کندن بنی کھڑی تھی۔ دل چاہا اسے اٹھا کر دل کے سونے آنگن میں چھپا لے جس نے من کے ویرانوں میں چپکے چپکے آرزوؤں کی بستیاں بسائی تھیں دنیا کتنی بیدردی سے اسے چھین لینا چاہتی تھی نوبل حیران تھا وہ الھڑ سی لڑکی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی وہ کیسے اس کی ذات کو طنز کے تیروں سے چھلنی چھلنی کر رہی تھی۔ نوبل واقعی مجبور تھا۔ اور اس سے زیادہ بزدل بھی۔ کیا کرتا ماں کو چھوڑتا یا اُسے —— نوبل کا بے بس دل شدت ضبط سے پھٹ رہا تھا۔ دل چاہا اس کی اتنی باتوں کے جواب میں اور کچھ نہ ہو سکے تو اپنا پھڑپھڑاتا دل اس کے وجود میں رکھ دے تاکہ وہ اس کے کرب و سوز اس کی تڑپ سے خود ہی واقف ہو جائے لیکن شاید یہ کام بھی نوبل کے بس کا نہ تھا۔ نوبل کی خاموشی سے تنگ آکے وہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے باتھ روم میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ نکلی تو نوبل اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سیاہ زلفوں کے ہالے میں شدت گریہ سے گلابی گلابی چہرہ اس کے دل میں ہلچل مچا گیا۔ اس کی کنول جیسی آنکھوں میں ابھی تک نمی تھی۔ عنابی ہونٹوں پر معمولی لرزش کا گمان ہوتا تھا، ننھے ننھے قدم اٹھاتی وہ کمرے سے یوں نکل گئی جیسے سب تعلق سب بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔

اگلے دن نوبل کی منگنی تھی۔ زیب بڑے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ انجو بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتی اور آہ بھر کے نگاہ جھکا لیتی۔ زیب نے آج وہی شاکنگ پنک ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ سوگوار آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں پہ شاکنگ پنک لپ اسٹک

سجائے وہ اچھوتی زخمی تحریر لگ رہی تھی یا نیوں میں پھولوں کے گچھے اور سوگوار آنکھوں پہ گولڈن آئی شیڈ۔ جانے آنکھوں میں آنسو تھے یا آئی شیڈ کا عکس۔ نوبل کو اداس اداس کنول یاد آگئے۔ کل جو دوپٹہ لڑکی کی طرح اس کے گریبان سے الجھ رہی تھی آج نگاہ ملانے سے بھی کترا رہی تھی۔

آتشیں ساڑی میں ملبوس اسے دیکھ کے نوبل کو اچانک چند دن پہلے کا کہا ہوا جملہ یاد آگیا۔ اس کے دل کو دھچکا لگا۔

کیا واقعی وہ کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی ہے! کیا وہ زندگی بھر جیون کی سونی راہوں میں بھٹکتی پھرے گی؟

نوبل کا دل چاہا شبنمی آنکھوں والی اس پھول کی ڈالی جیسی لڑکی کو اٹھا کر وہاں لے جائے جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ جہاں اماں کی توہم پرستی، اماں کے وہم کا آسیب ان کی زندگی کا رس نہ نچوڑے۔

منگنی ہوگئی۔ وہ نوزن کے لئے مخصوص ہوگیا۔ نوبل نے دو دن چھٹی لی۔ اماں دھڑا دھڑ بری بنانے میں مصروف ہوگئیں۔ شام کو وہ تھکا ہارا گھر لوٹا اماں انجو کو لے کر بازار گئی ہوئی تھیں۔ نوبل نے دانستہ زیب کے کمرے میں جھانکا سب سامان الٹا پڑا تھا۔ اور وہ ایک اٹیچی پلنگ پہ رکھے ٹیک لگا کر رہی تھی۔ کمرہ وحشتوں اور ویرانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ زیبو کی آنکھوں سے بہتے آنسو بیتے دنوں کی شکستہ مالا کی طرح ٹوٹ رہے تھے ایک زخمی نگاہ نوبل پر ڈال کے وہ گھومی اور آنکھیں خشک کر کے متوجہ ہوئی۔

"نوبل چائے لاؤں؟"

نوبل کو یوں لگا جیسے پوچھ رہی ہو "نوبل چلی جاؤں"

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔

"نگینہ پھوپھو کے ہاں جا رہی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔

"مگر ابھی تو شادی نہیں ہوئی۔"

ایک غلط ملط سا جملہ نوبل کے ہونٹوں سے پھسلا۔

"ہاں ابھی جشن پورا نہیں منایا گیا۔ مگر یہ وقت کا ستم ہے نوبل۔ وقت کی کج روی ہے کہ وہ کسی کے لئے عید بن کے آتا ہے اور کسی کے لئے شام غریباں۔"

نوبل کا سر ندامت سے جھک گیا۔ اٹیچی وہیں چھوڑ کے وہ باہر نکل گئی۔ چھپاتے قدموں سے وہ اندر آئی اور حسب معمول چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ نوبل اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ ہنوز پلکیں جھکائے کھڑی تھی۔

"نگینہ پھوپھو کے ہاں رہ لوگی؟"

اس نے تڑپ کر آنکھیں اوپر اٹھائیں تو نوبل ان آنکھوں میں جمع زہر سے کانپ گیا۔

"نگینہ خالہ بہت اچھی ہیں جو دل میں ہو وہی ظاہر کرتی ہیں چھپتے پر محبتوں کا قول نہیں چڑھاتیں کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیتیں۔" وہ سراسر چوٹ کر رہی تھی۔

نوبل نے چیک بک اٹھائی اور اس میں کچھ رقم درج کی اور چیک زیب کی طرف بڑھایا۔ مگر زیب نے اتنی حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹکا کہ وہ حیران رہ گیا۔

"میں اس گھر سے خالی ہاتھ جانا چاہتی ہوں۔"

نوبل بالکل تہی داماں۔ کاش تم نے میرے من میں جھانکا ہوتا۔ میرے دل میں قطار در قطار کرنوں کی طرح جگمگ کرتی آرزو پہ نظر ڈالی ہوتی۔ زندگی کی اڑان پہ ایک تغافل کی نگاہ ہی ڈالی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا جوان لڑکی کا دل بند سیپ ہوتا ہے۔ اگر تم پرائے بھی ہو جاؤ گے تو وہ اور نوبل ہو گا۔ میرا نوبل ہر دم میرے پاس رہے گا میرے دل کے نہاں خانوں میں۔ وہ ہر لمحہ۔ ہر گھڑی میرے ساتھ ساتھ رہے گا میں اور وہ الگ تو نہیں۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چرا سکتا، دنیا کا کوئی قانون پرایا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ اب میرے دل کی قبولیت میں ہے۔ میری روح گواہ ہے اس کی روح گواہ ہے۔ اور جو فیصلے روحوں کی گواہی میں ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں بدلتے۔ تم لاکھ بدل جاؤ۔ زمانے سے ڈر جاؤ۔ لوگوں کے سامنے ظاہر داری کرتے پھرو، تمہارے گلے نوزن کے لئے مخصوص ہو جائیں۔ مگر تم یہ مت بھولو کہ تم میرے ہو۔ میں نے یہ سپنا کب دیکھا تھا کہ تم میرے ہو جاؤ، میری میراث بن جاؤ، تم عمر بھر کا سرمایہ بن جاؤ، مگر اب مجھ سے نگاہیں نہ چراؤ، یوں اجنبی نہ بنو۔ تم ایسے تو نہ تھے اتنے بے بس۔ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو، کیا تمہیں احساس بھی نہیں کہ دل کا درد کسے کہتے ہیں، کیا تمہیں دل پر ٹوٹنے والی قیامتوں کی خبر نہیں۔ تم نے کچھ کہنے سے پہلے سوچا کیوں نہیں کہ تمہارے پھینکے ہوئے اس تیر سے کسی دل جلے پر محشر نہ گذر جائے اہل وفا اتنے بے حس نہیں ہوتے نوبل ایسی باتیں کر کے توہین وفا نہ کرو اگر دل کی بساط الٹ ہی گئی ہے تو ہمت سے کام لو، ساری دنیا کے سامنے مجھے اپنا کہنے کی ہمت تو نہ کر سکے اب کمال ضبط سے نوزن کے بن جاؤ ــــــ کہ تم مردوں کو دنیا میں کسی نہ کسی کا تو ہونا پڑتا ہے۔

جب زیب نے آئینہ دکھایا تو نوبل گھبرا گیا۔ وہ چپ چاپ لڑکی کیسے حقیقتوں کو بے نقاب کر رہی تھی وہ چیک دینے پر شادی

کاشورہ پینے پر شرمندہ ہو گیا، آگے بڑھ کے اس کے پاس جھکا۔

"تم نورتن کے ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں رہو گی خدا کی قسم۔"

"نہیں نوبل!"

زیب چلائی اور جھپٹ کے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جھوٹی قسم مت کھاؤ نوبل۔ تم اپنی بیوی کے ہو جاؤ گے شریک حیات خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ زندگی پہ چھا جاتی ہے کیونکہ اسے قانونی سماجی سب حقوق مل جاتے ہیں۔ وہ کوئی عام سی ہستی بھی ہوتی تو تم اس کے بن جاتے یہاں تو مسئلہ نورتن کا ہے جو اپنی ذات میں خود انجمن ہے۔ تم چند دنوں کے بعد یہ بھی بھول جاؤ گے کہ زیب بھی کوئی تھی۔"

زیب کی نم نم آنکھوں میں ایک بار پھر جگنو جمع ہوئے اور وہ اٹیچی اٹھا کے برآمدے میں اماں کے پاس تخت کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اماں بازار سے آ گئی تھیں اس نے عقیدت سے انکے پاؤں چھوئے۔ اماں کے چہرے پر ایک دھواں سا لہرایا۔ پھر وہ لہولہو مسکراہٹ کے ساتھ انجو کی طرف بڑھی بہت پیار سے اسے گلے لگایا پرانی وابستگی کے ساتھ انجو کے ہاتھ کو چوما تو آنکھوں میں چھپے خلوص کے موتی دنیا کی کج روی پہ رُل گئے۔ نوبل برآمدے میں کھڑا تھا۔ اماں اٹھ کر اندر چلی گئیں انجو نے زیب کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"آپی ہمیں چھوڑ کے نہ جاؤ۔ یوں اس گھر سے خالی ہاتھ نہ جاؤ آپی۔ کم از کم وہ چیک ہی لے جاؤ جو بھیا نے دیا ہے۔"

زیب ایک کھوکھلی ہنسی ہنسی۔

"اپنے بھیا کی یہ دولت اپنے پاس ہی جمع رکھو انجو پیاری۔ وفا کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ وفا بھی بازاروں میں نہیں بکتی کبھی نیلام نہیں ہوتی یہ تو وہ سودا ہے جو دل کے بدلے دل سے ہوتا ہے تم لوگ اپنی مجبوریوں سمیت مجھے اب بھی عزیز ہو۔ میں نے تم لوگوں کی رفاقت کے سپنے ضرور دیکھے تھے مگر وہ سپنے ہمیشہ ادھورے تھے۔ تم لوگوں کی یادیں میری عمر بھر کی کمائی ہیں یہ ایسا سرمایہ ہے جو زندگی بھر کا رسد ہے اب مجھے اور کسی دولت کی ضرورت نہیں۔"

برآمدے میں منی پلانٹ کی بیل اس کی یادوں کی طرح ستون سے لپٹی تھی۔ جاتے سمے اس نے مڑ کے نوبل اور انجو کو دیکھا اور چلی گئی۔ انجو بے تابی سے اٹھ کر اماں کی طرف بڑھی اپنی بہتی آنکھوں کے ساتھ اماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اماں یہ ظلم نہ کرو وہ ہماری اپنی ہے۔"

"اسے نورتن کوئی غیر ہے؟ میں ایسی منحوس لڑکی سے کیوں نوبل کا دامن باندھوں۔"

"اماں یہ پرانی باتیں ہیں۔ یہ جھوٹ ہے اماں مفروضہ ہے یہ توہم پرستی ہے۔ یہ ظلم ہے اماں ظلم ہے۔" انجو تڑپ کے رونے لگی مگر اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

وہ اس گھر سے کیا گئی ان کی زندگی سے ہی باہر نکل گئی۔ شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں اور پھر واقعی نوبل کے کلمے نورتن کے ساتھ ہو گئے۔ شادی پہ وہ بھی تھی۔ دل کے داغوں کو چھپاتے وہ مسرت کی تصویر بنی ادھر ادھر بھٹکتی پھری۔ نوبل اس سے آنکھ نہ ملا سکا۔ انجو اس کے سامنے روتی رہی اور وہ انجو کو تسلیاں دیتی رہی۔ زیب سچ کہتی تھی واقعی مرد کسی نہ کسی کے بن جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کی اولین چاہت کو بھلا کر وہ بزدل نورتن کا ہو گیا۔ گھر پر نورتن کی حکومت ہو گئی۔

جس دل میں ماضی کی یادیں ہوں وہاں کوئی تاجدار بن کے نہیں آسکتا یہی حال نوبل کا تھا دل میں زیب کا مسکن تھا مگر وہ نورتن کا سرتاج تھا۔ دن گزرتے رہے وقت کے کڑے کوس بیتتے رہے۔ جدائیوں کی خلیج دن بدن ناقابل عبور ہوتی گئی۔

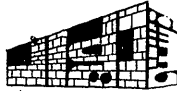
نورتن واقعی اسکی زندگی پہ چھا گئی۔ وہ اپنی پسند کا کھانا پکاتی، اپنی پسند سے اس کے لئے لباس منتخب کرتی۔ مگر وہ دل کے رشتے نورتن کے ساتھ استوار نہ کر سکا۔ مگر سدا کا بزدل تھا۔ اعلانیہ نہ کہہ سکا کہ میری اور اس کی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ وہ چپکے چپکے وقت گزار رہا تھا مگر دل ابھی تک زیب کو نہیں بھولا تھا جب بھی موقع ملتا، جب بھی تنہائی ملتی وہ نورتن کے ہنگاموں سے آنکھ چرا کے زیب کے تصورات میں کھو جاتا۔ کبھی کیلنڈر پہ نگاہ پڑتی تو دل بے بس ہو جاتا۔

دل چاہتا سارے جلا ڈالے جو اسکی اور زیب کی جدائیوں کے دن بڑھاتے ہی جا رہے تھے۔ جب وہ حالات سے بے بس ہو جاتا۔ جب زیب کا چہرہ یادوں کے جھروکوں سے بار بار جھانکتا۔ جب نورتن کا حصار اسکے گرد زیادہ تنگ ہو جاتا تو وہ بے بسی سے تکیوں میں منہ چھپا کے لیٹ جاتا اس لمحے اس کا دل باغی ہو جاتا۔ اور پھر وہ شور مچا دیتا دل کے ساتھ در و دیوار گونج اٹھتے۔

بزدل ـــــ بزدل ـــــ بزدل ـــــ

نوبل گھبرا کے کانوں میں انگلیاں دبا لیتا۔ تکیوں میں منہ چھپا لیتا مگر دل کی آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلتی رہتی۔





مُشرف تمیز ربانی



گلی کے نکڑ پر جو بوسیدہ سی عمارت ہے اس میں متوسط طبقے کے افراد کمرے کرائے پر لے کر رہتے ہیں اس کے مکینوں میں زیادہ تعداد مختلف دفاتر میں کام کرنے والے کنواروں کی ہے۔ اسی عمارت کی تیسری منزل پر ایک کمرہ میں ظہیر رہتا تھا۔ بیچارہ سیدھا سا آدمی تھا۔ چہرہ پر مختصر سی مونچھیں اور گہرے سیاہ رنگ کی بہت ہی مختصر سی داڑھی۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ دفتر مالیات میں ایک معمولی سا کارکن تھا تنخواہ کوئی خاص نہیں تھی۔ ہاں کفایت شعاری سے گزر بسر ہوی جاتا تھا۔ دفتر سے پیدل ہی جاتا تھا۔ اس سے پیسہ بھی پس انداز ہوتا تھا اور صحت پر بھی خاطر خواہ اثر پڑتا تھا۔ ہاں جب سردیوں کی مہاوٹیں شروع ہوجاتی تھیں تو مجبوراً بس میں سفر کرنا پڑتا تھا۔

ظہیر میں ایک عجیب خاصیت تھی وہ بلا کسی تکلف کے دیواروں کے پار گزر سکتا تھا۔ ابھی وہ بمشکل بیس سال کی عمر کو ہی پہنچا تھا کہ بالکل اتفاق سے اس کو اپنی اس خداداد صلاحیت کا علم ہوگیا۔

واقعہ بہت معمولی تھا۔ ایک رات وہ حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی ٹکٹوں کی البم کو درست کر رہا تھا کہ بجلی کی رو بند ہوگئی۔ پہلے تو وہ بجلی واپس آجانے کا انتظار کرتا رہا مگر پھر اس کو خیال آیا کہ کہیں اس کے گھر کا فیوز تو نہیں اڑ گیا ہے وہ اس کی مرمت کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اندازاً دروازہ کیطرف چل پڑا۔ کمرے کا دروازہ اُس نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ چونکہ اندھیرا بہت زیادہ تھا اور اس کی آنکھیں ابھی اندھیرے کی پوری طور پر عادی نہیں ہوسکی تھیں۔ اس لیے کافی دیر بھٹکنے کے باوجود وہ دروازہ کو تلاش نہ کرسکا۔ اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہوگئی اور وہ اپنی جگہ رُک کر ذہن پر زور دینے لگا کہ دروازہ کو کس سمت میں ہونا چاہیئے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ بجلی کی رَو خود بخود بحال ہوگئی۔ اَب جو اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ اپنے کمرے کے باہر نیچے جانے والے زینہ کے اُوپر کھڑا ہوا تھا۔ اَب سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ اس جگہ تک کسطرح پہنچ گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید وہ اپنے کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنا بھول گیا ہوگا اور بے خیالی میں دروازے ہی سے گزر کر اس جگہ تک پہنچ گیا۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لئے اس نے واپس جاکر کمرے کے دروازہ کو دھکا دیا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ بھلا دروازہ کے بغیر وہ کس راستے سے کمرے کے باہر آگیا۔ اچانک اس کو یاد آیا کہ تقریباً ایک سال سے عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ جب وہ کسی دیوار کے پاس سے گزرتا تو اس کے دل میں اس دیوار کے پار جانے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس نے ہمیشہ اس خواہش کو اپنے ناساز گار مالی حالات کا لاشعوری ردِ عمل سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر اس تازہ واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اس کو یہ یقین آگیا کہ وہ خواہش بلاوجہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ دروازے کے علاوہ کمرے سے باہر آنے کا ایک ہی راستہ ہوسکتا ہے۔ دیوار کے پار ہوکر۔ انجانے میں اس سے جو حرکت سرزد ہوگئی تھی۔ اس کی تصدیق کے لئے اُس نے اَب دروازے کی بجائے دیوار کیطرف قدم بڑھا دیئے اور وہ واقعی بلا کسی تردد کے ٹہلتا ہوا دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔

ظہیر چونکہ طبعاً پُرسکون ماحول کا عادی تھا۔ اس لئے باوجود تصدیق کے وہ اپنی اس نئی دریافت شدہ خاصیت سے مطمئن نہ تھا۔ اُس نے ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے روز ہفتہ وار تعطیل تھی۔ اس لئے اس کو ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے مزید ایک دن انتظار کرنا پڑا۔

ڈاکٹر اس کی روئیداد سُن کر پھر تفصیلی معائنہ کے بعد

اس نتیجہ پر پہنچا کہ سب شدید ذہنی انتشار کا اثر ہے ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بھلا کوئی شخص دیوار کے پار کس طرح گزر سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کو ایک مسکن مکسچر اسپرین کی چند ٹکیاں اور چار ٹکیاں کسی تیز قسم کے اینٹی بائیوٹک کی دے کر تاکید کی کہ چونکہ اس اینٹی بائیوٹک دوا کا اثر بہت دیرپا ہوتا ہے اس لئے سال میں ایک ٹکیہ سے زیادہ نہ کھائے۔

ظہیر نے کمرے میں واپس آتے ہی مکسچر کی خوراک پی، اسپرین کی دو ٹکیاں کھائیں اور دوا کی ایک ٹکیہ کھا کر باقیماندہ ٹکیوں کو اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ دوا نے اثر دکھایا اور ظہیر کو کافی سکون محسوس ہوا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ جب اٹھا تو اس کی طبیعت ہشاش تھی۔ اس کو مزید دوا کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور وہ دواؤں کو بھول گیا۔ اس کو ڈاکٹر کی یہ بات تو دل کو لگی کہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ مگر اس انتشار کی وجہ اسکی سمجھ میں نہ آسکی۔ دفتر میں وہ جس سیٹ پر کلرک تھا وہاں کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ مالی طور پر وہ ذرا کمزور تھا۔ مگر اس کی تنخواہ اب اتنی کم بھی نہ تھی کہ اس جیسے غیر شادی شدہ شخص کے لئے کسی بڑی پریشانی کا باعث بن سکے۔ بہرحال وہ ڈاک کے پرانے ٹکٹ خریدنے پر اور روزانہ اخبار خریدنے پر حسب منشاء رقم خرچ کرتا تھا۔ خالی وقت میں وہ اپنے ڈاک کے ٹکٹوں کے ذخیرہ کی دیکھ بھال کرتا یا اخبار پڑھتا اور چین کی بنسی بجاتا۔

ان حالات کے پیش نظر ذہنی انتشار کی کوئی معقول وجہ اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ گھوم پھر کر وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا واحد سبب اس کے دیواروں سے پار جانے کی صلاحیت ہی ہوسکتی ہے جو اس کو ہمیشہ عملی قدم اٹھانے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور یہ اس کو دبانے کی کوشش میں تقریباً ہمیشہ ہی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا تھا۔ یہ کشمکش تقریباً ایک سال سے جاری تھی۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ گزشتہ ایک سال سے دیواروں کے پار جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اس نے اس پر کبھی دھیان ہی نہیں



دیا۔ وہ ہمیشہ ہر جگہ دروازے سے ہی آمدورفت رکھتا تھا حتیٰ کہ اپنے کمرے میں بھی دروازے ہی سے آتا جاتا۔ باہر جاتے وقت دروازے کو اچھی طرح بند کر کے تالا لگانا کبھی نہیں بھولتا۔ تھوڑے سے عرصہ کے لئے بجلی فیل ہو جانے کے معمولی سے واقعہ نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

دفتر میں اس کے شعبہ کا متعلقہ افسر کسی دوسرے شعبہ میں تبدیل ہو کر چلا گیا۔ اس کی جگہ جو نیا افسر آیا وہ اپنے ساتھ دفتر سدھار کے نئے خیالات بھی لے کر آیا۔ دراصل وہ اس عہدہ پر آزمائشی طور پر بھیجا گیا تھا۔ اور اس کی یہاں کی کارکردگی پر مستقبل کا انحصار تھا۔ اس نے دفتر میں زبردست تبدیلیوں کا آغاز کر دیا۔ اب یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ ظہیر کی سیٹ پر کام کم ہی ہوتا تھا۔ اس میں ظہیر کا کیا قصور مگر اس نئے افسر نے پہلی ہی نظر میں ظہیر کو ناپسندیدہ قرار دے دیا۔ پھر یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ظہیر کے لکھے ہوئے ڈرافٹ افسر کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ اس نے ظہیر پر جاو بیجا تنقید شروع کر دی۔ اس کے اس رویہ نے ظہیر میں بھی ردِ عمل پیدا کیا۔ اور وہ افسر کی بات کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑانے لگا۔ افسر کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ظہیر دفتری خطوط کا جواب دینے میں وہی گھسے پٹے جملے استعمال کرتا تھا جو شاید پچاس سال پہلے رائج تھے۔ اس میں جدت تو تھی ہی نہیں۔ براہِ راست مطلب بیان کرنے کی بجائے وہ بات کو گھما پھیرا کر بڑی دیر میں مطلب کی بات پر آتا تھا۔ افسر ظہیر کو جس قدر یہ عادت ترک کرنے پر مجبور کرتا تھا ظہیر اس پر اتنا ہی اڑا رہتا تھا۔

جس رات اس کو اپنی عجیب و غریب صلاحیت کا علم ہوا اس کی دوسری صبح وہ بڑی مشکل سے دفتر وقت پر پہنچ سکا۔ بیدار تو وہ حسبِ عادت صبح ہی ہو گیا تھا۔ مگر بڑی دیر تک اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا بستر پر ہی پڑا رہا۔

دفتر پہنچ کر وہ بظاہر تو روزمرہ کے کام میں مشغول ہو گیا۔ مگر اس کا ذہن اپنے خیالات ہی میں بھٹکتا رہا۔ اس غائب دماغی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو خط اکاؤنٹ سیکشن کو بھیجنا تھا وہ اپنے افسر کے نام لکھ دیا۔ اور جو افسر کے نام تھا وہ اکاؤنٹ سیکشن بھیج دیا۔ دفتر میں ظہیر کی اپنی سیٹ ایک گوشہ میں ڈالی ہوئی تھی اس کے تین اطراف گتہ کی دیواریں کھڑی تھیں۔ پشت پر افسر کے کمرے کی دیوار تھی۔ اس کی سیٹ کے بائیں ہاتھ کو گتہ کی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو دفتر کے ہال میں کھلتا تھا۔ داہنے طرف کی دیوار میں جو چھوٹا سا دروازہ تھا وہ ہال کے باہر برآمدے میں کھلتا تھا۔ افسر کے کمرہ کا دروازہ بھی برآمدے میں کھلتا تھا۔ ابھی ظہیر کو کام شروع کئے بمشکل ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ اس کا افسر ظہیر کا لکھا ہوا خط ہاتھ میں لئے اس کے کیبن میں دندناتا ہوا داخل ہوا۔ غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے وہ خط ظہیر کی طرف لہرایا اور دھاڑا۔

"کیا تمہارے کام کا معیار یہی ہے۔ یہ تم نے مجھے کیا بھیجا ہے۔ میں کہتا ہوں تم ہوش میں آؤ گے یا نہیں۔ میں تم کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکا ہوں۔ میں ابھی تمہارا جواب طلب کرتا ہوں تاکہ تمہارا دماغ درست کر سکوں۔"

افسر نے وہ خط اور ایک فائل اس کی میز پر پٹخی اور غصہ سے پیر پٹختا ہوا، اس کے کیبن سے نکل کر برآمدہ میں ہوتا ہوا اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

ظہیر اپنی غلطی پر نادم تھا مگر عزت بھی کوئی چیز ہے۔ افسر کی واپسی کے بعد وہ اس معاملہ پر جس قدر غور کرتا اسی قدر اس کا پارہ چڑھتا جاتا۔ اس کے دماغ میں کھچڑی پکنے لگی اور بے عزتی کا بدلہ لینے کا جذبہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ آخر کار وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چل کر افسر کے کمرے کی دیوار تک آیا اور اپنا سر دیوار کے پار نکال کر افسر کے کمرے میں جھانکنے لگا۔ وہ بیچارہ شدید ہیجان کی حالت میں بیٹھا کسی ٹائپ شدہ کاغذ کو پنسل سے درست کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ کمرے میں ایک ہلکی سی کھانسی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ جیسے ہی اس نے سر اٹھایا اور اس کی نگاہ کھانسی کی آواز کی سمت گئی تو وہ ششدر رہ گیا۔ دیوار پر ظہیر کا سر ٹھیک اسی طرح لٹکا ہوا نظر آیا۔ جس طرح سے لوگ شکار کئے ہوئے جانوروں کے سر اپنی دیواروں پر سجاتے ہیں۔ ابھی وہ اس دھچکہ سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ اس سر میں حرکت ہوئی اور اس نے دھیمی آواز میں اس کو مخاطب کیا۔

"جناب آپ گلی کے گندے کیڑے ہیں۔ آپ حد درجہ واہیات شخص ہیں۔"

اس کے افسر کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ وہ مارے خوف کے پلک بھی نہ جھپک سکا۔ چند لمحوں تک وہ منہ کھولے بیٹھا رہا پھر نہ جانے کس طرح اس نے ہمت کو جمع کیا اور قریب پڑی ہوئی کرسی کھینچ کر دیوار پر مارتا ہوا کمرے سے نکل بھاگا۔ ظہیر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت افسر اس کے کیبن میں داخل ہوا۔ ظہیر سر جھکائے کام میں منہمک تھا۔ افسر کچھ عرصہ شش و پنج کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف واپس چلا گیا۔ ابھی

وہ ٹھیک سے اپنی کرسی پر بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ ظہیر کا سر پھر دیوار پر نمودار ہوا اور مغلظات کی گردان شروع ہو گئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اسی ایک دن میں تقریباً پچیس دفعہ ظہیر نے اس کھیل کو دہرایا۔ شروع میں تو کئی دفعہ افسر دوڑتا ہوا اس کے کیبن میں داخل ہوا اور بغیر کچھ کہے تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس ہو گیا۔ وہ سخت بے یقینی کا شکار نظر آتا تھا۔ بعد کے حادثات میں اس نے صرف بھاگ کر اپنے کمرے سے باہر چلے جانے پر اکتفا کی۔

ظہیر کو بھی اب اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔ اس نے برا بھلا کہنا ترک کر دیا تھا۔ اب وہ سر دیوار کے پار نکال کر صرف غراتا "غرغر"۔

ایسا لگتا جیسے کوئی خونخوار درندہ سخت غصے کی حالت میں ہو ہر دفعہ افسر کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی ایک لہر سی گزر جاتی اور وہ پسینہ میں شرابور ہو جاتا۔ اس ایک ہی دن میں اس کا وزن ایک سیر کم ہو گیا۔

اگلے روز ظہیر کو اس دلچسپ کھیل کے جاری رکھنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملا۔ کیونکہ افسر اپنے کمرے میں آنے سے کتراتا رہا۔ اور زیادہ وقت کمرے کے باہر ہی گزارا۔ رفتہ رفتہ اس کے اعصاب اس قدر متاثر ہوئے کہ اس سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہونے لگیں۔ لوگوں کو اس کے دماغی توازن کے بارے میں شبہ پیدا ہو گیا۔ بدحواسیوں کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ وہ بیچارہ اسپتال میں داخل ہو گیا۔

اپنے ناپسندیدہ شخص سے نجات پا کر ظہیر کی زندگی پھر اپنے پرانے ڈھرے پر آ گئی۔ وہ پرسکون تھا اور دفتری کام کو اپنی مرضی کے مطابق نبٹانے لگا۔ بظاہر تو وہ کامیاب تھا۔ مگر درحقیقت اب بھی اسکو سکون میسر نہ تھا۔ اندر ہی اندر کوئی خواہش سر ابھار کر اس کے سکون کو درہم برہم کر دیتی اور یہ خواہش تھی دیواروں کے پار جانے کی۔ وہ اس خواہش کی تسکین گھر پر کرتا تھا اور درحقیقت وہ کرتا بھی تھا۔ مگر جس کے قبضہ میں غیر معمولی طاقت ہو وہ چھوٹے موٹے کام کر کے کب مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ تو دراصل ابتدا تھی۔ جس کی انتہا کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

جب سے ظہیر اپنی اس عجیب صلاحیت سے آگاہ ہوا تھا اس کو ہر دیوار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی محبت بھری آواز میں اس کو کامیابی کی طرف پکار رہا ہو۔ اس کو بھی قدرتی طور پر اپنا نام بلند کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ پہلے جو شعبے اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے مثلاً سیاست وغیرہ وہ اب اس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ بھلا سیاست یا کھیل کے میدان میں حاصل کی ہوئی بڑی سے بڑی شہرت بھی اس شہرت کا مقابلہ کر سکتی ہے جو دیواروں کے پار گذرنے کی منفرد صلاحیت سے اس کو حاصل تھی۔ اس کے دماغ میں اس صلاحیت کو استعمال کرنے کے منصوبے بنتے رہے آخر کار دولت حاصل کرنے کی خواہش دوسری خواہشات پر غالب آ گئی۔

ظہیر نے اپنی مجرمانہ زندگی کے آغاز کے لئے ایک بینک کا انتخاب کیا۔ ایک رات وہ نہایت اطمینان سے چہل قدمی کرتا ہوا بینک کی دیواریں پار کر کے خزانہ کے حصہ میں پہنچ گیا۔ خزانے کی موٹی موٹی دیواریں اس کے سامنے اپنی حیثیت کھو بیٹھیں۔ اندر داخل ہو کر اس نے اپنی جیبوں میں خوب ٹھونس ٹھونس کر بڑے بڑے نوٹ بھرے۔ مگر اس کے باوجود اس کو سکون نہ ملا۔ اس کے دل میں نام پیدا کرنے کی خواہش ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ اس خواہش کی تسکین کے لئے اس نے خزانہ کی دیوار پر چاک سے موٹے الفاظ میں "غرغر" لکھ دیا اور جس طرح بینک میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل آیا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد ایک اور ظہیر کا نشانہ بنی اس کے بعد تو جیسے تانتا ہی لگ گیا۔ ہر دفعہ وہ اپنی جیبیں نوٹوں سے بھر کر واپس آتا اور ہر واردات کے مقام پر "غرغر" لکھنا نہ بھولتا۔ اس طرح ایک طرف تو مالی فائدہ ہوتا دوسری طرف اس کے احساس برتری کی بھی تسکین ہو جاتی تھی۔ کیونکہ پولیس اپنی تمام کوششوں کے باوجود ان وارداتوں کے معمہ کو حل کرنے سے قاصر رہتی تھی۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کا نشانہ بینکوں کے علاوہ جوہری کی دکانیں اور رؤسا کے گھر بھی بننے لگے۔ جیسے جیسے وارداتوں کی تعداد بڑھتی جاتی اس کی شہرت میں بھی چار چاند لگتے جاتے اب "غرغر" ایک ہیرو کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ویسے تو تقریباً ہر جگہ اس کا چرچا رہتا تھا۔ مگر عورتوں کے حلقہ میں اس کو نمایاں مقبولیت حاصل تھی۔ شاید ہی کوئی ایسی عورت ہو جو اس دلیر ہستی کا تذکرہ نہ کرتی ہو۔ کچھ خواتین تو اس سے کافی خوفزدہ تھیں اور اس کو "خوفناک بلا" یا "شیطان" کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ مگر کچھ ایسی بھی تھیں جو اس کی ذہانت اور دلیری کی قائل تھیں اور اس سے ملنے کی تمنا دل میں رکھتی تھیں۔

"عز عز" لوگوں کے درمیان گھل مِل کر اپنی واردات سے پیدا ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہتا۔ اور دل ہی دل میں خوب محظوظ ہوتا۔ اس پر ہر وقت احساسِ برتری کا خمار چھایا رہتا تھا۔

رفتہ رفتہ اُسے اپنی ذات کو مزید پوشیدہ رکھنا دشوار ہو گیا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسی نادر صلاحیت رکھنے والا بھی گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ وہ چاہتا تھا کوئی تو ایسا ہو جس کو حالِ دل سُنا کر اس ذہنی بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

آخر ایک روز جب اس کے دوست اس کی تازہ ترین واردات کے بارے میں اخبار میں پڑھ کر اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بے اختیار ہو کر بول پڑا۔

"تم لوگ جس کی تعریف کے گن گا رہے ہو جانتے بھی ہو کہ وہ کون ہے۔ وہ تمہارے درمیان ہی کھڑا ہے۔ غور سے دیکھو تو وہ میں ہوں۔"

اس کے اس انکشاف پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا خوب ہی مذاق اڑایا۔ اور ہر طرف سے "عز عز" کی طنزیہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ دفتر کی چھٹی تک جاری تھا۔ اس شام "عز عز" جب گھر پہنچا تو بہت نڈھال تھا۔

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد ایک دفعہ جب "عز عز" ایک دکان میں داخل ہو کر اپنی پسند کی چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر اپنا شناختی نشان "عز عز" لکھ رہا تھا تو اتنی ترنگ میں آ گیا کہ اپنی پسندیدہ نظم بھی گنگنانے لگا۔ اچانک کہیں سے دکان کا چوکیدار نمودار ہو گیا۔ "عز عز" دیوار پار کر کے چوکیدار کی پہنچ سے باہر جانے کے لئے بڑھا۔ مگر ایکدم اپنا ارادہ بدل کر رُک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اپنی ذات سے لوگوں کو روشناس کرا سکے۔ ذرا اس کے ساتھیوں کو اس کا مذاق اڑانے کا سبق بھی ملنا چاہیئے۔ ان کا مذاق اس کی طبیعت پر اب بہت گراں گزرتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے آپ کو منفرد حیثیت سے پیش کرنے کے لئے بے چین تھا۔

اس کی گرفتاری کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ لوگ جو اس کو کسی خاطر ہی میں نہ لاتے تھے اور اس کا مذاق اڑانے سے نہیں تھکتے اس کی تصویر اخبار میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے منہ لٹک گئے۔ بلکہ اب تو یہ حال تھا کہ جو شخص ایک دفعہ بھی اس سے ملا تھا اس کے ساتھ اپنے قریبی سے قریبی تعلقات بتاتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔ بھلا اس جیسے مشہور شخص سے کون اپنی قرابت داری نہ دکھاتا۔ اس کے معمولی شناسا بھی فخر سے سر اُٹھا کر چل رہے تھے گویا وہی ہیرو ہوں۔ جس پولیس اسٹیشن پر اس کو لایا گیا تھا۔ اس کے باہر اس کے پرستاروں کا جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ ہجوم اس قدر بڑھا کہ پولیس کے کنٹرول سے باہر ہونے لگا۔ بعض فنکار اس نادر موقعہ کا فائدہ اُٹھا کر لوگوں کی جیبوں کی صفائی بھی کرنے لگے۔ مگر تماشائی اپنے ہیرو کے دیدار کے لئے اس قدر دیوانے ہو رہے تھے کہ ان کو بدن کا ہوش نہ تھا۔ پولیس نے بھی "عز عز" کو تھانہ کی حوالات سے نکال کر جلد از جلد جیل پہنچانے میں اپنی عافیت سمجھی۔

"عز عز" کے جیل میں داخلے سے اس کے پرستاروں کو بڑی بے چینی ہوئی۔ کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ جیل کی موٹی موٹی دیواریں اس کی کارگزاریوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گی۔ اب وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے کارنامے پارینہ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ مگر ان کو کیا معلوم کہ جیل کی دیواریں اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

جیل میں داخلے کے تھوڑی دیر بعد ایک وارڈن نے دیکھا کہ جیلر کی طلائی جیبی گھڑی "عز عز" کی کوٹھڑی کی دیوار میں ایک کیل سے لٹکی ہوئی ہے۔ گھڑی جیلر کے پاس واپس پہنچا دی گئی۔ مگر دوسری صبح جیلر کے بستر کے سرہانے اس کی اپنی لائبریری کی کتاب پائی گئی جس پر نمایاں طور پر "عز عز" لکھا ہوا تھا۔ جیل کا عملہ سخت پریشان ہوا۔ وہ یہ معمّہ حل کرنے سے قاصر رہے کہ یہ کتاب "عز عز" کے قبضہ میں کیسے آئی اور وہ اس کو کس طرح لا کر جیلر کے سرہانے رکھ گیا۔ وہ اپنی تحقیقات سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں بُری طرح ناکام رہے تھے۔

"عز عز" کو گرفتار ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ جیلر کو ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔

جنابِ عالی!

مؤدبانہ گزارش ہے کہ بندے نے جناب کی لائبریری میں موجود "طلسم ہوشربا" کی ساری جلدیں پڑھ ڈالی ہیں۔ آخری جلد کے چند صفحات ہنوز باقی ہیں امید ہے کہ آج رات کے گیارہ بجے تک وہ بھی پڑھ لوں گا۔ آپ کی لائبریری میں مطالعے کے لئے

مزید مواد موجود نہیں ہے اس لیے بندہ آپ سے
اجازت کا طالب ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے
آج رات سوا گیارہ اور ساڑھے گیارہ بجے کے
درمیان رخصت ہوجانے کی اجازت مرحمت
فرمائیں گے۔ آپ کی مہمان نوازی کے لیے
بندہ مشکور ہے۔

"عزعز"

اور ہوا بھی یہی۔ سخت پہرے کے باوجود "عزعز" رات کے ٹھیک گیارہ بج کر پچیس منٹ پر اپنی کوٹھڑی میں موجود نہ تھا۔ صبح جب اس کے فرار کی خبر عام ہوئی تو اس کے پرستاروں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ اس پر سونے پہ سہاگہ یہ کہ اسی رات اس نے ایک جگہ ہاتھ بھی صاف کردیا۔ اس نے اس کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ پولیس شرمندہ و پریشان اس کو گلی کوچوں میں تلاش کرتی پھر رہی تھی اور وہ بےخوف مال روڈ پر سیر کرتا پھرتا تھا۔ فرار کے تیسرے دن اس کو پھر گرفتار کرلیا گیا۔ اس دن وہ ایک مشہور سڑک کے کنارے ایک کھلی دکان میں بیٹھا ہوا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ آئس کریم کھا رہا تھا۔

اس دفعہ گرفتاری کے بعد نہ صرف یہ کہ اس کو براہ راست جیل بھیجا گیا بلکہ جیل میں بھی اس کو ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ جس کے دروازہ پر سخت پہرہ لگادیا گیا۔ جب رات کافی گزر گئی تو "عزعز" جیل کی کوٹھڑی سے نکل کر جیلر کے گھر میں جاکر اس کے مہمان خانے میں ایک بستر پر سوگیا۔ دوسری صبح تقریباً آٹھ بجے بیدار ہوکر اس نے جیلر کے نوکر کو ناشتہ لانے کے لیے آواز لگائی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ جیل کا عملہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ پھر گرفتار کرلیا گیا۔ جیلر نے اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالی کہ اس کی کوٹھڑی پر دوسرا تالا ڈالا گیا۔ محافظوں کی تعداد دوگنی کردی گئی اور یہ حکم دیا کہ اس کو کھانے کے لیے صرف سوکھی روٹی اور پانی دیا جائے۔

شام تک تو جیسے تیسے "عزعز" نے صبر کرلیا مگر رات کو اسے زوردار بھوک محسوس ہوئی۔ وہ بستر سے اٹھ کر جیل کی دیوار کے پار ٹہلتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک ریسٹورنٹ میں جاکر خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ سوئیٹ ڈش ختم کرکے جب کافی کا آرڈر دیا تو وہیں سے جیلر کو فون کیا۔

جناب عالی!

میں بھی بڑا غائب دماغ شخص ہوں ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں ڈوبا رہتا ہوں اسی کی وجہ سے بعض اوقات بڑی مشکل میں پھنس جاتا ہوں۔ اب اسی وقت کی بات کو لیجئے جیل سے آتے وقت میں اپنا بٹوہ لانا بھول گیا۔ اس ریسٹورنٹ کے کھانے کا بل کس طرح ادا کروں۔ مہربانی کرکے کسی کے ہاتھ میرا بٹوہ بھجوادیجئے گا۔ تاکہ رقم کی ادائیگی کرسکوں۔ آپ بہت مصروف دن گزارنے کے بعد آرام کررہے ہوں گے ورنہ آپ کو یہاں تشریف لاکر ایک پیالی کافی اپنے ساتھ پینے کی زحمت دیتا۔"

ٹیلیفون سن کر جیلر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سب سے پہلے وہ بھاگا ہوا اس کی کوٹھڑی پر پہنچا مگر "عزعز" وہاں ہوتا تو ملتا۔ وہاں سے دوڑتا ہوا وہ بنفس نفیس ریسٹورنٹ

پہنچا۔ "عزعز" صاحب ٹانگیں پسارے نہ صرف عود کافی سے لطف اندوز ہو رہے ہے بلکہ ایک فاضل پیالی بھی منگوا کر رکھی ہوئی تھی۔ جیلر آپے سے باہر ہو گیا۔ عزعز کو مغلظات سنانے کے ساتھ طرح طرح کی دھمکیاں بھی دیں۔ جیلر کا یہ توہین آمیز رویہ عزعز کو ایک آنکھ نہ بھایا اور وہ رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو کر جیل سے ہمیشہ کے لئے فرار ہو گیا۔

اس آخری فرار کے بعد وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے داڑھی اور مونچھیں بڑھا لیں اور آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ لگا لیا۔ ایک کرکٹ کے ایمپائروں والی چھڑی اور کھلاڑیوں والے لباس نے اس کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اب وہ ایک غیر معروف گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گیا۔ جہاں اپنی پہلی دفعہ گرفتاری کے بعد وہ اپنا ضروری فرنیچر پہلے ہی آہستہ آہستہ منتقل کر چکا تھا۔

اس کا ارادہ اب پرسکون زندگی گزارنے کا تھا۔ مگر دیواروں میں سے گزرنے کی خواہش روز افزوں ترقی پر تھی۔ اب اس کو معمولی دیواروں میں سے گزرنے میں کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ وہ موٹی سے موٹی دیوار کی تلاش میں رہتا۔ رفتہ رفتہ تمام دیواریں اس کے سامنے اپنی وقعت کھو بیٹھیں۔ آخر کار اپنی اس خواہش کی تسکین کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ مصر جا کر اہرام کو پار کیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے کم کسی جگہ اس کی تسکین ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ چونکہ پولیس کو مطلوب تھا اس لئے مصر جانے کے لئے ضروری کاغذات وغیرہ کا حصول کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر بھی اس نے رفتہ رفتہ انتظامات شروع کر دیئے۔

اس دوران اسکی زندگی بدمزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ انتظامات اس قدر سست رفتاری سے ہو رہے تھے کہ وہ اکتایا جا رہا تھا۔ دن کا زیادہ وقت وہ اپنے ڈاک کے ٹکٹوں کی دیکھ بھال میں خرچ کرتا۔ شام کو یا تو سینما چلا جاتا یا پھر مال روڈ کی سیر۔ اس کا حلیہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ اس کے قریبی شناسا بھی اس کے قریب سے بغیر شناخت کئے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اپنے ایک آرٹسٹ دوست کی تنقیدی نظر نہ چھپا سکا۔ اس کے دوست کی ایک چھوٹی سی دکان مال روڈ پر نسبتاً الگ تھلگ حصے میں واقع تھی۔

عزعز بننے سے قبل طاہر اکثر اس کی چھوٹی موٹی پینٹنگز خریدتا تھا۔ اس طرح اس کی واقفیت اس آرٹسٹ سے اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ ایک رات جب عزعز حسب معمول چہل قدمی کرتا ہوا آرٹسٹ کی دکان کے قریب سے گزرا تو اس کے دوست نے مسکرا کر اس کو مخاطب کیا۔

"آپ سے ملاقات ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب پہچاننا بھی مشکل ہو گیا ہے۔"

عزعز کو پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ اس کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ سنی ان سنی کر جائے۔ پھر فوراً خیال آیا کہ راہِ فرار اختیار کرے مگر فوراً ہی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس اچانک حادثہ کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں تمہاری باریک بینی کا تو ہمیشہ سے قائل ہوں۔ آخر کار تمہاری نظروں کو دھوکہ نہ دے سکا۔" اس نے تبسم سے کہا۔

اس کے دوست نے بتایا کہ وہ اس کو بہت عرصہ سے شناخت کر چکا ہے۔ مگر وہ نہ صرف اس کا دوست ہے بلکہ اس کا خیر خواہ بھی ہے اس لئے خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ آرٹسٹ نے اس سے بہت ہمدردی دکھائی اور بہت جلد ہی دونوں پھر پرانے دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے مگر اس ملاقات نے عزعز کو پریشان کر دیا۔ اس کو آرٹسٹ کی طرف سے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر کوئی اور بھی اس آرٹسٹ کی طرح "تیز نگاہ" رکھ سکتا تھا۔ اس نے مصر کے سفر کے انتظامات کو مزید تیز کر دیا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

تقریباً دو دن بعد ہی عزعز کو ایک لڑکی کے غمگین چہرے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز دورانِ سیر عزعز کا ایک لڑکی سے سامنا ہوا وہ اس لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ لڑکی کچھ جلدی میں تھی اور چہرہ سے پریشان نظر آتی تھی۔ عزعز نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی مگر اس کو کیا کہیئے کہ تقریباً بیس منٹ کے عرصہ میں اس لڑکی سے چار دفعہ آمنا سامنا ہوا۔ اب عزعز نے اس کی شکل پر کچھ توجہ دی تو اپنے آپ کو اس کی طرف کچھ مائل پایا۔ وہ اپنے گھر واپس آگیا۔ مگر دن میں کئی دفعہ اس لڑکی کی تصویر اس کے ذہن میں ابھری۔

اب اس کے روزمرہ کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ وہ بلا ناغہ سڑک پر ان دکانوں کا چکر لگانے لگا جہاں اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی تھی اور اکثر اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق بھی سرد پڑ گیا۔ اور مصر جانے کا خیال تو گویا اس کے ذہن سے بالکل خارج ہو گیا۔ اور ایک روز اس نے لڑکی کا پیچھا کر کے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا۔

ایک شام اس نے اپنے آرٹسٹ دوست سے اس لڑکی کا تذکرہ کیا۔ آرٹسٹ اس سے اچھی طرح واقف نکلا۔ وہ لڑکی اس آرٹسٹ کو بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ لڑکی بہت مظلوم ہے اس کی شادی ایک اوباش قسم کے شخص سے ہو گئی ہے جس نے اس کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ اس نے لڑکی پر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ وہ طبعاً سخت گیر ہے۔ ہر رات کو دس بجے خوب بن سنور کر آوارہ گردی کرنے نکل جاتا ہے اور دوسری صبح چار بجے واپس آجاتا ہے۔ اس عرصہ کے لئے وہ لڑکی کو گھر میں بند کر کے باہر موٹا سا تالا لگا جاتا ہے۔

آرٹسٹ اس لڑکی کے لئے کافی غمگین تھا مگر اپنے آپ کو اس کی مدد کرنے سے قاصر پاتا تھا۔

ان معلومات کے حاصل ہونے کے دوسرے دن جب عزعز مال روڈ کی ایک ذیلی سڑک سے گزر رہا تھا تو وہ لڑکی پھر نظر آئی وہ تیز قدموں سے ایک دودھ کی دکان پر گئی اور دودھ لینے والوں کی قطار میں لگ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ "عزعز" بھی جا کر لائین میں لڑکی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جب ان دونوں کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا تو اس نے سرگوشی کی۔

"مجھے تمہارے حالات کا علم ہے اور میں تمہارے لیے بڑی ہمدردی رکھتا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں آج رات تم سے آکر ملوں گا اور تم کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے تبادلہ خیال کروں گا۔"

لڑکی شرما گئی اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کافی کوشش کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور خوف اور خوشی کی ملی جلی آواز میں بولی۔

"جب آپ کو میرے واقعات معلوم ہیں تو آپ خود خیال کر لیجئے آپ کا مجھ سے ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"

عزعز نے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور خاموشی سے ٹہلتا ہوا گھر واپس آگیا۔ واپس آکر وہ اور شدت سے اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی ادھیڑ بن میں رات ہو گئی۔ وہ لباس تبدیل کر کے گھر سے نکلا۔ وقت گزاری کے لئے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا اور پھر دس بجنے سے کچھ قبل ہی لڑکی کے مکان کے سامنے والی سڑک پر پہنچ گیا۔ لڑکی کے مکان کے چاروں طرف ایک بلند اور کافی موٹی دیوار تھی وہ اتنی بلند تھی کہ سڑک پر سے مکان کی چمنی کا سب سے اوپری حصہ ہی نظر آسکتا تھا۔

ابھی وہ حالات پر غور کر ہی رہا تھا کہ چہار دیواری کا پھاٹک کھلا اور ایک شخص اس میں سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے باہر نکل کر دروازہ کو تالا لگایا اور شہر کی ایک مشہور سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ عزعز اس کی روانگی کے بعد بھی چند لمحہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔

وہ بڑے آرام سے ٹہلتا ہوا چہار دیواری کے پار نکل گیا۔ اس کے بعد مکان کی مزید دیواریں پار کرتا ہوا وہ لڑکی کے کمرہ میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت آتش دان کے سامنے بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ عزعز کو اچانک اپنے سامنے پا کر وہ جس قدر حیرت زدہ تھی۔ اتنی ہی خوش بھی تھی۔ وہ اس قید تنہائی سے سخت بیزار ہو چکی تھی۔ عزعز کی باتوں نے اس کے دل کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ اور وہ اس رات ایک بجے تک باتیں کرتے رہے پھر عزعز اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔

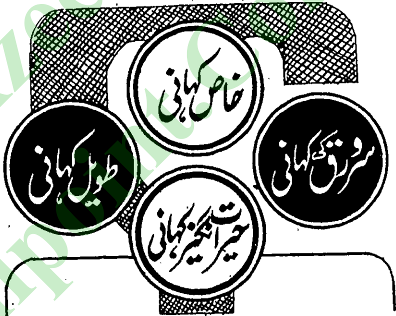
دوسری صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس کے سر میں سخت درد تھا۔ رفتہ رفتہ یہ درد برداشت سے باہر ہو گیا۔ عزعز کو اس اچانک افتاد سے بڑی پریشانی ہوئی۔ ایک طرف تو سر کا درد اسے چین

نہ لینے دے رہا تھا اور دوسری طرف اس کے دل میں اس لڑکی سے ملنے کی تمنا زور پکڑ رہی تھی وہ اس ملاقات کو کسی طور بھی ملتوی کرنے پر تیار نہ تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ اسپرین استعمال کر کے اس بلا سے نجات حاصل کرے۔ اس نے اپنی درازیں تلاش کیں اور ایک ٹکیہ نکال کر کھالی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اس کی حالت معمول پر آگئی اور وہ پھر خود کو صحت مند محسوس کرنے لگا۔ شام تک وہ بالکل تندرست ہو چکا تھا۔ رات کو روانگی سے قبل اس نے ایک ٹکیہ اور احتیاطاً کھالی۔

اس رات بھی وہ دیواریں پار کرتا ہوا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ غرض باتوں میں اتنا محو ہو گیا کہ اس کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ جب صبح کے چار بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے تب اس کو واپس جانے کا خیال آیا۔ اور وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے لڑکی سے رخصت ہو کر باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب اُس نے چہار دیواری کے اندر جانا شروع کیا تو اس کو کچھ نامانوس سا احساس ہوا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اس کے کندھے اور کولہوں کو کھرچ رہا ہے۔ اس نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور چہار دیواری کے اندر اپنا سفر جاری رکھا۔ ابھی وہ کچھ ہی اندر گیا تھا کہ اس کو ایک نمایاں تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی گاڑھے محلول میں سے گزر رہا ہو جو حالانکہ رقیق ہے مگر اس کی ہر جنبش پر ٹھوس ہوتا جا رہا ہو۔ جب تک کہ یہ بات پورے طور پر اس کی سمجھ میں آئی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دیوار میں کافی اندر آ چکا تھا۔ اور اب اس کی جنبش کرنے کی طاقت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ آخر کار وہ جنبش کرنے سے بالکل معذور ہو گیا۔ دیوار اس کو بُری طرح جکڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام طاقت دیوار میں سے نکلنے کے لیے صرف کر دی۔ مگر بیکار۔ اب وہ بیچارگی کی حالت میں دیوار میں چنا ہوا کھڑا تھا۔ اچانک اس کو خیال آیا کہ صبح بے دھیانی میں اس نے جن ٹکیوں کو اسپرین سمجھ کر کھا لیا تھا وہ دراصل بیحد طاقتور اینٹی بائیوٹک دوا کی ٹکیاں تھیں۔ ڈاکٹر نے اس کو سال میں صرف ایک ٹکیہ کھانے کے لئے کہا تھا جبکہ وہ غلطی سے ایک ٹکیہ روانگی سے قبل احتیاط کے طور پر کھا کر آیا تھا یہ اُسی دوا کا اثر تھا کہ دیواروں سے پار گزرنے کی صلاحیت قطعاً زائل ہو گئی۔

بیچارگی میں اُس نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ شہر میں صبح کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ دیوار کے پاس سے گزرنے والے راہگیر ایک بہت کمزور سی آواز سنتے ہوئے گزر جاتے ان کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی دُور بہت دُور فریاد کر رہا ہو۔ راہگیروں کا خیال تھا کہ یہ آواز ہوا کے اُن کے جھکڑوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے جو اس دیوار سے لگ کر گزر رہے ہیں۔ بھلا دیواریں تو باتیں نہیں کر سکتیں۔





تیرے انتقام نے برباد کیا نشیمن

سچی کہانی



عابدہ پروین

گاڑی پارک کر کے کنول جونہی پلٹی ناصر سے ٹکرا گئی۔

"ویری سوری" ناصر بولا

کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو ٹکرانے کا بہانہ چاہیئے۔ لیکن میں تمہیں لفٹ کبھی نہ دوں گی۔ تم جو اتنے گریس فل اور بیوٹی فل کہلاتے ہو امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے شان بکھیرتے آتے ہو مجھ پر ذرا اثر نہیں کریں گی یہ باتیں۔

کنول نے دل ہی دل میں سوچا اور کوئی جواب دیئے بغیر مڑ گئی۔ اس بے رخی پر ناصر کی طبیعت بجھ کر رہ گئی ــــ کنول۔ ساری جامعہ میرے نام کی مالا جپتی ہے۔ لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی مانند میرے گرد ہالہ بنائے رہتی ہیں۔ لیکن ایک تم ہو جو بڑی مشرق کا پرچار ہی رہتی ہو۔ تمہارا غرور خاک میں نہ ملا دیا تو ناصر نام نہیں ...... یہ ناصر کی ذہنیت تھی۔ اس کی ادائیں تھیں جو بظاہر تو سب کو بڑا شریف الطبع نظر آتا تھا لیکن لڑکیوں کے معاملے میں اس کی طبیعت بڑی اوچھی تھی۔ وہ ہر وقت یہی چاہتا تھا کہ لڑکیاں بس اسی کے نام کی مالا جپتی رہیں۔ کوئی لڑکی اس کی دسترس سے باہر نہ رہے۔

کنول ایک ایسی ہی لڑکی تھی جو باوجود امیرانہ اور آزاد ماحول کے ایک مشرقی لڑکی تھی۔ وہی مشرقی لڑکی کہ والدین نے جس کے نام لکھ دیا اسی کی ہو کر رہ گئی۔ کنول اونچے گھرانے کی چشم و چراغ تھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ غرور اور ناک نام کو بھی نہ تھے۔ مگر جامعہ میں خاص کر طلبا اسے بور سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ زیادہ تر الگ ہی رہا کرتی۔ اپنی نسوانیت کی تشہیر کرنا، اونچے اونچے قہقہے لگانا اس کی عادت نہ تھی۔ بہت لئے دیئے رہتی۔ بچپن سے جس چیز کی تمنا کی وہ حاضر ہوئی ہر خواہش پوری ہوئی۔ کوئی ایسی خواہش ہوگی کہ پوری نہ ہوئی ہو۔ اچھے ماحول اچھے گھرانے سے تعلق تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس لئے بیزار رہا کرتی کہ اس کی منگنی اس کے ماموں زاد ریحان سے ہو چکی تھی اسی بندھن کے سبب وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی دوسرے کے ساتھ اس کا نام منسوب کرے۔ اسے اپنی انا پیاری تھی۔ اپنی عزت عزیز تھی۔ ناصر نے بہت دنوں سے اس کا پیچھا لے رکھا تھا۔ اس کی بھی شاید کوئی خواہش ہو جو پوری نہ ہوئی ہو۔ ایک کنول ہی تھی جو اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ بہت بہت سوچا۔ اپنی حیات کو حاصل کرنے کے لئے بہت ترکیبیں لڑائیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔۔۔۔ ادھر ایم اے سی کے سمسٹر ختم ہو چکے تھے۔ آرٹس لابی ویران نظر آ رہی تھی۔ ناصر کے حواسوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ جب فاخرہ نے کنول کی شادی کا کارڈ تھمایا۔۔۔۔

"یہ کیا ہے؟" ناصر نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"کنول کی شادی کا کارڈ ہے۔ کارڈ تقسیم کرنے کا کام مجھے سونپا ہے۔ بے چاری کاموں میں الجھی ہوئی ہے نا"

فاخرہ اس کی حالت سے بے خبر بولتی چلی گئی۔ ناصر کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ خواب ادھورے رہ گئے۔ سپنے بکھر گئے۔ یہ کیا ہو گیا..... اتنا مختصر عرصہ حیات ..... یہ کیا ہو گیا..... آرزوئیں اس طرح بھی پامال ہوتی ہیں..... تمنائیں یوں بھی ویران ہوتی ہیں.....

کنول! تو نے اچھا نہیں کیا... تو ضرور پچھتائے گی... کنول تجھے پائے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھوں گا... کنول تو نے میرا سکون برباد کیا ہے... کنول تو میری نہیں بنی تو کسی اور کی بھی نہیں بن سکتی.... کنول.... کنول...." وہ غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچتا بڑا پراسرار وجود لگنے لگا۔ فاخرہ غور سے ناصر کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ ناصر کا یہ روپ فاخرہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ واپسی پر کنول کو تمام احوال سنا کر بولی

"کنول۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ناصر ضرور تم میں دلچسپی لیتا ہوگا۔"

"فاخرہ ناصر کی یہ عادت بہت پرانی اور چھچھوری ہے۔"

کنول بے دلی سے بولی۔

ذکر آیا اور ٹل گیا... شادی میں ناصر کے علاوہ سب نے شرکت کی۔ کنول بے حد الجھی الجھی رہی۔ کنول پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ کمخواب کے بے حد قیمتی سوٹ میں، قیمتی جڑاؤ زیورات پہنے، فل میک اپ کئے بے تحاشا غضب ڈھا رہی تھی۔ ریحان اور کنول کی جوڑی خوب سج رہی تھی۔ سب ہی بے تحاشا تعریفوں پر تعریفیں کئے جا رہے تھے اور کنول شرم کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

"ایمان سے غضب ڈھا رہی ہو۔"

فاخرہ نے چپکے سے سرگوشی کی..... شرم سے بوجھل بوجھل پلکیں کنول سے نہ اٹھائی گئیں۔ عارض گلگوں ہو کر رہ گئے۔ اور لبوں پر مدھر سی مسکان پھیل گئی۔ چہرہ کچھ اور شرم کے مارے جھک گیا۔

شادی ہو گئی۔ ہنگامے سرد پڑ گئے۔ دن پہ دن گزرتے چلے گئے۔ فاخرہ جب بھی کنول کے ہاں آتی، جامعہ کے دلچسپ قصے چھیڑ دیتی.... اور یہ دونوں پورا دن ڈھلے رات گئے تک اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہتیں۔ "ادھر کافی دنوں سے ناصر نظر نہیں آیا!"...... فاخرہ بولی۔

"کون ناصر؟"

کنول جانتے بوجھتے بھی انجان بن گئی۔

"ارے وہی ناصر راجہ اندر شہزادیوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے والا۔"

فاخرہ ہنس کر بولی۔ "گھر سے تو ناصر ایسا غائب ہوا ہے کہ بیچارے

والدین اس کی طرف سے بڑے پریشان ہیں۔ گھر سے کوئی اطلاع کئے بغیر ہی غائب ہوگیا ہے۔ بیچاری ماں کا تو رو رو کر برا حال ہوگیا ہے۔"

.... فاخرہ نے تفصیل بتائی..... ریحان کے آجانے سے ذکر ختم ہوگیا لیکن یہ ذکر کنول کی الجھن میں اضافہ کرگیا۔ خدایا یہ لڑکا نہ جانے کیا کریگا کہیں... کہیں میری ازدواجی زندگی میں تلخیاں نہ گھول دے۔ لیکن، دل مطمئن رہتا۔

اسی بات اسی الجھن پر تانے بانے بنتے خوشیاں سمیٹتے کنول کو تین سال ہوگئے۔ فاخرہ کی بھی شادی ہوچکی تھی۔ اب بھی باقاعدگی سے آنا جانا تھا۔ کنول ان دنوں پریشان رہنے لگی تھی کہ گھر میں ننھی منی کلکاریاں گونجنے کی شدید آرزو اور زور پکڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ دن گزرتے چلے گئے۔ بہاریں آتی گئیں۔ خزاں بہاروں کا وجود نگل جاتیں پھر برسات کی نرالی شامیں ہوتیں اور کنول ـــ؟ کنول بے تکان سوچتے سوچتے ذہنی طور پر بیمار رہنے لگی۔ ریحان نے کافی سمجھایا بجھایا۔ گھر والوں نے خوش رہنے کی تلقین کی لیکن کنول کی سوچوں کو کوئی نہ بدل سکا فاخرہ بڑی محبت سے سمجھاتی۔

"کنول ابھی تیری شادی کو صرف چار ہی سال ہوئے ہیں۔ تو ابھی سے یہ روگ پالنے کو ترسنے لگی ہے۔ صبر کرنا۔ ایک نہ ایک دن تیری دعا ضرور پوری ہوگی..."

"نہیں نہیں فاخرہ" کنول رونے لگی۔ "مردوں کی نگاہوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ریحان کو وارث چاہیے.... فاخرہ میں کیا کروں" وہ باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی۔

"کنول ہوش کی دوا کر" فاخرہ بولی۔ "کنول میری ایک ملازمہ ہے۔ اس نے ایک سپیرے کا پتہ بتایا ہے۔ میں نے یونہی اس سے ذکر کیا تھا۔ اس نے وہاں کا پتہ بتایا ہے۔ لیکن ہے بہت دور...."

"فاخرہ مجھے وہاں لے چل فاخرہ.... ورنہ شاید میں جی نہ سکوں" کنول بے چینی سے انگلیاں مروڑ کر کہنے لگی

"لیکن کنول۔ ریحان سے اجازت لے لینا" فاخرہ بولی۔

"نہیں فاخرہ۔ ریحان ایسی باتوں کو نہیں مانتے۔ وہ منع کردیں گے" کنول بے چین ہوگئی۔ "فاخرہ کچھ بتا نا میں کیا کروں"

"ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے" فاخرہ نے کہا۔

"کون سی ترکیب؟" کنول نے جلدی سے کہا۔

"دیکھ ایسا کرتے ہیں کسی دن صبح کے وقت چلتے ہیں۔ جلدی واپس آجائیں گے۔ ریحان کو بھی پتہ نہیں چلے گا اور اپنا کام بھی بن جائے گا۔ لیکن اس بات کا سوائے اپنے کسی سے ذکر نہ کرنا..."

فاخرہ کے کہنے پر کنول بے اختیار بولی۔

"فاخرہ میں کسی سے نہ کہوں گی۔ لیکن تو ضرور چلنا۔ پتہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا"

"ہاں بھئی وہ سب کرلوں گی۔ تم ذرا اپنی حالت کو سنبھالو۔ ابھی سے دیوانی ہورہی ہو...." فاخرہ ہنس کر بولی تو کنول مسکرادی۔

شہر سے باہر آکر کنول پریشان ہوگئی۔

"فاخرہ پتہ تو صحیح ہے نا؟"

"ہاں صحیح تو ہے۔ لیکن ابھی دور ہے"

فاخرہ کچھ سوچ کر بولی۔ پھر گاڑی روک کر پرس سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا۔ پھر کہنے لگی۔ "دیکھ یہ نقشہ ہے۔ تھوڑی دور جاکر بائیں طرف مڑنا ہے۔ آگے کافی فاصلے پر جنگل ہے...."

"لیکن فاخرہ ہمارے ساتھ تو کوئی مرد بھی نہیں۔ پھر جنگل میں ہم تنہا کیسے جائیں گے؟"

کنول گھبرا کر فاخرہ کی بات کاٹ کر بولی۔

"خدا کی بندی اللہ کا نام لیکر جائیں گے۔ وہی مسبب الاسباب ہے۔ بس اب خاموش بیٹھنا"

فاخرہ گاڑی اسٹارٹ کرکے بولی۔ پھر سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔

جنگل کافی گھنا تھا۔ اندر باوجود سورج کی روشنی جانے کے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاڑی قدرے فاصلے پر روک کر فاخرہ کنول کا ہاتھ پکڑ کر بولی "آؤ اب تھوڑا پیدل چلنا ہے"

کنول اور فاخرہ دونوں پیدل چلنے لگیں۔ تھوڑی دور چلی ہوں گی کہ دور ہی سے دھوئیں کے بادل اٹھتے نظر آئے۔

"کنول پتہ چل گیا" فاخرہ کنول کا ہاتھ خوشی سے دبا کر بولی۔

پھر دونوں جھونپڑی کے نزدیک پہنچ چکی تھیں۔ یہاں جھونپڑی کے گرد عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کنول نے گھبرا کر فوراً ناک پر رومال رکھ لیا۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک آدمی نکل آیا۔ بڑی بڑی مونچھیں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے پڑے تھے۔ بال کھچڑی سے ہورہے تھے۔ رنگ سیاہی مائل تھا....

"یہ جگہ راج ناگ ہی کی ہے نا؟" فاخرہ جلدی سے بولی۔

"ہاں۔ کیا کام ہے؟" اس شخص نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"کام انہی کو بتائیں گے۔ بابا تو ہیں نا!" فاخرہ بولی۔

"کیسے کام ہے؟"

فاخرہ نے کنول کی طرف اشارہ کیا۔ بیچاری کنول گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"تھوڑا انتظار کرو۔"

وہ شخص جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

"فاخرہ۔ میرا دل گھبرانے لگا ہے۔"

دل گھبرانے لگا ہے کیوں؟ فاخرہ بولی۔ "پگلی دل کو سنبھال نا ... دور تک آ گئے ہیں۔ اب دل پکا کرلے نا...."

"جاؤ اندر۔" تحکمانہ لہجے میں وہ آ کر بولا۔

کنول نے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ فاخرہ نے نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دی اور کنول لرزتی ٹانگوں، دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ دل میں دعائیں ابھر رہی تھیں۔ حق اللہ.... اللہ ہو ... سن کر کنول چونک گئی۔ کڑوں کی کھنکتی آواز کانوں میں پڑی ... نگاہوں کے سامنے ایک لمبی سی داڑھی والا شخص بیٹھا تھا ... نے ... میں بند کر رکھی تھیں۔ کنول نے اس کے سراپے کا ڈرتے ڈرتے جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ بھی اس شخص جیسا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے پڑے تھے۔ گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی مالائیں پڑی تھیں۔ بال بڑی بے ترتیبی سے شانوں پر لٹوں کی صورت میں جھول رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا پکڑا ہوا تھا جو کہ کالا ہو چکا تھا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا.... روزمرہ کے چند برتن بے ترتیبی سے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

"بول کیا مانگتی ہے لڑکی؟"

بابا نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے سراپے کا جائزہ لیا اور حیران نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ کان دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ ہاں وہی چار سال پہلے کی طرح .... کنول ان سرخ سرخ آنکھوں سے ڈر گئی۔ یہ انداز کیسا ہے۔ یہ لہجہ کیسا ہے۔ جیسے کہیں سنا ہو۔ کہاں... کب... کیسے.... کس جگہ.... کوئی جگہ یاد نہ آئی... کوئی نام ذہن میں نہ آیا..... الٰہی یہ کیسا مقام ہے۔

"لے یہ گولیاں دودھ سے کھا لینا۔ پر دیکھ کسی کو دکھانا نہیں انشاء اللہ تھوڑے دنوں بعد ہی ثمر مل جائے گا۔" کنول نے آگے بڑھ کر جھک کر گولیاں اٹھا لیں۔ ہاتھ لگتے ہی کنول کے سارے جسم میں جھرجھری سی آ گئی... کنول دل میں سوچنے لگی پیسے نکال کر دے یا نہ دے۔ لیکن اس کی یہ مشکل خود بابا نے یہ کہہ کر دی کہ

"ہم کوئی پیسہ نہیں لیتے۔"

کنول بغیر کچھ کہے جھونپڑی سے باہر آ گئی۔ عجیب گھٹے گھٹے ماحول میں دم رکنے لگا تھا۔

"آؤ فاخرہ۔"

کنول نے پیشانی سے پسینہ رومال میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"کام ہو گیا؟" فاخرہ بولی۔

"ہاں۔"

پھر دونوں چلنے لگیں۔ جھونپڑی کے دروازے پر ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور بابا جھونپڑی کے دروازے پر آ کر جاتی ہوئی فاخرہ اور کنول کو تکنے لگا۔

"کیوں استاد.....؟" وہی شخص بابا کے قریب آ کر بولا۔

"آج سے یہ دھندا ختم۔ بابر۔ آج میرا مشن ختم ہو گیا۔" بابا نے ٹھنڈی سانس لی اور دونوں کے چہروں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

کافی دنوں کے بعد فاخرہ کنول کے گھر آئی۔ کنول نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"فاخرہ۔ ایک عجیب صورت حال درپیش ہے۔ جب سے گولیاں کھائی ہیں ہر وقت دودھ پینے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن دودھ پیتی ہوں تو متلی ہونے لگتی ہے۔ دودھ نہ پیوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"کنول پریشان کیوں ہوتی ہو۔ گولیوں کے ساتھ دودھ پینے کو بتایا ہے تو جیسی دوا ہو گی ویسی ہی غذا بھی کھانی پڑے گی۔"

فاخرہ نے کہا۔

"لیکن فاخرہ آخر کب تک ایسا کرتی رہوں۔"

کنول پریشانی سے بولی تو فاخرہ سے رہا نہ گیا۔

"کنول ایسا کرو اپنا ایکسرے کروا لو...."

فاخرہ نے انتہائی خلوص سے مشورہ دیا۔

"لیکن تم ساتھ چلنا۔" کنول بولی

"دل و جان حاضر ہے۔"

فاخرہ بولی۔

ڈاکٹر ایکسرے رپورٹ سامنے رکھے پریشانی کے عالم میں انگلیوں کے پوروں سے پیشانی کو بار بار مسل رہا تھا۔ کنول اور فاخرہ ایکسرے کے تیسرے دن آئیں تو ڈاکٹر نے کنول سے کہا کہ آپ اپنے شوہر کو ساتھ لائیے۔ انہیں سے مفصل گفتگو ہو گی۔ کنول نے پریشانی سے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ فاخرہ نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ان کے شوہر ریحان ضرور آتے لیکن ذرا کاروباری قسم کے آدمی ہیں مصروف رہتے ہیں۔"
"کیا مصروفیت سے تھوڑا سا وقت نہیں نکال سکتے؟"
ڈاکٹر نے براہ راست کنول کی طرف دیکھ کر اسی کو مخاطب کر کے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ وہ ساتھ آجائیں گے۔" کنول نے رضامندی دے دی۔ "لیکن ڈاکٹر ایکسرے رپورٹ تو دے دیں۔"
"نہیں بی بی کنول۔ ریحان صاحب ہی کو یہ رپورٹ دیں گے" ڈاکٹر بولا۔
"اچھا جیسی آپ کی مرضی۔" کنول بولی اور دونوں چلی آئیں۔
اس کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد کا ذکر ہے کہ کنول کی حالت اچانک خراب ہوگئی۔ ریحان پریشان ہوگئے۔ فوراً فاخرہ کو اور کنول کی امی اور ابو کو بلوایا۔ فاخرہ نے اسی ہسپتال میں لے جانے کو کہا۔ جس میں کنول کا ایکسرے ہوچکا تھا۔ کنول بےہوش پڑی تھی۔ سب ہی امید و بیم کے بھنور میں پھنسے تھے۔ کب کشتی ساحل کو لگے۔
ڈاکٹر ریحان کو دیکھتے ہی بولا۔
"آپ کنول کے شوہر ریحان ہیں؟"
"جی ہاں!"
ریحان نے جواب دیا۔
ڈاکٹر نے ایک نظر بےہوش کنول پر ڈالی اور کہا۔
"آپ لوگ آپریشن کے لئے راضی ہیں؟ کنول کا کیس بہت سیریس ہوچکا ہے۔"
"کیا اس سے پہلے کنول یہاں آچکی ہیں؟" ریحان نے براہ راست ڈاکٹر سے پوچھا۔
"ہاں جی اور ان کا ایکسرے بھی ہوچکا ہے۔ رپورٹ بھی آچکی ہے۔ بس آپریشن کرنا باقی رہ گیا ہے۔ ورنہ بصورت دیگر مریضہ کی جان خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے۔" ڈاکٹر نے مختصر الفاظ میں کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "ویسے بھی مسٹر ریحان۔ اگر فالتو باتوں میں وقت ضائع کیا گیا تو وقت ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"
آپریشن کا سنتے ہی کنول کی امی رونے لگیں اور ابو پریشان ہوگئے۔ خود ریحان اور فاخرہ بھی کافی پریشان ہونے لگے تھے۔ فاخرہ تو اس گھڑی کو کوس رہی تھی جب وہ بابا سپیرے کے پاس گئی تھیں...
"محترمہ ٹائم کیا ہوا ہے؟" ایک بچے نے آکر فاخرہ سے پوچھا۔
"بارہ بجے ہیں!"
فاخرہ نے مختصر سا جواب دیا۔
آپریشن تھیٹر میں کنول کو لے جایا جاچکا تھا۔ سارے ڈاکٹر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ خود ڈاکٹر عامر بے حد پریشان پھر رہے تھے جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو۔ کیا کریں کیا نہ کریں... تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سب بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ فاخرہ کنول کی امی کو تسلیاں دیئے جارہی تھی۔ خود اس کی حالت بھی دگرگوں ہو رہی تھی۔ ریحان الگ پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ کنول کے ابو الگ بیتاب بیتاب نظر آرہے تھے۔ لیکن دل کا درد چھپا کر ریحان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اپنے دل کا دکھ چھپا کر فاخرہ اور کنول کی امی کو تسلی دے رہے تھے۔
"محترمہ۔ ٹائم بتا دیں۔" وہی بچہ پھر فاخرہ کے پاس آکر بولا
فاخرہ نے گھڑی دیکھ کر ٹائم بتا دیا اور بینچ پر بیٹھ گئی۔ کنول کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ سلامتی کی دعا نکل رہی تھی۔ دل ایک نئے درد سے آشنا ہو رہا تھا۔ بڑی بے چینی سے سب ہی کی نگاہیں آپریشن تھیٹر پر لگی تھیں۔ کب خبر آئے۔ کب پتہ ملے کہ دل کو قرار مل جائے۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ پھر اسی لڑکے نے وقت پوچھا۔ فاخرہ نے پھر بتا دیا۔
تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر عامر آپریشن روم سے نکلتے دکھائی دیئے۔ چہرے سے بہت زیادہ تکان ظاہر ہو رہی تھی۔ بڑے ہی پژمردہ دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اشارے سے ریحان اور کنول کے امی ابو کو اپنے روم میں بلایا۔ میز کے پیچھے جا کر کرسی پر بیٹھ گئے اور انہیں بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"ڈاکٹر۔ کنول تو ٹھیک ہیں نا؟ آپریشن کامیاب ہوگیا نا؟؟" ریحان سے صبر نہ ہوا تو انھوں نے پوچھ ہی لیا۔
"پہلے آپ لوگ میرے سوالوں کا جواب دیں۔ ویسے آپریشن ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر مضمحل سے لہجے میں بولا۔
"ڈاکٹر۔ کتنی دیر اور لگے گی؟" کنول کی امی بیتابی سے بولیں۔
"شاید آدھا گھنٹہ اور لگے۔"
ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا۔
"کیا آپ لوگوں نے کنول کو کوئی دوائی کھلائی تھی۔"
ڈاکٹر نے پوچھا۔
"نہیں ڈاکٹر کنول بھلا کونسی دوا کھائے گی۔"
کنول کی امی پریشانی سے بولیں۔
تو فاخرہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ ڈاکٹر نے ریحان سے پوچھا۔

"آپ کیا کہتے ہیں مسٹر ریحان؟"
"ڈاکٹر۔ مجھے بتلائیے بغیر کنول کوئی کام نہیں کرتی، پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟"
"کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے مسٹر ریحان۔ ورنہ کیس اس طرح اچانک سیریس ہو جاتے۔ یہ بات دل کو نہیں لگتی... ذرا ادھر آئیے...؟" ڈاکٹر نے آنکھ کے اشارے سے ریحان کو قریب بلایا اور میز کی دراز سے ایکسرے رپورٹ نکال کر فائلوں کی آڑ میں رکھ کر دکھانے لگے اور آہستگی سے بولے۔ "مسٹر ریحان اب آپ خود فیصلہ کرلیں ایکسرے رپورٹ دیکھ کر۔"
ریحان نے غور سے ایکسرے دیکھے تو نگاہیں گویا پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں۔ ایکسرے میں دو سانپ پھن اٹھائے کھڑے تھے.... انھیں یقین ہی نہ آیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کون ہو سکتا ہے جس نے کنول کو کچھ کھلایا ہوگا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ دماغ ماؤف ہونے لگا۔
"مسٹر ریحان۔ یہی وجہ ہے کہ کنول کو دودھ کی طلب زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے دو دن تک دودھ نہ پیا ہوگا جس کی وجہ سے ان کے اندر جسمانی ساخت کو نقصان پہنچ گیا۔ اندر جب سنپولیوں کو خوراک نہ ملی تو انھوں نے ڈنک مار مار کر اپنا زہر پھیلایا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سارے جسم میں زہر خون میں سرایت کر چکا ہے۔ اب کنول کو بچانا ناممکن نہیں۔ آدھ گھنٹہ ان کی زندگی میں نہایت اہم ہے۔ دیکھیں شاید خدا کوئی سبیل نکال دے۔"
"بیٹے۔ کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟" کنول کی امی نے پریشانی سے پوچھا۔
"نہیں پھوپھی جان۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں" ریحان تسلی دینے کو بولے۔ اسی اثنا میں پھر اسی لڑکے نے کمرے میں جھانکا۔ وہ فاخرہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر بولا
"ٹائم بتادیں۔"
فاخرہ نے کہا "ادھر آؤ ذرا۔"
"جی۔" وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوا۔ جونہی وہ نزدیک پہنچا فاخرہ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔
"بتاؤ تم بار بار ٹائم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
لڑکے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ خوف کے مارے بری طرح سہم گیا۔
"بتاؤ...." فاخرہ نے سختی سے کہا۔

"یہ لے لیں۔" لڑکے کی آنکھوں میں مارے ڈر کے آنسو آ چکے تھے۔ "یہ ایک صاحب نے دیا ہے۔ کہہ رہے تھے جب دو بج جائیں تو انہیں دے دینا۔" لڑکے نے ایک پرچہ فاخرہ کی طرف بڑھایا۔
"انھوں نے کسے دینے کو کہا تھا؟"
"آپ کو دینے کو کہا تھا۔" لڑکا بولا۔
فاخرہ نے لڑکے کی کلائی چھوڑ دی۔ ریحان اور ڈاکٹر ایکسرے رپورٹ ہی دیکھ رہے تھے۔ کنول کی امی ابو میز کے دوسری طرف بیٹھے دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے۔ فاخرہ نے بیتابی سے پرچہ کھولا۔ جوں جوں پڑھتی گئی رنگ فق ہوتا چلا گیا۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔ خط کے اختتام پر تو فاخرہ بیدم سی ہو کر تیورا کر گر پڑی۔ "کنول!" ریحان نے چونک کر فاخرہ کی طرف دیکھا جو بے ترتیبی سے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ کنول کے امی، ابو اور ڈاکٹر جلدی سے کرسیاں کھسکا کر آئے۔ سسٹر... سسٹر ڈاکٹر نے سسٹر کو آواز دی۔
"یس ڈاکٹر۔"
"پلیز انہیں فوراً اسٹریچر پر لٹانے میں مدد کرو اور ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ ذرا میں آپریشن روم سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔"
.... لیکن ڈاکٹر کے جانے سے پہلے ہی دوسرے ڈاکٹر کمرے میں آ گئے اور مایوسی سے گردن ہلادی...
"اوہ۔" ڈاکٹر عاصم ٹھنڈی سانس لیکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ان لوگوں سے کہیں کہ ان کی کنول کو بچانے میں ڈاکٹر ناکام رہے ہیں۔" ریحان نے فاخرہ کے ہاتھ میں دبا پرچہ نکالا اور تجسس سے پڑھنے لگا۔ پریشانی کے عالم میں اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر بڑے غور سے ریحان کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ پورا پرچہ پڑھ کر ریحان پاگل ہو اٹھا۔ آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔ پھوپھی کے گلے لگ کر رو دیا۔ "پھوپھی جان کنول روٹھ کر چلی گئیں۔ پھوپھی جان میری کنول اب کبھی نہیں آئیں گی.... کنول.... کنول...."
کنول کی امی صدمے سے بے ہوش ہو گئیں اور ابو تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ جوان بیٹی کا غم کم نہ تھا۔ دل ٹوٹ گیا تھا۔ ارمان لٹ گئے تھے.... سپنے بکھر گئے تھے۔ دل جو ناداں بھی ہوتا ہے نرم بھی.. خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ ڈاکٹر سے ریحان کا رونا نہ دیکھا گیا۔
"مسٹر ریحان۔ پلیز اپنے آپ کو سنبھالیے۔"

"ڈاکٹر! دیکھئے میری کنول کی خوشیوں اور میری خوشیوں کا قاتل یہ ہے۔" ریحان نے مٹھی کھول کر پرچہ ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ پرچہ کیا تھا انتقام کے زہر میں بجھی ہوئی تحریر تھی جس نے نشیمن کو جلا ڈالا تھا۔ تنکے تنکے جمع کر کے ایک آشیاں بنا تھا، لیکن انتقام کے اندھے شعلوں نے جلا کر بھسم کر دیا۔ پرچے میں تحریر تھا۔

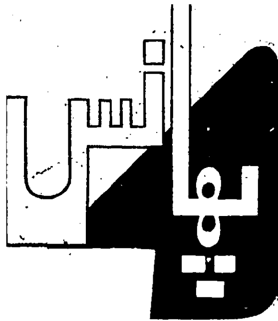
عزیز از جان کنول!

حیران نہ ہو، میں تم سے مخاطب ہوں۔ ہاں میں ناصر۔ شاید تم یہ سمجھ چکی ہو گی کہ ناصر مر چکا ہے لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ناصر دنیا والوں کو دھوکا دینے کے لئے ان کی نظروں سے چھپ ضرور گیا تھا لیکن مرا ہرگز نہ تھا۔ آج میرے انتقام کی آگ کو تسکین مل چکی ہے۔ یاد ہے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو چیز مجھے پسند آ جائے اسے جبراً چھین بھی لیا کرتا ہوں۔ آج میں نے تم سے تمہیں چھین لیا ہے۔ میرے دل کو سکون نصیب ہو چکا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو تمہاری شادی کا سن کر دل بیتاب پہ کیا گزر رہی... اور پھر میں نے وہ سب کچھ کر ڈالا کہ شاید کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ تمہارے گھر کی ایک ملازمہ سے میں نے گھر کے سارے حالات معلوم کر لئے تھے۔ میں بہت گھبرایا اور نروس سا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر میں نے اور میرے دوست نے ایک منصوبہ بنا ڈالا اور جنگل میں بسیرا کر لیا۔ گھر سے غائب رہنے پر میرے والدین پریشان تھے۔ انہیں میں نے بہلا پھسلا کر دوسرے ملک جانے کی اجازت لے لی اور اس طرح انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ میں کیا کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہوں۔ یقین کرو تمہاری طرف سے دل کڑھتا تھا۔ ایک جذبہ کہتا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ ختم کر دوں۔ دوسرا خیال آتا تھا کہ معصوم زندگی لے کر کیا ملے گا۔ لیکن تمہاری بے رخیاں، بے التفاتیاں یاد آتیں تو دل چور چور ہو جاتا اور میں نے ایک مصمم ارادہ کر لیا اور اسے عملی جامہ بھی پہنا ڈالا۔ اور میری آرزو اور خواہش کے خلاف غیر متوقع طور پر تم آ پہنچیں۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچ گیا۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ یوں میں نے اپنی دانست میں تم سے انتقام لے ڈالا۔

جب تم اس دنیا سے رخصت ہو گی تب تک میرے قدم ایک نئے دیس کی سرزمین کو چھو رہے ہوں گے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا انتقام پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔

ناصر

قسط ۷



ریحانہ زیدی



کمرے میں رات تھی۔

مگر باہر کھیتوں میں صبح آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔

آسمان کے آخری کناروں سے ابھرنے والی سفید روشنی اندھیرے کی چادر کو لپیٹتے ہوئے مغرب کی طرف رکھنے جا رہی تھی۔

سڑک کے دوسری طرف بنی ہوئی کانٹوں کی باڑھ کے اندر گوالا بھینسوں کا دودھ نکال رہا تھا۔

اس ملگجے اندھیرے میں بھی سفید دودھاری لکیریں بالٹی میں گرتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دور پر کھونٹے سے بندھا بچہ اپنی رسیاں تڑانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے ماں ماں چلا رہا تھا۔

وہ کافی دیر سے سڑک کی طرف والی بالکونی پہ جھکی کھڑی تھی۔

یہ سارے کا سارا ماحول اسے زندگی اور حقیقت سے بے حد قریب لگ رہا تھا۔ کراچی میں تو ایسے ماحول کا تصور ہی محال ہے۔ وہاں بھی جس علاقے میں ماموں رہتے تھے، کراچی ہی سے ملتا جلتا تھا۔

گوالے نے دودھ نکال کر ساری بھینسیں باہر ہانک دیں۔

سرخ رنگ کے پھول دار کپڑوں والی ایک عورت اندر سے آ کر بالٹیوں کا دودھ ڈرموں میں بھرنے لگی۔ گوالا بھینسوں کو کھیتوں کی طرف ہانک کر اندر آیا اور ڈرم اٹھا اٹھا کر سڑک پر کھڑی خچر گاڑی پہ ترتیب سے رکھنے لگا۔

وہ ہر بار اندر جاتے ہوئے اپنی ناک ضرور پونچھتا تھا۔

اس نے خوب گھیر دار پرانی شلوار پہن رکھی تھی جس کا رنگ کبھی کالا ہوگا مگر اب کالی اور سرمئی دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ اوپر قمیص کے بجائے واسکٹ پہنی ہوئی تھی جس میں چار بڑی بڑی جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ سر پہ گلابی چیک دار کپڑا باندھا ہوا تھا۔ اسی کے کونے کو ناک تک لا کے رومال کی جگہ استعمال کرتا تھا۔

کھڑکی سے اندر جانے والی مسلسل ہوا سے سارہ چھینکیں مارنے لگی تو فاخرہ نے کھڑکی بند کر دی

"ارے تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟" سارہ نے لحاف سے منہ نکال کر پوچھا۔

"ہاں۔ میں نماز پڑھ کے ادھر آ گئی تھی۔" فاخرہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

سارہ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور چھلانگ مار کر چپلیں پہنتی ہوئی نیچے بھاگی۔

"ہمیشہ تنگ وقت پہ نماز پڑھتی ہو۔ فرشتے اٹھا کر پھینک دیتے ہیں ایسی نماز کو۔" اماں جان حسب عادت بڑبڑائیں۔

"فرشتے کون ہوتے ہیں ہمارے اور اللہ میاں کے درمیان ٹانگ اڑانے والے؟" سارہ نے نیت باندھنے سے پہلے کہا۔

"توبہ کر لڑکی۔ کفر بکتی ہے۔" اماں جان کان مروڑ کے گلے پیٹتی ہوئی بولیں۔

فاخرہ کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

وہ بھی چادر اوڑھ کر نیچے آ گئی۔

کراچی کے مقابلے میں یہاں سردی زیادہ تھی۔

اماں جان تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

قاسم باورچی خانے میں جلدی جلدی چائے پیالیوں میں انڈیل رہا تھا۔

کمرے میں مجو چاچا زور زور سے سورہ یٰسین پڑھ رہے تھے۔

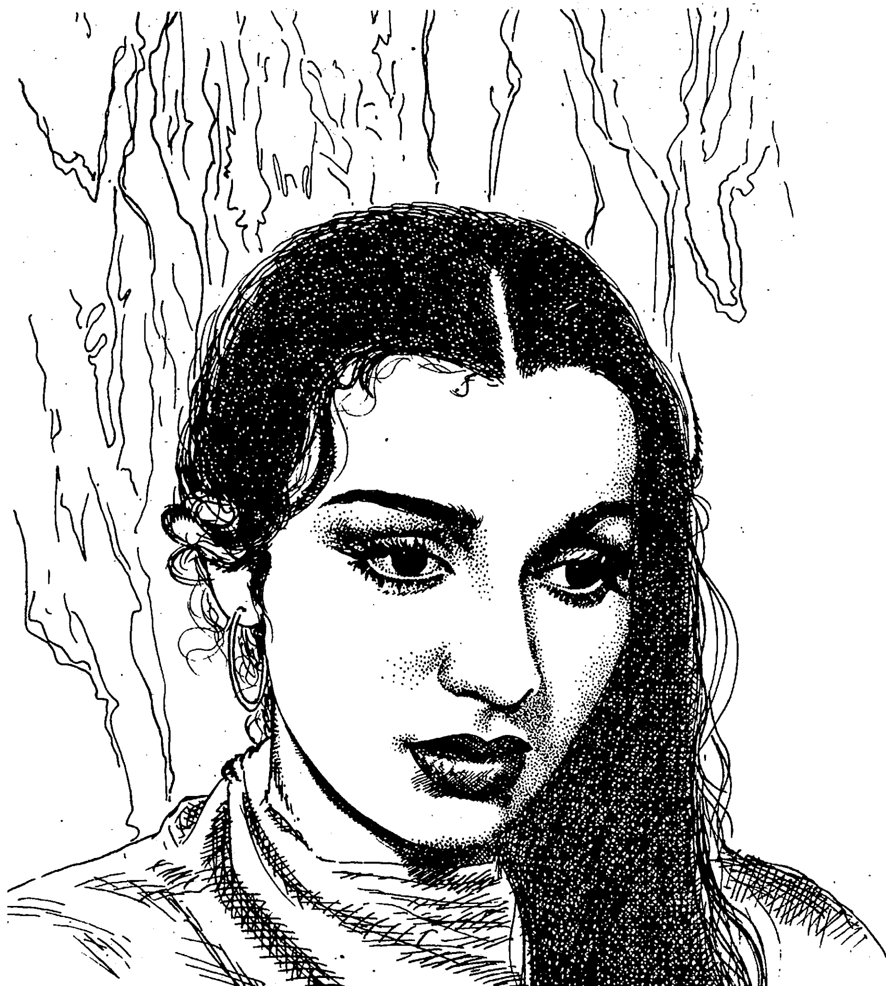
"توبہ ہے یہ مجو چاچا خود اونچا سنتے ہیں تو کراماً کاتبین کو بھی اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔" سارہ سلام پھیر کر بڑبڑائی۔

فاخرہ پھر ہنسنے لگی۔

قاسم چائے لے آیا تو وہ بھی آکر تخت پر بیٹھ گئی۔

"بہت شوخ ہوگئی ہو آج کل۔" فاخرہ نے آہستہ سے کہا۔

سارہ اسے آنکھیں دکھانے لگی۔



"تمھارے پیچھے سے نجمہ نے کئی بار بلوایا تھا۔ آج تم دونوں ہو آنا ناشتہ کرکے۔" اماں جان چائے ختم کر کے بولیں۔
ناشتہ کرکے جب یہ دونوں نجمہ کے ہاں پہنچیں تو وہ اپنا کمرہ ٹھیک کر رہی تھی۔
"ارے باجی آپ آگئیں۔ وہ بیڈ کور بدلتے بدلتے بھاگ کر سارہ سے لپٹ گئی۔
یہ کون ہیں آپ کے ساتھ؟" اس نے فاخرہ کو دیکھ پوچھا۔
"یہ میری خالہ زاد بہن ہے فاخرہ۔ سارہ نے تعارف کروایا۔
"اچھا اچھا۔ یہ فاخرہ باجی ہیں۔ آپ ان کا ذکر تو بہت کرتی تھیں۔ یہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہوں گی؟" نجمہ نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں ان ہی کو لینے تو کراچی گئی تھی۔ کراچی کے اسکول ہنگاموں کی وجہ سے بند ہیں۔ اماں جان نے کہا کہ فاخرہ کو لے آؤ تو میں اور قاسم چلے گئے پرسوں صبح ہی صبح۔" سارہ بیڈ کے کونے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔
آیئے فاخرہ باجی آپ ادھر آجایئے۔" نجمہ فاخرہ کا ہاتھ پکڑ کر سے اپنے ساتھ دوسرے بیڈ پہ لے آئی۔
اور باجی۔ آپ کو کچھ پتہ ہے۔ جس دن آپ گئی تھیں اسی دن میرا رزلٹ آگیا تھا اور آپ کی محنت سے میں سارے پرچوں میں پاس ہوگئی ہوں۔" نجمہ نے چمکتی ہوئی آنکھوں کو جھپکا جھپکا کر بتایا۔
"ارے واقعی۔" سارہ نے اٹھ کر نجمہ کو گلے لگالیا۔
اس کا ماتھا چومتے وقت سارہ نے دیکھا۔ نجمہ کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔
"اور مٹھائی کہاں ہے میرے حصے کی۔" سارہ نے بات ٹالی۔
"میں ابھی لائی۔" نجمہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔
فاخرہ اٹھ کر کمرے میں چاروں طرف لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔
ارے آپ کب آئیں؟" مدد علی نے اندر آکر پوچھا۔
فاخرہ پلٹی تو مدد علی منہ کھول کر رہ گئے۔
"بس بابا یہ لوگ ابھی آئے ہیں۔" نجمہ بھری ہوئی ٹرے اندر لاتی ہوئی بولی۔
مگر مدد علی کوئی جواب نہ دے پائے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔
"یہ میری خالہ زاد بہن ہیں فاخرہ۔" سارہ نے تعارف کروایا۔
"اچھا اچھا بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مدد علی سنبھل کر بولے۔
"آپ کراچی کیوں چلی گئیں تھیں اچانک؟" مدد علی نے کریدا۔ ان کا اسکول بھی کراچی کے ہنگاموں کی وجہ سے بند ہوگیا تھا۔ اماں جان نے کہا ان کو لے آؤ سو جا کر تو میں اور قاسم چلے گئے تھے۔ سارہ کی بات پر مدد علی بے چین ہوگئے۔
"پتہ ہے باجی میں اور بابا اگلے ماہ چیک جا رہے ہیں۔" نجمہ نے چائے بناتے ہوئے مژدہ سنایا۔
"بھئی یہ سن کر تو بہت خوشی ہوئی۔ سارہ واقعی خوش تھی۔ وہاں سے واپسی پر میں بابا کی دوسری شادی کرواؤں گی۔ باجی مجھے بھائی کی بہت آرزو ہے۔" نجمہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"ہو سکتا ہے خدا نے تمھاری یہ آرزو سن لی ہو۔ اگر تمھیں پلا پلایا بھائی مل جائے تو کیا کرو گی؟" سارہ نے اندھیرے میں تیر چلایا۔
مدد علی پہلو بدل کر رہ گئے۔
"پلا پلایا بھائی کہاں سے مل جائے گا؟" نجمہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ان کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی لاوارث بچے کو لے کر پال لو۔" فاخرہ نے بات سنبھالی۔
"باجی۔ پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا مگر بابا نہیں مانے۔ کہتے تھے اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔ لاوارث بچوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کون ہیں۔ کیا پتہ بڑے ہو کر وہ ہمارے لئے مصیبت ہی نہ بن جائے۔" نجمہ نے باپ کی تائید چاہی۔
مگر مدد علی کچھ نہ بولے۔ بس سر جھکائے سوچتے رہے۔

بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو وارثوں کی موجودگی میں لاوارثوں کی طرح پلتے ہیں۔ میری نظر میں ایک ایسا بچہ ہے۔ سب سے مشورہ کرکے بتا دینا میں دلوا دوں گی۔" سارہ نے اب بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

اب مدد علی کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"سارہ بی بی۔ اگر ایسا کوئی بچہ ہو جو وارثوں کی موجودگی میں بھی لاوارثوں کی طرح پل رہا ہو تو میرا وعدہ ہے میں اسے ضرور گود لے لوں گا۔" انہوں نے بہت ضبط کرکے کہا۔

"دیکھا نجمہ تمہارے بابا کتنے اچھے ہیں۔" سارہ کے جملے پر ان کے تیور چڑھ گئے اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ جب اپنے کو نارمل نہ کر پائے تو ابھی آنے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔ سارہ اور فاخرہ کافی دیر بیٹھ کر گھر واپس آگئیں۔ مگر مدد علی نہ لوٹے۔

"تمہیں مدد علی کو اتنا کچھ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔" گھر آکر فاخرہ نے سارہ کو سرزنش کی۔

"میں نے تو اور زیادہ عاجز کرنے کا سوچا ہوا تھا۔ مگر وہ میرے تیور دیکھ کر خود ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ سارہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"بری بات ہے سارہ، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ فاخرہ نے پھر ٹوکا۔

"ہاں غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ مگر یہ ہر لمحے اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنے پر کیوں تلے رہتے ہیں۔" سارہ نے جلبلا کر جواب دیا۔

فاخرہ کچھ کہنے کو تھی کہ نیچے سے اماں جان نے آواز لگائی۔

سارہ نے جھانک کر دیکھا۔ اماں جان اسے نیچے آنے کا اشارہ کرکے بتا رہی تھیں کہ کوئی آیا ہے۔

وہ دونوں نیچے آئیں تو بیٹھک میں مدد علی کو بیٹھے پایا۔

دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہاتھوں کے پیالے پر ٹھوڑی رکھے وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھے۔

"آپ کب آئیں میڈم؟" انھوں نے فاخرہ سے پوچھا۔

"کل رات کو۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"گھر پہ۔ پھپھو اس کے پاس ہیں۔"

"اگر آپ کو اس کی موجودگی پہ اعتراض ہو تو میں اسے وہاں سے ہٹا دوں؟" مدد علی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ مجھے اس کی موجودگی پر اعتراض ہوگیا ہے؟" فاخرہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ان کی باتوں سے۔" انھوں نے سارہ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

سارہ شرمندہ سی ہوکر رہ گئی۔

میں نے خود ہی سوچ رکھا ہے کہ مناسب وقت دیکھ کر اس بچے کو گھر لے آؤں گا۔ مگر فی الحال بابا کی زندگی میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔" مدد علی کا لہجہ بہت مخجل تھا۔

"کیوں۔ بابا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیا؟" سارہ چپ نہ رہ سکی۔

مدد علی نے سارہ کو غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارا یہ راز کسی اور پر بھی کھلے۔ لیکن ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم ہر حال میں قدرت کی مرضی کے تابع ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں گفتگو کرتے وقت ہر لفظ پر انسان مر جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس بے حیا زندگی کا طوق گلے سے اتر نہیں پاتا۔ آپ اسے نجمہ کا بھائی سمجھے بیٹھی ہیں۔ حالانکہ وہ میرا بھائی ہے۔ اگر آپ ذرا سی عقل استعمال کرتیں تو آپ کو خود ہی صورت حال کا علم ہو جاتا مجھے تو پاکستان آئے کل سات ماہ بھی نہیں ہوئے۔ بہرحال میرا خود ارادہ تھا کہ نجمہ کو ساری بات بتا کر اسے گھر لے آؤں گا۔ لیکن ابھی بابا کی زندگی میں کم از کم مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ نجمہ کی نظروں میں انہیں گرا دوں۔" مدد علی نے آہستہ آہستہ بات پوری کی۔

اتنے میں قاسم بسورتا ہوا اندر آیا۔

"کیا ہوگیا قاسم؟" سارہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"چاچا خیرو کہتا ہے میرا ابا جیل میں مر گیا" وہ بات پوری کر کے زور زور سے رونے لگا۔
مدد علی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
"آپ اس کو نہیں روکئے، میں معلوم کر کے آتا ہوں" وہ تیزی سے باہر جاتے ہوئے بولے۔
قاسم کے رونے پر اماں جان بھی اندر آگئیں۔
تھوڑی دیر میں مدد علی نے قاسم کی بات کی تصدیق کر دی۔ در اصل خیرو کا بھائی بھی اسی جیل میں بند تھا جہاں قاسم کا باپ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ قاسم کا باپ افیم کھانے کا عادی تھا۔ جیل میں کچھ دن تو دوسروں سے لی ہوئی گولیاں کام دے گئیں۔ مگر کب تک۔ آخر کار اس بری لت کے پیچھے اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مدد علی خیرو کے ساتھ جا کر اس کی لاش اٹھوا کر لائے اور خود ہی تدفین کے سارے انتظامات کر لئے
اس دن سارہ کو مدد علی عظمت کا مینار لگے۔
جن پر وہ اپنی ناسمجھی سے کیچڑ اچھالنے چلی تھی۔
مگر اپنی نظروں میں آپ شرمندہ ہو گئی۔
اس شرمندگی کے مارے وہ کئی دن تک نہ تو نجمہ سے ملنے جا سکی نہ ہی فاخرہ سے اس سلسلے میں بات کی۔
ایک دن دوپہر وہ دونوں کھانا کھا کر لمبی تانے سو رہی تھیں کہ قاسم نے آوازیں دے دے کر انہیں اٹھا دیا۔
"کیوں صور اسرافیل پھونک رہے ہو؟" سارہ نے اونگھتے ہوئے قاسم کو ڈانٹا۔
"باجی میں نہیں اٹھاتا۔ پر وہ چھوٹے شاہ جی آئے ہیں" قاسم نے نزدیک آ کر آہستہ سے کہا۔
"اچھا چلو میں آتی ہوں" سارہ بال ٹھیک کر کے ان میں پنیں لگاتی ہوئی بولی۔
فاخرہ کو اٹھا کر وہ نیچے جا کر منہ دھونے لگی۔
"بھلا یہ کونسا وقت تھا ان محترم کے آنے کا" وہ چاروں طرف پھیلی دھوپ دیکھ کر بڑبڑائی۔
اماں جان تخت پر بیٹھی قصص الانبیاء پڑھ رہی تھیں۔
وہ منہ پونچھ کر بیٹھک میں چلی گئی۔
"اوہ سوری..... آپ کو میں نے ڈسٹرب کیا شاید۔ سو رہی تھیں آپ" مدد علی پشیمان ہو کر بولے۔
"نہیں۔ سو تو نہیں رہے تھے۔ بس لیٹے ہوئے تھے" سارہ انہیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔
"چار دن ہو گئے۔ آپ لوگ آئیں نہیں۔ نجمہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں آپ کو کوئی بات بری تو نہیں لگ گئی" انھوں نے سارہ کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔
"در اصل میں اپنی اس دن والی باتوں پر سخت نادم تھی" سارہ نے صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔
مدد علی کچھ نہیں بولے۔ آہستہ آہستہ مسکراتے رہے۔
سارہ انہیں یوں مسکراتے دیکھ کر اور بھی پشیمان ہو گئی۔
"آپ سوچتے ہوں گے کہ میں بھی کتنی گندی ذہنیت کی لڑکی ہوں۔ مگر اس میں میرا اتنا زیادہ قصور بھی نہیں۔ در اصل آنکھوں دیکھے واقعات نے مجھے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک رات میں بالکونی پر کھڑی تھی میں نے زینو کے گھر کے سامنے آپ کی جیپ کھڑی دیکھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس تو بجھی ہوئی تھیں مگر پچھلی لال بتیوں میں نمبر صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے دوسرے ہی دن صبح ہی صبح جمعدارنی نے خبر دی کہ زینو بھاگ گئی۔ پھر آپ نے پوہری بازار میں جو شاپنگ کی تھی وہی کپڑے زینو اور اس کے بیٹے کو پہنے دیکھ کر ظاہر ہے مجھے آپ ہی کا کردار مشکوک لگا" سارہ نے دل کا غبار ہلکا کر ڈالا۔
اس کا مطلب ہے کہ صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا حافظہ بھی بہت زیادہ تیز ہے چلئے اب تو بات صاف ہو گئی اب تو میرا کردار مشکوک نہیں رہا؟" مدد علی نے ہنس کر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ سارہ جواب دیتی فاخرہ اندر آگئی۔
"آپ بھی سوتے سوتے اٹھ کر آگئی ہیں شاید۔ میں نے آپ لوگوں کو خاصا پریشان کیا۔ دراصل ان کی جو شاگرد محترمہ ہیں ان سے میں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر سارے پرچوں میں پاس ہوگئیں تو کہیں گھمانے لے چلوں گا۔ ان محترمہ کا بھی خاصا حافظہ تیز ہے۔ اب اٹھتے بیٹھتے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ وعدہ پورا کریں۔ یہاں سے چھ میل دور میرے دوست کا بہت خوبصورت کیلوں اور آموں کا باغ ہے۔ آپ لوگ والدہ صاحبہ سے اجازت لے لیں تو کل صبح نجمہ کے ساتھ چلی چلئے گا۔" مدد علی بات پوری کر کے ان دونوں کے تاثرات دیکھنے لگے۔
"ابھی تو اماں جان قصص الانبیاء پڑھ رہی ہیں۔ اس وقت جس نے بھی ڈسٹرب کیا اسے ضرور جھاڑ پڑ جائے گی۔ اس لئے جب وہ فارغ ہوں گی تب میں ان سے پوچھ کر کہلوا دوں گی۔" سارہ کچھ سوچ کر بولی۔
"ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" مدد علی نے شاید زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔
اماں جان سے غیر مشروط اجازت پا کر جب یہ لوگ پہنچے تو مدد علی اپنے دوست محمد نواز ابڑو کے ساتھ باہر اوطاق پر بیٹھے رہے محمد نواز ابڑو نے باغ کو مردوں کے لئے شجر ممنوعہ بنوا دیا تھا۔ اس لئے یہ تینوں بہت آزادی سے کیلوں کے درمیان اچھل کود مچاتی رہیں۔
دوپہر کو باغ کے رکھوالے کی عورت نے بھر کے کھانا دے گئی۔
مرچوں والا سندھی پلاؤ۔
سندھی طرز پر پکی ہوئی دو پیازہ مرغی۔"
اور تازے مکھن میں ڈوبی ہوئی چاول کی لال لال روٹیاں۔
نجمہ سوچ رہی تھی کہ شاید یہ لوگ اچھی طرح کھانا نہ کھا پائیں گی۔
مگر سارہ اور فاخرہ نے عام دنوں سے کہیں زیادہ کھانا کھایا۔
"قسم سے نجمہ۔ آج تو اتنا کھا لیا ہے کہ ہلنا جلنا دشوار ہے۔" سارہ وہیں گھاس پر لیٹتے ہوئے بولی۔
"تم تو یہاں کافی دنوں سے ہو۔ مگر میں نے تو پہلی مرتبہ کھایا ہے اور بے تحاشہ کھایا ہے۔ ڈر لگ رہا ہے کہیں طبیعت نہ بگڑ جائے۔" فاخرہ بھی سارہ کے برابر لیٹ گئی۔ نجمہ ہنسنے لگی۔
باجی میں تو ڈر رہی تھی کہ شاید آپ کو کھانا پسند نہ آئے۔ مگر آپ لوگوں کی تعریف نے تو دل خوش کر دیا۔ ورنہ شہر سے جب بھی بابا کے اردو بولنے والے دوست آتے تھے۔ بابا گیہوں کی روٹیاں اور سادہ سالن پکوا کر کھلواتے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ چاول کی روٹی کا بڑا مذاق بناتے تھے۔ نجمہ کی بات پر سارہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"نجمہ۔ احمق ہوتے ہیں وہ لوگ۔ کسی ثقافت، رنگ اور تہذیب کا مذاق بناتے ہیں۔ یقین جانو دنیا میں ایسے لوگ کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے۔ اپنے کو برتر اور دوسرے کو کمتر سمجھنا سب سے بڑی ذلالت ہے۔ تم نے تو سنا ہوگا بلکہ پڑھا بھی ہوگا کہ اپنے نبی صلعم نے آخری خطبے میں لوگوں سے کہا تھا کہ فوقیت صرف تقویٰ کی ہے۔ کوئی تہذیب کسی سے برتر نہیں ہے۔ صرف سچائی اور اچھائی برتر ہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ ایسے لوگوں کی عقل پر ماتم کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ جو ایسی احمقانہ باتیں کرتے ہوں۔ بس خدا سے دعا کرو اللہ انہیں عقل دے۔" سارہ بڑے جوش میں بولے چلی جا رہی تھی۔
"اچھا بس اب تقریر ختم بھی کرو۔ یا اب کی الیکشن میں تم بھی صوبائی امیدوار بننا چاہتی ہو؟" فاخرہ نے اسے جذباتی ہوتے دیکھ کر پوچھا۔
سارہ فاخرہ کی بات پر ہنس پڑی۔
نجمہ بھی ان کا ساتھ دینے لگی۔
شام کو جب یہ لوگ خوب تھک تھکا کر گھر واپس آئیں تو دیکھا برآمدے میں شجاع اور ان کی آپا بیٹھے ہوئے تھے۔
سارہ وہیں دروازے پر دم بخود کھڑی رہ گئی۔
ارے شجاع بھائی آپ بغیر اطلاع کیسے آ گئے؟" فاخرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
"میں سکھر گیا تھا آپا کو لینے۔ شفیق نے بتایا تھا کہ راستے میں یہ گاؤں بھی پڑتا ہے۔ آپ کے اسکول سنیچر سے کھل رہے ہیں۔ اس وجہ

سے شفیق کے کہنے کے مطابق میں نے بھی سوچا کہ آپ کو ساتھ لیتا چلوں۔" شجاع نے گڑبڑا کر الٹ پلٹ بات کی۔
فاخرہ اس کی بوکھلاہٹ پر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔
"یعنی آپ نے سب کچھ شفیق کی مرضی کے مطابق کیا۔ آپ کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہاں آنے میں؟" فاخرہ نے شرارت سے پوچھا۔
شجاع نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔
فاخرہ نے پلٹ کر سارہ کو دیکھا۔
وہ موقع غنیمت جان کر اوپر کھسک لی تھی۔
اماں جان باورچی خانے میں ناشتے کا سامان تیار کر رہی تھیں۔ فاخرہ نے جھانک کر دیکھا۔ کوئی چیز نہ تھی سوائے بسکٹوں کے۔
اماں جان ذرا ٹھہریئے۔ میں ابھی کچھ انتظام کرتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
اور قاسم کو ایک چیکے سے باہر کھسک لی۔
وہ سیدھی نجمہ کے گھر آئی۔
مدد علی تولیہ اٹھا کر نہانے جا رہے تھے۔
"سنیئے سنیئے۔" اس نے انہیں راستے میں روک لیا۔
"خیریت تو ہے۔" نجمہ کمرے سے نکل آئی۔
"علی بھائی ہمارے ہاں کچھ خاص مہمان آ گئے ہیں۔ سارہ چھپ کر بیٹھ گئی ہے، ورنہ اسی کے ساتھ شہر جا کر کچھ سامان لے آتی۔ اب آپ اگر مجھے شہر سے کچھ ناشتے کا سامان اور کچھ رات کے کھانے کے لئے لا دیں تو بہت عنایت ہو گی۔ اس نے سو کا نوٹ مدد علی کو دیتے ہوئے کہا۔
"خاص مہمانوں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" انہوں نے تولیہ اتار کر ہنستے ہوئے پوچھا۔
جن صاحب کے ساتھ سارہ کی بات چل رہی ہے وہی بنا بتلائے اپنی آپا کے ساتھ منہ اٹھائے چلے آئے ہیں۔" فاخرہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔
"اوہو۔ پھر تو بس میں ابھی لایا سامان مگر شرط یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے ملوایئے گا۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولے اور جلدی میں فاخرہ کو گھر تک چھوڑنا بھی بھول گئے۔ فاخرہ نجمہ سے پھر آنے کا کہہ کر واپس آ گئی۔
مدد علی نے سامان لانے میں کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھائی۔
ابھی فاخرہ چائے دم دے رہی تھی کہ جیپ کا ہارن سن کر باہر آنا پڑا۔ وہ ٹوکری میں سارا سامان بھرے کھڑے تھے۔
"یہ رہے باقی پیسے۔ اور کہاں ہیں وہ صاحب ذرا باہر تو نکالیں انہیں۔ ہم دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہیں ان سے۔" وہ آستین چڑھا کر بولے۔
"شجاع بھائی ذرا باہر آیئے۔"
فاخرہ کی آواز پر شجاع اٹھ کر باہر آ گیا۔
"آیئے صاحب گلے لگ جایئے۔ ہمارے ہاں ہونے والے بہنوئیوں کا ایسے ہی سواگت کیا جاتا ہے۔" انہوں نے شجاع کو اپنی باہوں کے حصار میں لے کر کہا۔
شجاع سرخ چہرہ لئے ان کے گلے لگ گیا۔
واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے شجاع کو تھام کر بولے۔
"وہ بالکل سچ بول رہے تھے۔" ان کی آنکھیں ان کے الفاظ کی تائید کر رہی تھیں۔
"اس وقت تو آپ تھکے ہوئے ہیں، آرام کیجئے۔ مگر کل دوپہر کا کھانا آپ سب میرے ساتھ کھائیں گے۔" انہوں نے سندھ کی روایتی مہمانداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

(ناول "پھانس" جاری ہے۔ آٹھویں قسط فروری کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نوٹ :۔ صفحہ ۱۶۲ کے آخر میں غلطی سے "پھانس"
کا اختتام لگ گیا ہے۔ اس کا خیال کئے بغیر ناول پڑھتے جائیں۔

"مگر ہم تو کل صبح کراچی واپس جا رہے ہیں"۔ شجاع نے گھبرا کر جواب دیا۔
"کل شام کو چلے جائیے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مدد علی کسی طور نہ مانتے تھے۔
"دراصل میرے ساتھ آپا اور فاخرہ بہن ساتھ ہوں گی۔ اس وجہ سے میں رات کا سفر نہیں کرنا چاہتا"۔ شجاع نے وجہ بتائی۔
"اوہو۔ ٹھیک یاد آیا۔ کل تو مجھے بھی کراچی جانا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ کھانا کھا کر ہم سب اس بیل گاڑی میں چلیں گے کراچی"۔ وہ جیپ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔
اب تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ناچار شجاع کو ہاں کرتے ہی بنی۔
ویسے فاخرہ کو کامل یقین تھا کہ مدد علی نے کراچی جانے کا پروگرام محض ان لوگوں کی وجہ سے بنایا ہے۔ ورنہ انہیں قطعی کراچی نہیں جانا تھا۔ اب نہ جانے وہ فاخرہ کے احسانوں کا بدلہ اتارنا چاہتے تھے۔ یا شجاع کے احترام میں ہنگامی پروگرام بنا رہے تھے۔ سارہ اماں جان کی وجہ سے ایسا اوپر گئی کہ پھر نیچے نہ آئی۔ فاخرہ نے اس کا اور نبیلی کا کھانا اوپر ہی پہنچا دیا۔
"قاسم ایسا کرنا تم اوپر آ جانا ہمارے پاس۔ تمہارے پلنگ پر شجاع بھائی سو جائیں گے کھانا کھا کر"۔ فاخرہ نے قاسم سے کہا۔
"ٹھیک ہے باجی"۔
"نہیں بھئی ہم اور قاسم ایک ساتھ سوئیں گے"۔ شجاع نے فاخرہ کی بات مسترد کر دی۔
پر بھائی میں کپڑے بدل لوں۔ پھر آپ کے ساتھ سوؤں گا۔ باجی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے کپڑے میلے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بدبو آئے گی"۔ قاسم نے معصومیت سے کہا۔
شجاع نے ہنس کر قاسم کو گلے لگا لیا۔
"نہیں میرے پیارے بھیا۔ تمہارے کپڑے بالکل گندے نہیں ہیں۔ تمہارے پاس سے مجھے بالکل بدبو نہیں آئے گی دراصل گندی تو تمہاری باجی ہیں۔ جاؤ کہہ آؤ ان سے"۔ شجاع نے اماں جان اور آپا کو باتوں میں مشغول دیکھ کر کہا۔
نئے بھائی میری باجی تو بہت اچھی ہیں۔ قاسم برامان کر بولا
"اچھا سائیں۔ معاف کرو غلطی ہو گئی"۔ شجاع نے فوراً کان پکڑ لئے۔
قاسم اسے بچوں کی طرح کان پکڑے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔
"اچھا اب تم جا کر سو جاؤ۔ ایک تکیہ اور رکھ لینا۔ میں بھی بس ابھی آیا۔ شجاع نے تھپ تھپا کر کہا تو قاسم سعادت مندی سے اندر جا کر لیٹ گیا۔
"فاخرہ بہن ادھر آئیں ذرا"۔ شجاع نے فاخرہ کو آواز دی۔
فاخرہ چائے بنا رہی تھی۔ ٹرے میں پیالیاں رکھ کے آئی۔
"ہوں کیا بات ہے؟" اماں جان اور آپا کو چائے دیکر وہ شجاع کے پاس آئی۔
"بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے۔ وہ آپ کی بہن محترمہ جو اوپر گئی ہیں تو اب تک نیچے نہیں آئیں"۔ شجاع نے آہستہ سے کہا۔
"اچھا۔ زیادہ ہی فری ہو گئے ہیں شاید۔ وہ اب نیچے تھوڑی آئے گی اماں جان کے سامنے۔ فاخرہ نے آنکھیں دکھائیں۔
"پلیز فاخرہ بہن کوئی سبیل نکالئے۔ کل تو ہم چلے جائیں گے۔ پھر نہ جانے کب تک ملنا نہ ہو۔ پلیز صرف دو منٹ کے لئے ملوا دیجئے"۔ شجاع نے ہاتھ جوڑے۔
"نا نا بابا۔ اماں جان کے سامنے ہم دونوں میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہو سکتی"۔ فاخرہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"اچھا اماں جان سو جائیں تب لے آئیے گا نیچے۔ شجاع نے ترکیب بتائی۔
"کیوں پٹوانے کا ارادہ کر کے آئے ہیں کیا۔ نیچے مجو بابا بہت ہوشیار سوتے ہیں۔ وہاں آپ کہاں بات کر پائیں گے"۔ فاخرہ الجھ کر بولی۔
"اچھا ایسا کیجئے کا سیڑھیوں پر لے آیئے گا۔ ذرا سا کھٹکا ہونے پر میں باتھ روم میں گھس جاؤں گا۔ سارہ واپس اوپر چلی جائے گی۔

فاخرہ سوچ میں پڑ گئی۔

" اچھا سوچوں گی۔ مگر وعدہ نہیں کرتی۔ کیونکہ دوسرا فریق مجھ سے بھی زیادہ ڈرپوک ہے۔ وہ راضی ہوتا تب " فاخرہ نے سوچ کر کہا۔

" نہیں پلیز فاخرہ بہن اسکو کسی طرح راضی کریں۔ اسے میری قسم دے دیں۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آجائے گی۔ شجاع نے ایسے لہجے میں کہا کہ فاخرہ کو ترس آ گیا۔

اور رات گئے جب اماں جان اور آپا کے سوجانے کے بعد وہ سارہ کو اٹھا کر لائی تو سارہ سے زیادہ خود کانپ رہی تھی۔ چاندنی روشنی میں بالکونی پر سے دونوں کو گزرتے دیکھ کر شجاع فوراً اُٹھ کر سیڑھیوں پر آ گیا۔

فاخرہ وہیں بالکونی پر رکھے مونڈھے پر بیٹھ کر اماں جان اور محبوبا باکی نگرانی کرنے لگی۔

" آپ نے مجھے یہاں بلا کر اچھا نہیں کیا۔ کوئی اُٹھ گیا تو کیا ہوگا؟" سارہ نے آہستہ سے شجاع سے کہا۔

" محبت اور جنگ میں سب جائز ہے سارہ۔ میں آپ کو فلرٹ تو نہیں کر رہا نا۔ میں تو آپ کو جائز طریقے سے اپنانا چاہتا ہوں "، شجاع بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

وہ دونوں کافی دیر بیٹھے بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ کوئی بھی نہ اٹھا۔

ہاں البتہ ٹھنڈ میں بیٹھے بیٹھے خود سارہ کو چھینکیں آنے لگیں تو وہ گھبرا کر اوپر واپس آ گئی۔

فاخرہ مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اس کو اٹھا کر سارہ اندر لائی۔

فاخرہ تو اندر آتے ہی لیٹ کر سو گئی۔

مگر سارہ کو مطلق نیند نہ آئی۔

وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔

یہ بھی شکر تھا کہ دونوں زمین پر سو رہی تھیں۔

ورنہ شاید کروٹوں کی آہٹیں کسی کو ہشیار کر دیتیں۔

سارہ کے کانوں میں اب تک شجاع کی آواز گونج رہی تھی۔

ہاتھ اس کے بھاری ہاتھوں کے لمس سے کانپ رہے تھے۔

یہ احساسات اتنے سحر آلود تھے کہ وہ انہیں سو کر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

صبح وہ اماں جان کے ساتھ ہی اٹھ کر نیچے آ گئی اور جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر اوپر بھاگ گئی۔

اس وقت آپا اٹھ چکی تھیں۔ اسے یوں چپکے چپکے اوپر آتے دیکھ کر مسکرا دیں۔

" آداب "، سارہ نے جھینپ کر کہا۔

" جیتی رہو۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تم تو کل سے نظر ہی نہیں آئیں۔ جب میں اوپر آئی تب فاخرہ نے بتایا کہ تم سو چکی ہو "، انھوں نے سارہ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے بالکل پاس بٹھا کر کہا۔

سارہ کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے مسکراتی رہی۔ رات کو فاخرہ کی ہدایت کے مطابق وہ آپا کے سو جانے تک بنی پڑی رہی تھی۔ آپا کی باتوں کی آواز سے فاخرہ بھی اٹھ بیٹھی۔

" اوہو۔ آپ نے صبح ہی صبح اس چڑیل کا منہ دیکھ لیا۔ آج سارا دن بھوکا رہنا پڑے گا " فاخرہ نے آپا سے کہا۔

" نہیں بیٹی۔ ایسا تو نہ کہو۔ دیکھ لینا آج سارا دن اچھا ہی اچھا گزرے گا۔

واقعی آپا کی بات درست نکلی۔

صبح خوب ڈٹ کر ناشتہ کر لینے کے بعد جب مدد علی کے ہاں پہنچے تو انہوں نے زبردست دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ ان لوگوں میں قاسم اور محبوبا باکو نہ پا کر انھوں نے سب سے پہلے ان دونوں کا کھانا گھر بھجوایا۔ پھر ان لوگوں کو اتنے اصرار اور خلوص کے ساتھ کھانا کھلوایا کہ آپا کے ساتھ ساتھ شجاع بھی ان کی مہمان نوازی کا معترف ہو گیا۔

اندر نجمہ شجاع کو دیکھنے کے لئے سخت بے چین تھی۔
"اللہ فاخرہ باجی۔ پلیز مجھے بھی دکھا دیجئے نا شجاع بھائی کو۔ اس نے تھک ہار کر فاخرہ سے سفارش چاہی۔
"اچھا۔ تمہارے پاپا اندر آئیں تو ان سے پوچھتی ہوں" فاخرہ برآمدے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔
مدد علی چائے لینے اندر آئے تو اس نے نجمہ کی خواہش بتا دی۔
"مدد علی سوچ میں پڑ گئے۔
"دیکھئے میڈم در اصل سندھ کے گھر اس طرز کے بنے ہوئے ہوتے ہیں کہ او طاق میں بیٹھنے والا کوئی شخص نظر نہیں آپاتا۔ اس لئے کریں کہ نجمہ کو لیکر اپنے گھر چلی جائیں۔ وہاں اوپر سے وہ بآسانی دیکھ لے گی۔" انہوں نے ترکیب بتائی
اور عمل بھی کر ڈالا۔
خود ہی پہلے جا کر سارہ، اماں جان اور نجمہ کو گھر چھوڑ آئے۔ پھر بقیہ لوگوں کو لیکر گئے۔
نجمہ نے بالکونی میں سے شجاع کو اندر آتے دیکھا۔
اماں جان نیچے ہی تھیں۔
"اللہ باجی بہت پیارے ہیں شجاع بھائی۔" وہ واپس پلٹ کر سارہ سے لپٹ گئی۔
سارہ کانوں تک سرخ ہو گئی
"نجمہ۔ علی بھائی نیچے کھڑے تمہیں بلا رہے ہیں۔" فاخرہ نے اوپر آکر نجمہ سے کہا تو وہ جلدی سے برقعہ پہن کر فاخرہ کے ساتھ نیچے چلی گئی۔
ایک گھنٹے کے بعد حسب وعدہ مدد علی جیپ لے کر ان لوگوں کو کراچی لے جانے کے لئے آگئے۔
"میں بڑی امیدیں لیکر آپ کے پاس آئی تھی۔ ہمیں مایوس مت کیجئے گا خالہ جان۔" آپا نے چلتے وقت اماں جان سے کہا۔ تو سارہ آپ ہی آپ لرز گئی۔
تصویر کے اس رُخ کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔
اگر راجہ بھیا یا اماں جان نے انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گی۔
مگر اماں جان نے چلتے وقت بڑا حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔
انھوں نے کہا
"میں رفیق کو خط لکھواؤں گی تو اپنی طرف سے اس رشتے کے لئے اچھے خیالات کا اظہار بھی کر دوں گی۔ آپ لوگ بے فکر رہیں اللہ کو منظور ہوا تو ضرور بات بن جائے گی۔ اور اگر اسے منظور نہ ہوا تو ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔
ان لوگوں کے جانے کے بعد سارہ چپ چاپ کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اماں جان نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔
وہ رضائی اوڑھے اپنی سوچوں میں گم پڑی رہی۔
"اے اللہ اگر تجھے منظور نہ ہوا تو میں کیا کروں گی بھلا۔" آنسوؤں کے کئی قطرے بنا اطلاع دیئے ٹپک پڑے۔
اے اللہ تو تو اپنے بندوں کو ماں باپ سے ستر گنا زیادہ چاہتا ہے۔
اے اللہ مجھ پر رحم کرنا۔
تو گواہ ہے پروردگار میرے دل میں بے ایمانی نہیں ہے اور شجاع بھی مجھے اپنانے کے سلسلے میں سنجیدہ ہے۔
بس میرے رب تیری رضا کی ضرورت ہے
اب تیرے ہاتھ میں ہے۔
تو چاہے تو ہمیں خوشیوں سے ہمکنار کر دے۔
اور تو نہ چاہے گا تو ہم زندگی بھر انگاروں پر چلتے رہیں گے۔

پھر پروردگار مجھے بھی یقین ہے تو ہم پیا نارحم ضرور کرے گا۔
وہ اپنی سوچوں سے الجھتی نہ جانے کب سو گئی۔

اس دن وہ نجمہ کے ساتھ بیٹھی لوڈو کھیل رہی تھی کہ مدد علی آ گئے۔
"آپ بہت دنوں بعد آئیں!" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں تو۔ میں پرسوں بھی آئی تھی۔" سارہ جھینپ گئی۔
"اچھا اچھا پرسوں تو نہیں تھا۔ کراچی میں گھوم رہا تھا۔ وہ شرارت سے بولے۔
سارہ نے بات ٹالنے کی غرض سے گوٹیں چلنی شروع کر دیں۔
"ہائیں ہائیں باجی یہ کیا کر رہی ہیں۔ یہ تو میری گوٹ ہے۔ نجمہ نے شور مچایا۔
مدد علی بہت زور سے ہنس دیئے۔
نجمہ آجکل ان کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ تم بلاوجہ کھیل میں الجھا رہی ہو۔" وہ مسلسل ہنس رہے تھے۔
"بھئی نجمہ۔ اب میں چلتی ہوں۔" سارہ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔
"چلئے میں چھوڑ آؤں۔" وہ آج شرارت پر تلے ہوئے تھے۔
"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔"
"کیوں آج کیا خاص بات ہو گئی۔ میں تو ہمیشہ ہی آپ کو چھوڑنے جاتا ہوں۔" انھوں نے ہنسی ضبط کر کے پوچھا۔
سارہ کچھ نہیں بولی چپ چاپ ان کے پیچھے چلنے لگی۔
"باجی۔ آج تو آپ نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔" نجمہ نے اسے ٹوکا۔
سارہ ماتھے پر ہاتھ مار کر ہنس دی۔
"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ آجکل یہ حواسوں میں نہیں ہیں۔ مدد علی جاتے جاتے رک کر بولے
"خدا حافظ نجمہ۔ سارہ نے بات ٹالنی چاہی۔
"خدا حافظ باجی!" نجمہ بھی مسکرا رہی تھی۔
"شجاع بہت اچھے انسان ہیں۔ مدد علی ہونٹ دبا کر بولے
سارہ نے سر جھکا لیا۔
مدد علی نے آج آئینہ والا قرض اتار دیا تھا۔
"مگر ذرا جذباتی انسان ہیں۔" مدد علی چپ بہت آہستہ چل رہے تھے۔ سارہ سر جھکائے رہی۔
"میں نے دیار غیر میں رہ کر انسانوں کو پڑھنا سیکھا ہے۔ میرے مشاہدات ذرا کم ہی غلط ثابت ہوتے ہیں۔ شجاع جیسے انسانوں کو نارمل رکھنے کی ضرورت ہو گی۔ جن لوگوں سے انکی جذباتی وابستگی ہو گی انکے متعلق کچھ سننا گوارا نہیں کریں گے۔
مدد علی آہستہ آہستہ اس کو سمجھا رہے تھے۔
سارہ حیران تھی کہ اتنے کم وقت میں مدد علی کے اندازے کتنے درست تھے۔ شجاع واقعی بے حد جذباتی انسان تھا۔ اسے سارہ کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں سے بھی بے تحاشا محبت تھی۔ ماں کا ذکر کرتے وقت اس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ اپنی منجھلی بہن فاریہ سے بھی والہانہ لگاؤ تھا۔
جبکہ سارہ پر پہلے ہی دن فاریہ نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا تھا۔
اس کی چمکیلی اور گہری آنکھیں سارہ کو اب تک یاد تھیں۔
"میری باتیں یاد رکھئے گا۔" مدد علی پھر بولے۔

"نجانے زندگی کی ان راہوں میں دوبارہ ہمارا آپ کا سامنا ہو یا نہ ہو۔ مگر میری نیک خواہشات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اس لئے نہیں کہ آپنے نجمہ کو پڑھا کر مجھ پر احسان کیا ہے بلکہ اس لئے کہ آپ ایک اچھی انسان ہیں۔ آپ کے خیالات بہت صاف ستھرے ہیں۔ آپ جتنی زبان کی صاف ہیں اتنی ہی دل کی بھی صاف ہیں۔ آپ کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہے مگر یہ دنیا اتنے صاف گو اور سچے لوگوں کو ذرا کم ہی برداشت کر پاتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے شروع کے دن تو بغیر آہٹ کے گزر جائیں گے مگر جب آپ عملی طور پر زندگی کا سفر شروع کریں گی تب آپ کو — پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑیں گے۔ سب لوگ ایک ہی مزاج کے نہیں ہوتے اور مختلف مزاج کے لوگوں کو ایک ساتھ خوش رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس کے لئے آپ کو بہت ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھیئے گا کہ شجاع کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ جب تک یہ آپ کے رہیں گے۔ دنیا میں آپ بہت آسانی سے سر اٹھا کر چل سکیں گی۔ بدر علی نے جیپ سارہ کے گھر کے سامنے روک کر کہا۔

"آپ کی باتیں واقعی بہترین راہبری کر سکتی ہیں۔" سارہ نے اتر کر کہا اور اندر چلی گئی۔

قاسم زور زور سے سبق یاد کر رہا تھا۔

اس نے برآمدے میں آکر قاسم کو نیا سبق دیا۔ ببلی نل پر منہ دھو رہی تھی۔

"ہیں ببلی یہ کون سا وقت ہے منہ دھونے کا؟" سارہ نے اوپر جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"جوجو۔ یہ شا ....." ببلی نے اسے سمجھانا چاہا کہ ہاتھ خراب ہو گئے تھے اس لئے منہ دھو رہی ہوں۔

" اچھا بس ہو گیا۔ آؤ اوپر چلو۔" سارہ کے کہنے پر ببلی منہ دھونا چھوڑ کر گھسٹتی گھسٹاتی اوپر آگئی۔

"یہ تو منہ پونچھو اس سے۔" سارہ نے تولیہ دے کر اسکے دوسرے کپڑے نکالے۔

" اور مار کر تمہیں تصویریں بنانے کو لاکر دیئے ہیں یا ہاتھ خراب کرنے کے لئے۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔" اس نے پیار سے ببلی کو سمجھایا۔

"اچھا ..." ببلی نے سر ہلا کر وعدہ کیا۔

ببلی کے کپڑے بدل کر اس نے نیچے جھانکا۔

اماں جان چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھیں۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں تمہاری چائے بھیجتی ہوں۔" سارہ نے ببلی سے کہا اور اس کے میلے کپڑے اٹھا کر نیچے آگئی۔

"اماں جان۔ چائے کی خوشبو اوپر تک آرہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ تو میں خود ہی نیچے آگئی۔"

اماں جان اس کی بات کو سن کر ہنس دیں۔

"کراچی والے واقعی چائے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ ان کی ناک میں ہر وقت چائے کی خوشبو ہی بھری رہتی ہے۔" وہ چائے کی پیالی اٹھا کر آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

اماں جان رات کے لئے کیا پکایا ہے؟" اس نے ہانڈی کھول کر جھانکا۔ تر تراتے ہوئے گھی کے پیچھے سے کوفتے سر اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

"اماں جان سالن زیادہ ہے؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں؟"

"میں سوچ رہی ہوں تھوڑا سا نجمہ کے لئے بھیج دوں۔ پچھلے ماہ جب آپ نے کوفتے بھجوائے تھے تو دونوں باپ بیٹی کو بے حد پسند آئے تھے۔"

سارہ نے اماں جان کے تاثرات پڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تو خود ہی بھیجنے والی تھی۔ اماں جان نے فوراً سالن ڈونگے میں نکال کر اوپر سے بھنا ہوا گرم مصالحہ چھڑک کے نجمہ کے گھر بھجوا دیا۔

اس رات بھی سارہ کو نیند نہ آئی۔

رہ رہ کے مدد علی کے مشاہدات یاد آ رہے تھے۔
کتنا سچ کہا تھا انھوں نے۔
'واقعی شجاع بے حد جذباتی انسان تھا
اسے یاد آیا پچھلے ماہ ہی تو ساحل سمندر پر ٹہل ٹہل کر اس نے سارہ سے بے شمار قسمیں لی تھیں
زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں۔
امی کا خیال رکھنے کی قسم۔
بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی قسم۔
خصوصاً فاریہ کا خیال رکھنے کی قسم۔
شجاع کا کہنا تھا فاریہ اس کی ساری بہنوں سے مختلف ہے۔ اسے شجاع سے والہانہ محبت ہے۔ اور یہی محبت ہو سکتا ہے سارہ سے اس کی چپقلش کا باعث بنے۔ کیونکہ جب انسان کسی کو بے تحاشہ چاہتا ہے تو اس کے پیار میں دوسرا ہٹ برداشت نہیں کر سکتا۔
اور سارہ حیران تھی کہ ابھی شجاع کی باتوں کا کیا جواب دے۔
ابھی جس گھر میں وہ پہنچی نہیں ہے وہاں کے مکینوں کے بارے میں کیا رائے دے سکتی ہے۔
پھر۔
اس رات سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے شجاع کو پھر وہی دورہ پڑا تھا۔
اس نے سارہ سے پھر وعدے لینے شروع کر دیئے تھے۔
اس کے غصہ کو نظر انداز کرنے کے۔
اس کی کوتاہیوں کو درگزر کرنے کے۔
اس رات سارہ کو بے حد سکون ملا تھا۔
احساسِ ذات اس کے نزدیک سب سے اہم خوبی تھی
بلا سے شجاع غصہ ور تھا مگر اسے اس بات کا احساس تو تھا۔
انسان ہونے کے ناطے سے اس میں خامیاں تھیں تو ان کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ ہٹ دھرم لوگوں کی طرح اپنے انسان کامل یا برائیوں سے مبرا تو ظاہر نہیں کیا تھا۔
یہی سب سے بڑی خوبی تھی۔
ایسے انسانوں میں اصلاح کی بے تحاشہ گنجائش ہوتی ہے۔



ناول "پھانس" جاری ہے



قسط نویں

ملائکہ مُعین

"کیوں۔ تمہیں جانے میں کیوں اعتراض ہے؟"

رضوان خاموش ہوگیا۔ اس کا دل چاہا جیب میں پڑے ہوئے امجد حسین کے خط کو انکے سامنے کردے۔ لیکن پھر اتنی جلدی کسی کی آرزوؤں کے محل کو مسمار کردینے کی ہمت نہ پڑی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

بیرسٹر شوکت نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔"

وہ زبردستی ہنس دیا۔

"کل فرحت آپا سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ انہیں بھی میری رائے سے اتفاق ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ اگر یہ کام جلدی نہ ہوا تو ممکن ہے۔ دوسرے لوگ کامیاب ہوجائیں۔"

"تو کسی کو تو کامیاب ہوجانے دیجئے۔"

بیرسٹر شوکت جملے کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے ڈانٹ دیا۔

"بیوقوف مت بنو۔ کیا اپنی والدہ کی وصیت بھول گئے۔"

"مجھے تو یاد ہے۔ وہ کہنا چاہ رہا تھا۔ بس اب یاد رکھ کر بھی کیا کروں جبکہ وہ بھول چکی ہے۔"

"اگلے مہینہ کی دو تین تاریخ کو خاموشی سے روانہ ہوجانا۔"

"بہت بہتر۔" وہ کھڑا ہوگیا۔

یہ دوسری رات تھی جبکہ وہ چاند کی تصویر کو ذہن میں بسائے ساری رات جاگتا رہا۔

"اُف۔ میں اس لڑکی کی وجہ سے پاگل ہوجاؤں گا۔"

اس نے غصہ میں آکر چاند کی وہ تصویر جو کبھی اس کے کمرے سے پار کی گئی تھی۔ اٹھا کر فرش پر پٹک دی۔

شیشے چور چور ہوکر چاروں طرف بکھر گئے۔ ایک تصویر۔ سینکڑوں ٹکڑے۔ وہ دھیرے سے اٹھا۔ اور خالی تصویر کو لپٹا کر میز پر ڈال دیا۔

"تو احمد نگر اسی لیے جایا گیا تھا۔"

وہ کوشش کے باوجود ان خیالات کے آگے پسپا ہوتا گیا۔ اور ایکدم واقعات یکے بعد دیگرے یاد آتے چلے گئے۔ شاہد کا بار بار ایک عجیب انداز سے چاند کا نام لینا۔ امجد حسین کا وہ جملہ۔ "مجھے پسند آگئی ہیں" اور چاند سے اس کی خود ملاقات — امجد حسین کے یہاں واپسی پر دوسرے دن جب وہ صبح ہی صبح اس سے ملنے گیا تھا۔

"احمد نگر کی آب و ہوا بڑی بہترین معلوم ہوتی ہے۔"

اس نے بیٹھتے ہی جملہ کسا تھا۔

"چھٹیوں میں گھر تشریف لارہی ہیں نا؟"

"مجھے ضروری کام سے پرنسپل نے روک لیا ہے۔"

"سفید چہرے پر سیاہ جھوٹ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

چاند ہنس دی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔

پھر اس کے بعد بڑی دیر تک وہ صرف یہی سوچتا رہا تھا کیا یہی لڑکی اتنی صفائی سے انکار کا خط بھی لکھ سکتی ہے۔ کیا اتنی بے باک ہوسکتی ہے۔ یقین نہیں آتا — اس کی نظریں بڑی بیباکی سے چاند کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ جا لو اس خط کے الفاظ اس کے چہرے پر لکھے ہوئے دیکھ کر تصدیق کرنا چاہتا ہو۔ مگر وہاں سفید سفید بادلوں میں چمکتے ہوئے سرخ ڈوروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

"پھر آپ یہ چھٹیاں کہاں گذاریں گی؟"

"کچھ دن رفعت کے پاس۔ باقی دن ہوسٹل میں گذاروں گی۔"

اور — رضوان کو ایکدم یاد آیا۔ رفعت کے نام پر اس نے کتنی معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"بڑی اچھی دوست ہیں آپکی۔"

"آپ کو پسند ہے؟" آواز میں ارتعاش تھا۔

رضوان کو ہنسی آگئی۔

"بڑا اچھا گھرانہ ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کو تو پسند کرتے ہیں، خاص کر امجد حسین اور شاہد۔"

"جی ہاں۔"

اور پھر چلتے وقت اس نے جان بوجھ کر کہا تھا۔

"ممی کی وصیت یاد رکھے گا۔"

مگر رضوان کو امجد حسین کے الفاظ یاد آگئے۔

"میرا اور رفعت کا اندازہ ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"اچھا ہے، میری بلا سے۔"

حالانکہ آنکھوں کی گمبھیرتا کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔ پھر بھی اس نے بڑی بے نیازی سے سر کو جھٹکا۔ جیسے ان فضول خیالات کو ذہن سے نکال دینا چاہتا تھا۔

"تو آپ تار دیکر بلوالیں"
کیوں۔ تمہیں جانے میں کیوں اعتراض ہے؟"
رضوان خاموش ہوگیا۔ اس کا دل چاہا جیب میں پڑے ہوئے امجد کے خط کو ان کے سامنے کردے، لیکن پھر اتنی جلدی کسی کی آرزوؤں کے محل کو مسمار کردینے کی ہمت نہ پڑی۔
"کیا سوچ رہے ہو؟"
بیرسٹر شوکت نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"کچھ نہیں۔"
وہ زبردستی ہنس دیا۔
"کل فرحت آپا سے میری گفت گو ہوئی تھی۔ انھیں بھی میری رائے سے اتفاق ہے... وہ کہہ رہی تھیں اگر یہ کام جلدی نہ ہوا تو ممکن ہے دوسرے لوگ کامیاب ہوجائیں۔"
"تو کسی کو تو کامیاب ہوجانے دیجئے۔"
بیرسٹر شوکت جملے کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکے۔ انھوں نے ڈانٹ دیا۔
"بیوقوف مت بنو۔ کیا اپنی والدہ کی وصیت بھول گئے؟"
"مجھے تو یاد ہے۔"..... وہ کہنا چاہ رہا تھا۔۔ بس اب یاد رکھ کر بھی کیا کروں جبکہ وہ بھول چکی ہے۔
"اگلے مہینے کی دو تین تاریخ کو خاموشی سے روانہ ہوجانا۔"
"بہت بہتر" وہ کھڑا ہوگیا۔
یہ دوسری رات تھی جبکہ وہ چاند کی تصویر کو ذہن میں بسائے ساری رات جاگتا رہا۔
"اف میں اس لڑکی کی وجہ سے پاگل ہوجاؤں گا۔"
اس نے غصے میں آکر چاند کی وہ تصویر جو کبھی اس کے کمرے سے پار کی گئی تھی، اٹھا کر فرش پر پٹک دی۔
شیشے چور چور ہوکر چاروں طرف بکھر گئے۔ ایک تصویر۔۔ سینکڑوں ٹکڑے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور خالی تصویر اٹھا کر میز پر ڈال دی۔
"تو احمد نگر اسی لئے جایا گیا تھا۔"
وہ کوشش کے باوجود ان خیالات کے آگے پسپا ہوتا چلا گیا اور واقعات ایکدم یکے بعد دیگرے یاد آتے چلے گئے۔ شاہد کا بار بار ایک عجیب انداز سے چاند کا نام لینا۔ امجد حسین کا وہ جملہ۔ "مجھے چاند پسند آگئی ہیں۔" اور چاند سے اس کی خود ملاقات۔ امجد حسین کے یہاں سے واپسی پر۔ دوسرے دن جب وہ صبح ہی صبح اس سے ملنے گیا تھا۔
"احمد نگر کی آب و ہوا بڑی بہترین معلوم ہوتی ہے۔"
اس نے بیٹھتے ہی جملہ کسا تھا۔
"چھٹیوں میں گھر تشریف لارہی ہیں نا؟"
"مجھے ضروری کام سے پرنسپل نے روک لیا ہے۔"
"سفید چہرے پہ سیاہ جھوٹ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
چاند ہنس دی تھی۔
"سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔
پھر اس کے بعد بڑی دیر تک وہ صرف یہی سوچتا رہا تھا۔
کیا یہی لڑکی اتنی صفائی سے انکار کا خط بھی لکھ سکتی ہے۔ کیا اتنی بے باک ہوسکتی ہے؟ یقین نہیں آتا۔ اس کی نظریں بڑی بیبا کی سے چاند کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ جانو اس خط کے لکھے ہوئے الفاظ اس کے چہرے پہ لکھے ہوئے دیکھکر تصدیق کرنا چاہتا ہو۔ مگر وہاں سفید سفید بادلوں میں چمکتے ہوئے سرخ ڈوروں کے سوا کچھ نہ تھا۔
"پھر آپ یہ چھٹیاں کہاں گزاریں گی؟"
"کچھ دن رفعت کے پاس۔ باقی دن ہوسٹل میں گزارونگی۔"
اور رضوان کو ایکدم یاد آیا۔۔ رفعت کے نام پر اس نے کتنی معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"بڑی اچھی دوست ہیں آپ کی۔"
"آپ کو پسند ہے؟" آواز میں ارتعاش تھا۔
رضوان کو ہنسی آگئی۔
"بڑا اچھا گھرانہ ہے۔"
"جی ہاں۔"
"آپ کو تو سب پسند کرتے ہیں۔ خاص کر امجد حسین اور شاہد۔"
"جی ہاں۔"
اور پھر چلتے وقت اس نے جان بوجھ کر کہا تھا۔
"ممی کی وصیت یاد رکھیئے گا۔"
مگر رضوان کو امجد حسین کے الفاظ یاد آگئے۔
"میرا اور رفعت کا اندازہ ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"
"اچھا ہے۔ میری بلا سے۔"
حالانکہ آنکھوں کی گھبراہٹ کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔۔ پھر بھی اس

نے بڑی بے نیازی سے سر کو جھٹکا ـــ جیسے ان فضول خیالات کو ذہن سے نکال دینا چاہتا ہو۔

آنکھیں جل رہی تھیں ـ گھڑی کی سوئی نہ معلوم کب کا اپنا آدھا چکر پورا کر چکی تھی ـ مگر نیند اب بھی کوسوں دور تھی۔

"سب حماقت ہے۔"

وہ اپنے آپ کو دھوکا دیکر سو جانا چاہتا تھا۔ لیکن تکیہ پر سر رکھ دینے کے بعد بھی وہ نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔

اور صبح ہو گئی۔

اگلے مہینے سے پہلے ہی امجد حسین کا جواب بھی آگیا۔ انھوں نے چاند کی مرضی معلوم کر لی تھی۔ وہ خوشی سے راضی تھی۔ اور اب وہ جلد سے جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے۔

انہوں نے لکھا تھا ـــ "آپ اپنے ابّو تک میرا پیغام پہنچا دیں۔

"ابّو ـــ" رضوان کو بیساختہ ہنسی آگئی۔

"کل ہی کی بات ہے۔ انھوں نے اپنی ہونے والی بہو کے لئے بڑے چاؤ سے جڑاؤ سیٹ خریدا ہے ـــ اور آج ـــ اس نے خط موڑ توڑ کر جیب میں رکھ لیا۔

ایک ـــ دو ـــ تین ـــ اور پھر پورا ایک ہفتہ اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کر بڑے خلوص دل سے پختہ ارادہ کرتا کہ آج ضرور ابّو کے سامنے یہ خط پیش کر کے ان کی اجازت لے لوں گا۔ مگر ہر دن اسی طرح گزر جاتا۔ اور اس کے سارے ارادے ریت کے گھروندے کی طرح پھسلتے چلے جاتے۔ اور وہ ان کے نزدیک کھڑا بڑی بے بسی اور بیچارگی سے چپ چاپ ان کو تکتا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ پھر ریت کے گھروندوں میں مدغم ہو جاتے۔ اور وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آکر مسہری پر گر جاتا۔

"برسی میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے۔ ہیں رضوان!"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ بالکل انجان بن گیا۔

"اس وقت تک تمہیں چلا جانا چاہیے تھا۔ واپس کب آؤ گے؟"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ ہاتھ پتلون کی جیب میں پہنچکر پھر رک گئے۔

"کل صبح کی گاڑی سے چلے جاؤ۔"

"لیکن ـــ" خط جیب کے باہر آگیا۔

"کیا بات ہے؟ میں نے تم سے کہدیا جانا تم کو ہی ہے۔"

"مگر یہ۔"

اس نے مڑا تڑا خط ان کے سامنے ڈال دیا۔

"کیا ہے یہ؟"

انھوں نے خط اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ختم کرنے کے بعد ان کے منھ سے ایک لمبی سی "ہوں" نکلی اور چہرے پر حزن کی کسی اداس دوپہر کا عکس جھلملانے لگا۔ وہ دھیرے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کون صاحب ہیں یہ؟" اسکے باوجود ان کی آواز میں کوئی لرزش نہیں تھی۔

"احمد نگر کے مجسٹریٹ ہیں۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"ان کے لڑکے شاہد سے میری دوستی ہے۔"

"لیکن چاند۔"

"شاہد کی بہن رفعت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

"ہوں۔"

"تمہاری کیا رائے ہے؟"

"آپ اجازت دے دیں۔"

اس نے اس قدر تیزی سے جواب دیا جیسے ڈر ہو۔ اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو خیالات کے الجھاؤ بیچ ہی میں پھانس لیں گے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"ان کی آواز تیز ہو گئی۔

"لیکن اس کی مرضی کا خیال تو ہمیں رکھنا ہی پڑے گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ رضامند ہو گی؟"

"اتنا معزز آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"تمہاری ممی کی وصیت کا کیا ہو گا؟" ان کی آواز میں بڑی بے چارگی تھی۔

"مجبوری ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ زندوں کو نہیں مارا جا سکتا۔"

بیرسٹر شوکت سوچ میں پڑ گئے۔ خط ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور ذہن اس زبردست گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا۔

"اچھا" کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں سوچوں گا۔ فی الحال جانا ملتوی کر دو ـــ اور سنو۔ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہو سکے۔"

"بہت بہتر۔" رضوان کھڑا ہو گیا۔

بیرسٹر شوکت نے بڑے غور سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً دلی جذبات کا اندازہ چہرے کی رنگت سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بیٹا باپ سے زیادہ چالاک نکلا۔ اس نے جذبات سے بالکل عاری چہرہ باپ کے سامنے کر دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"سمندر کی گہرائی معلوم نہیں کی جا سکتی ابو۔"

"شب بخیر ابو!"

لہجے میں وہی شگفتہ پن تھا۔

"شب بخیر بیٹے۔"

بیرسٹر شوکت اپنی کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

بیوی کی موت پر بھی ضبط کر جانے والے انسان کی آنکھوں کے سامنے آج زندگی میں پہلی بار دھندلکا سا چھا گیا۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

"خدا تمہیں اس کا اجر دے گا میرے بچے۔ کسی کی خوشیوں کی خاطر اپنے ارمانوں کی قربانی دینا تم جیسے بڑے دل والوں کا ہی کام ہے۔ شمو — ہم دونوں کو معاف کر دینا۔"

برسی کے بعد عائشہ بیگم نے جب سارے خاندان کی موجودگی میں رضوان کے مستقبل کا سوال اٹھایا تو پہلی بار بیرسٹر شوکت خاموش ہو گئے انھوں نے تمام باتیں بڑے صبر و تحمل سے سنیں اور پھر دھیرے سے بولے۔

"آپ کی مرضی ہے آپا۔ جہاں دل چاہے رضوان کا رشتہ کر دیجیے۔"

عائشہ بیگم چونک پڑیں۔ کچھ دیر تک انہیں اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آیا۔

فرحت بیگم اور عمرانہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں لیکن عمرانہ اپنی حالت پر قابو پا کر حیرت سے بولی۔

"پھر چاند کو بلا لیا جائے ابو؟"

بیرسٹر شوکت ہنس دیے۔ طنز و یاس میں بھی ہوئی گہری ہنسی

"ہاں۔ لیکن انسان کو بعض اوقات مجبوراً اپنی اور دوسروں کی خواہشات کے خلاف بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔"

"لیکن آخر مجبوری کیا ہے؟"

"اے مجبوری نہیں تو اور کیا ہے!"

عائشہ بیگم بول اٹھیں۔

"وہ لاکھ دولت مند سہی لیکن اپنے خاندان سے تو نہیں ہے۔ پھر بھلا غیر خاندان کی لڑکی کو وہ کیسے شامل کر لیتا؟"

"لیکن یہ باتیں تو پہلے سے ہی سوچ لینا تھیں۔ بالفرض اگر اس دن اس کی حالت نہ بگڑتی تو... آج وہ اسی خاندان میں شامل ہو چکی ہوتی نا۔"

"کیسے ہوتی؟ آخر خدا کو ہمارے خاندان کی بڑائی جو منظور تھی۔ ورنہ اس کی حالت ہی کیوں بگڑتی۔"

"خیر۔ میں ان باتوں کا قائل نہیں۔"

بیرسٹر شوکت نے حالات کو پس پردہ رکھنے کے بجائے افشا کر دینے میں ہی بہتری سمجھی۔ بولے

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ہیں۔ انہیں اس رشتے کا علم نہ تھا۔ بے خبری میں انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے چاند کو مانگ لیا اور میں انکار نہ کر سکا۔ بہرحال میں نے ان سے کہہ دیا ہے جب رضوان کا رشتہ ہو جائے گا اس کے ساتھ رخصتی کر دیں گے۔"

"تو یہ بات ہے۔ پہلے ہی بتا دیا ہوتا تم نے کہ دوستی کی خاطر بچوں کے ارمانوں کی قربانی دی جا رہی ہے۔ بیوی کی وصیت کو بھاڑ میں جھونکا جا رہا ہے۔"

فرحت بیگم کو سخت غصہ آ گیا تھا۔

بیرسٹر شوکت ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ دنیا انھیں برا کہہ رہی تھی۔ حالانکہ وہ خود کتنے دکھی تھے۔

ایسی قربانیاں بڑی عظیم ہوتی ہیں آپا۔"

"ہوتی ہوں گی۔ میری بلا سے۔ لیکن تم نے رضوان سے بھی پوچھا۔"

"جی ہاں۔ میرا بیٹا — وہ بڑا عظیم ہے۔ اس نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔"

فرحت بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ شمسہ کے لئے بیگم شوکت کے انکار کو سن کر انھیں اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا آج ہوا تھا۔

بیرسٹر شوکت چلے گئے۔

عائشہ بیگم نے جلدی سے پاندان بند کیا اور اٹھتے ہوئے بولیں "تم بھی تیار ہو جاؤ فرحت۔ چار بجے تک چلیں گے۔"

"مجھے تو گھر جانا ہے۔ ریحان کی طبیعت خراب ہے۔"

"تو شام تک چلی جانا۔ ریحان ماشاء اللہ سمجھدار ہے۔ بچہ تو نہیں ہے۔"

"میرے بجائے عمرانہ یا رشیدہ باجی کو لے جائیے۔"

"وہ دونوں تو جائیں گی ہی۔"

انھوں نے بڑے وثوق سے کہا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

عمرانہ نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے غصے سے کہا۔

"کیوں؟ تمہارے اوپر کیا آفت آ گئی ہے۔"

عائشہ بیگم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

"مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اس لئے جاؤں گی بھی نہیں۔

اس نے بغیر کسی لحاظ کے صفائی سے کہہ دیا۔

"پھر کیا ساری عمر بھائی کو کنوارا ہی رکھوگی؟" اس کا کیا ہے۔ مزے سے بیاہ رچا کر اپنے گھر چلی جائے گی۔"

"کون بیاہ رچا کر چلا جائے گا؟"

فرحت بیگم نے عمرانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے دھیمے لہجے میں سارے واقعات بتا دیئے۔

"ہوں۔ تو ابو نے وہی کیا نا جو اس خاندان کا دستور تھا۔ عمرانہ کا غصہ اور تیز ہو گیا تھا۔

"پگلی۔ انھوں نے یہ خاندان کی خاطر نہیں، دوستی کی خاطر کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔"

اور لاکھ ضبط کے باوجود وہ پھوٹ پڑی۔ فرحت بیگم کی آنکھوں کے دھندلکے بھی گہرے ہوتے چلے گئے۔ اور آخر کار وہ اٹھکر باہر چلی گئیں۔

"آپ کو سب معلوم ہو گیا نا۔"

"کئی دن بعد عمرانہ نے بڑے دکھے لہجے میں رضوان سے پوچھا۔

"کیا سب کچھ؟"

رضوان نے کوٹ اتار کر ٹانگتے ہوئے پوچھا

"بنتے کیوں ہو۔ ابو تے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

رنج اپنی آخری حدوں میں پہنچکر غصہ اور جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ وہ۔ انھوں نے کہا تھا۔ وہ سب میری شادی عذرا سے کرنا چاہتے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"کہہ دیا جو کہنا تھا۔"

اور عمرانہ اس کی شکل دیکھکر خاموش ہو گئی۔ اب اس کے لئے رہا ہی کیا تھا۔

"کیوں؟ کیا تمھیں عذرا پسند نہیں؟"

وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

"بہت اچھی ہیں۔"

رضوان ہنس پڑا۔

"یہ بتاؤ طنز یہ یا دل سے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"میں چاند کو بلوانا چاہتی ہوں۔"

"تو بلوالو۔"

"ابو کا خیال ہے آپ کی شادی کے فوراً بعد اسے بھی رخصت کر دیا جائے۔ اس لئے اب تو اسے یہیں آجانا چاہیئے۔"

"لیکن ابو سے کہہ دو۔ مجھ سے پہلے اس کی شادی ہو جانا چاہیئے۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ دوسری سمت کر لیا تھا۔ اس لئے عمرانہ دکھ کے تاریک تاریک بادلوں کو ان آنکھوں میں امنڈتا ہوا نہ دیکھ سکی۔

"آپ خود کہہ دیں نا۔"

"موڈ بڑا خراب معلوم ہو رہا ہے۔"

"اس کا اپنا موڈ فوراً سطح پر آگیا تھا۔

"تم نے پٹائی تو نہیں کر دی کہیں؟"

"اچھا بس چپ رہیئے۔

وہ جل کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ جیسے آدمی کی شادی تو عذرا کے بجائے زرینہ سے ہوتی تو اچھا تھا۔"

وہ چلی گئی۔

اور رضوان بجھی بجھی ہنسی ہونٹوں پر سہارے اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

اسی ہفتے بیرسٹر شوکت کو امجد حسین کا دوسرا خط ملا جس میں انھوں نے سماج کے قانون کے خلاف اپنی آزادانہ روش کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی اپنی لڑکی کے لئے رضوان کا رشتہ طلب کر لیا۔

سماج تڑپ اٹھا۔ قانون بل کھا گیا اور زمانہ کانپ اٹھا۔

جب ایک لڑکی کے باپ نے اپنے ہاتھوں میں قلم اٹھا کر یہ الفاظ لکھے

"آپ کا بیٹا رضوان ہم لوگوں کو بہت پسند ہے۔ میری لڑکی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بھائی کے ساتھ ہی بہن کی شادی کر دی جائے۔"

بیرسٹر شوکت مسکرا دیئے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑا گہرا طنز تھا۔ اور ذہن —— بہت دور احمد نگر کے ہوسٹل میں بیٹھی ہوئی چاند کے ارد گرد بھٹک رہا تھا۔

اتنے آزاد لوگوں میں چاند جیسی لڑکی کیسے نبھے گی۔ بہرحال اسے یہ گھرانہ خود ہی پسند ہے۔

انہوں نے کسی کی رائے طلب کئے بغیر یہاں تک کہ رضوان تک سے مشورہ کئے بغیر جواب روانہ کر دیا۔

رضوان کا رشتہ اس کی پھوپھی کی لڑکی سے طے ہو چکا ہے۔

"اس لئے مجبور ہوں۔"

شوکت

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے چاند رفعت کے اصرار پر اس کے یہاں آٹھ دس روز کے لئے آ گئی تھی۔

اس درمیان میں اس نے کتنی ہی بار گھر جانے کا ارادہ کیا۔ سامان تک درست کر لیا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر۔ ارادے توڑ دیئے جاتے۔ بندھا بندھایا سامان کھل جاتا۔

دراصل اس کا خیال تھا، رضوان یا عمرانہ کوئی تو اسے بلانے کے لئے اصرار کرے گا۔ مگر رضوان نے بھول کر بھی خط نہیں لکھا اور چھٹیوں سے پہلے عمرانہ کا صرف ایک خط آیا تھا۔ جس میں سرسری طور پر اس نے لکھا تھا۔

"خط لکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ چھٹیوں میں آؤ گی تو بہت سی باتیں کریں گے۔"

عمرانہ

اس کے بعد سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ یوں بھی وہ خود ہی خالہ عائشہ کی وجہ سے زیادہ دور رہنا چاہتی تھی۔ دوسرے پرنسپل نے چھٹیوں میں بھی اتنی ذمہ داریاں اس کے سر تھوپ دیں کہ وہ ہل بھی نہیں سکتی تھی۔

اب رفعت زبردستی اسے اپنے ہاں لے آئی تھی۔ خود چاند بھی ان ڈھیر سارے کاموں سے گھبرا کر کچھ دن سکون اور اطمینان سے گزارنا چاہتی تھی۔ ورنہ پھر تو وہی کالج کی مشینی زندگی تھی۔ اور وہ بھی پڑھنے سنے پڑھانا کتنا مشکل ہے اسے اب معلوم ہو رہا تھا۔ ورنہ پڑھائی کے زمانے میں وہ انہی لیکچررز کو دیکھ کر کہا کرتی تھی۔ کیسے مزے کرتے ہیں یہ لوگ۔ تھوڑا سا آ کے پڑھا دیا اور بس۔ نہ ڈھیر سارا کام کرنا اور نہ امتحانوں کی مصیبت بھگتنا۔ مگر اب سر پہ پڑی تو معلوم ہوا طالبعلم بننا آسان ہے مگر علم دینا کتنا مشکل ہے۔

"بیٹا اب یہاں چھٹیاں خوب مزے سے گزارنا۔ میں نے شاہد کو بھی بلوا لیا ہے۔ تم تینوں خوب ہی سیر کرنا۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

"اور کیا۔ یہ پرنسپل بھی خوب ہیں۔ چھٹیوں میں بھی نہیں چھوڑتیں۔" رفعت بولی۔

"وہ بیچاری بھی کیا کریں۔ آخر کالج کا انچارج کسی نہ کسی کو تو بنانا ہی تھا۔"

"خیر۔ اب دیکھنا شاہد کتنی تفریحات کراتا ہے کہ تم دونوں بھی گھبرا اٹھو گی۔"

"کل آ جائیں گے نا بھیا؟" رفعت نے پوچھا۔

"ہاں۔ کل صبح ہی صبح۔"

"پھر شام کو ہم لوگ اپنے گاؤں جائیں گے ڈیڈی دو تین دن کے لئے۔"

"ہاں۔ ہاں چلی جانا۔ چاند بھی دیکھ لے گی۔ تم لوگ ندی کے قریب والی کوٹھی میں ٹھہرنا۔ تو زیادہ مزا آئے گا۔"

"اور کیا۔ آج کل چاندنی رات بھی ہے۔ خوب بوٹنگ کریں گے۔" رفعت تصور ہی میں لطف لے رہی تھی۔

"کیوں بیٹی چاند تمہیں کیسی لگتی ہے گاؤں کی زندگی؟"

"میں آج تک کسی گاؤں میں نہیں گئی۔"

"ارے! آج تک تم نے گاؤں نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تو ہے رہی نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے شہر کے رہنے والے گاؤں میں چند روز سے زیادہ نہیں گزار سکتے۔"

"کیوں؟" رفعت نے پوچھا

"اس لئے کہ شہر کی آرام دہ زندگی کے عادی ہو کر اس زندگی کو اپنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہو گا۔"

"یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" امجد حسین بولے۔

"اب یہی دیکھو۔ حالانکہ ہمارا گاؤں دوسرے گاؤں کے مقابلے میں بہت حسین اور صاف ستھرا ہے۔ ہماری اپنی بڑی بڑی کوٹھیاں موجود ہیں۔ مگر اس کے باوجود پندرہ بیس روز سے زیادہ نہیں رہ سکتے۔"

"بس ہم لوگ مہینے میں دو ایک دن کے لئے پکنک کے طور پر چلے جاتے ہیں۔"

"ہماری رفعت کو تو وہ ندی والی کوٹھی بہت پسند ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اس کو شادی میں وہی جہیز میں دے دوں۔ کیوں رفو۔ ٹھیک ہے نا؟"

"وہ آپ نے پہلے ہی میرے لئے بنوائی تھی۔"

امجد حسین زور سے ہنس پڑے۔

"دیکھا۔ کیسی چالاک ہے۔ اور اگر تمہاری بھابھی کو وہ پسند آ گئی تو۔۔؟"

"تو ہم دونوں آدھی آدھی کوٹھی بانٹ لیں گے۔"

"لیکن تم احمد نگر سے باہر چلی گئیں تو۔۔؟"

اور "باہر" کے لفظ پر چاند کو اپنے اندر کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑے غور سے باری باری رفعت اور امجد حسین کو دیکھا

"کیوں بیٹی چاند۔ ٹھیک ہے نا؟"

امجد حسین نے خود اس سے پوچھ لیا۔

"فرض کرو تمہارے شہر کا کوئی لڑکا یا تمہارا ہی بھائی ہماری رفعت

کو لیکر چلا جائے تو ان کی ندی والی کوٹھی بھلا کیسے منتقل ہوگی،،

چاند کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ رفعت شرما گئی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے چاند کی طرف دیکھا۔ پھر دھیرے سے بولی۔

"تو میں اپنی طرف سے وہ کوٹھی چاند کو دے دوں گی۔"

لیکن چاند کچھ بھی نہ سن سکی۔ اس کے کانوں میں تو امجد حسین کا بلند و بے باک قہقہہ گونج رہا تھا۔

دوسری صبح شاہد بھی آگیا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"تو رفعت نے آخر آپ کو بلا ہی لیا۔

اس نے آتے ہی چاند سے کہا۔

"میں خود ہی آگئی۔ چھٹیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔

"جھوٹ نہ بولو۔ خود سے آگئیں۔ میں نہ بلاتی تو ضرور آتیں تم۔"

"خیر۔ اب آپ لوگوں کا پروگرام کیا ہے؟"

"آج شام اپنے گاؤں چل رہے ہیں دو تین دن کے لئے۔"

رفعت نے جلدی سے کہا۔

"اچھا۔ یہ تو بڑی فرسٹ کلاس خبر ہے۔"

"وہاں ندی والی کوٹھی میں رہیں گے۔ رات میں خوب بوٹنگ کریں گے۔"

"بوٹنگ کون کرے گا آپ؟"

"میں کیوں؟ آپ کریں گے۔ ہم دونوں بیٹھیں گے۔"

"نا صاحب۔ میں فالتو نہیں ہوں۔"

"بڑے آئے۔ اب لگے اترانے۔"

چاند خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں آپ دونوں کو بوٹنگ سکھا دوں گا۔"

شاہد نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے۔ آئندہ کام آئے گا۔ کیوں چاند؟"

اور دونوں ہنس پڑے۔ چاند کچھ نہ سمجھتے ہوئے صرف ہلکے سے مسکرادی۔

اور اسی شام وہ تینوں گاؤں روانہ ہوگئے۔ دو نوکر۔ ڈھیر سارا سامان ساتھ تھا۔

چراغ جلنے کے بعد ان کی کار گاؤں میں داخل ہوئی اور آن کی آن میں لاتعداد مرد، عورتیں اور بچے گاڑی کے پیچھے لگ گئے۔ سب کے سب اپنے آقا کے بچوں کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ ان سلام کرنے والوں میں بوڑھے بھی تھے۔ جوان بھی اور بچے بھی۔ عورتیں دعائیں دے رہی تھیں۔ اور ننھے بچے ان تینوں سے بے نیاز دور کھڑے کار کو تک رہے تھے۔ ان کے چمکتے ہوئے چہروں سے اس چمکدار اور خوبصورت چیز کو چھو لینے کی زبردست خواہش کا اظہار ہو رہا تھا۔ مگر اسکے ساتھ ہی ساتھ مالک کا احترام بھی مانع تھا۔ چاند اس کے پیچھے خاموش کھڑی ایک تماشے کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

کسی نے کہا۔

"چھوٹے سرکار بھولے آئے اور ہم کو خبر تک نہ ہوئی۔"

رفعت زور سے ہنس پڑی۔

شاہد نے مڑ کر چاند کی طرف دیکھا۔ اور چاند کو ایسا لگا جا تو اونچے اونچے پہاڑوں سے نیچے پھینک دی گئی ہو۔

ارے خیرا بھائی۔ بھوجی جب آئیں گی تو پہلے تم لوگوں کو خبر کی جائے گی۔ یہ تو ابھی ہمارا گاؤں دیکھنے آئی ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا۔" غریب کا چہرہ اتنی سی تسلی پر تمتما اٹھا۔

چاند کی طبیعت بجھ سی گئی تھی۔ ندی والی کوٹھی میں پہنچ کر اس کے چہرے سے کسی خاص خوشی یا مسرت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

کمرے کھلوا کر سامان رکھوا دیا گیا۔ مزدوروں کو انعام دیا گیا بچوں میں پیسے تقسیم کئے گئے اور پھر وہ چاند کو لئے۔ ساری کوٹھی میں پھرتے رہے۔ بیشمار کمرے۔ بڑے بڑے ہال۔ طویل طویل برآمدے اور ان گنت رنگ برنگے پھولوں سے سجا یا ہوا باغ۔ پونم کے چاند کی چاندنی میں نہایا ہوا ایسا لگ رہا تھا جا تو کسی دیوی کا متبرک استھان ہو۔ پاؤں تلے بچھے ہوئے سبزے نے اپنی نس نس میں چاندنی کو سمو لیا تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت چاندی کے محلوں کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ اور ندی کے پانی میں تیرتے ہوئے بجرے سے چاند کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چاند نے خود کو بھی اس پانی میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔

"مس چاند! دیکھا آپ نے اپنا حسن؟"

شاہد نے اس کے قریب آکر بڑے عجیب انداز میں کہا۔

"ہائے۔ سچ۔ کتنا پیارا لگ رہا ہے چاند!!"

رفعت مارے خوشی کے چلا پڑی۔

"مگر یہ تو ڈوب چکا ہے رفعت۔"

چاند نے رفعت کے قریب آکر دھیرے سے کہا

"اچھا۔ پھر بوٹنگ کی جائے نا۔ کیا ارادہ ہے؟"

شاہد نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"نہیں بھیا۔ اتنا اچھا چاند ٹوٹ جائے گا۔"

شاہد ہنس پڑا۔ "تم تو سچ مچ شاعر بنتی جا رہی ہو۔"

"کیوں مس چاند۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ چاند کو توڑا جائے یا ایسے ہی رہنے دیا جائے"

"نہیں۔ چلئے بوٹنگ کریں۔"

اس نے اس طرح کہا جیسے وہ چاہتی ہی تھی چاند ٹوٹ جائے۔

شاہد نے کشتی پانی میں اتار دی۔ پہلے رفعت کو سہارا دیکر اندر کیا۔ پھر چاند کی باری پر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ بڑھا ہی رہا اور چاند خود ہی اندر آ گئی۔ تینوں خاموش تھے۔ رفعت ماحول سے متاثر ہو کر دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی۔ چاند ایک طرف کو جھکی ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کو چلوؤں میں بھر رہی تھی اور شاہد دھیرے دھیرے چپو چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں چاند پر تھیں اور ذہن مستقبل کے خاکے بنا رہا تھا۔

حسن۔ سکوت اور نیم تاریکی میں کائنات کا ذرہ ذرہ مدہوش سا تھا۔ کبھی کبھی حسن کی زیادتی فطرت کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ جانو خالق اپنی تخلیق پر خود ہی انگشت بدنداں ہو۔

"بھئی زور سے گاؤ نا۔"

شاہد نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"ایسے میں دھیرے دھیرے گایا جاتا ہے۔"

"واہ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔"

چاند کو ہنسی آ گئی۔

"ہاں زور سے گاؤ نا رفعت۔" اس نے کہا۔

"تم بھی ساتھ گاؤ۔ پھر زور سے گاؤں گی۔"

"لیکن مجھے گانا نہیں آتا۔"

"جھوٹ۔"

"نہ مانو۔"

"کیا حرج ہے مس چاند۔ رفعت کے ساتھ مل کر گا لیجئے نا۔"

"نہیں شاہد بھائی۔ مجھے بالکل گانا نہیں آتا۔"

"پھر باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح خاموش رہنا تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"

"اتنے خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر ہے۔"

"بالکل الٹی منطق۔"

"آپ کیا جانیں۔"

رفعت نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ اب واپس چلا جائے۔"

"ہاں۔ کافی رات ہو گئی۔"

چاند نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا صاحب۔ پھر واپس چلتے ہیں۔"

شاہد نے کشتی موڑ لی۔

رات سونے سے پہلے چاند نے بڑی ہمت کر کے رفعت سے پوچھا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا رضوان بھائی سے تمہاری شادی ہو رہی ہے"

"ہاں۔" رفعت نے بلا جھجک جواب دیا۔

"ڈیڈی اور بھیا نے اسی لئے بلایا تھا اور اب انہیں لکھ ہے۔ جواب بھی آ گیا ہوگا۔"

"اچھا۔" اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے رفعت چہرے کی بدلی ہوئی رنگت نہ دیکھ سکی۔

"تمہیں پسند ہیں رضوان بھائی۔" چاند نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔ تمہارے بھائی جو ہوئے۔"

"شاہد بھائی تمہیں پسند ہیں؟" رفعت نے فوراً پوچھا

چاند خاموش رہی۔ دراصل اس نے اس کا جملہ سنا ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے کانوں میں رفعت کے ہنسنے کی آوا آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئیں۔ بولو نا۔ پسند ہیں نا۔"

"کون پسند ہیں۔" چاند کی آواز میں حیرانی تھی۔

"شاہد بھائی۔" رفعت ہنس رہی تھی۔

"بھائی کو پسند کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہ

"ہمارا خیال ہے کہ"

"سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

چاند نے جلدی سے کروٹ بدل لی۔

حالانکہ اس رات اس کو بہت کم نیند آئی۔ گھڑی گھڑی ج کر اٹھ بیٹھتی۔ ہر بار اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ۔ رضوان بھ اور مسٹر شوکت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ کوئی غیر مرئی قوت لئے لوگوں سے دور بہت دور کئے دے رہی ہے۔ اور چیخے چلا کے باوجود ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں بچاتا۔ سب خاموش دیکھ رہے ہیں۔ آگے نہیں بڑھتے۔

صبح اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

ناشتہ پر رفعت نے پوچھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ آج واپس چلو گی نا؟"

"اتنی جلدی؟" رفعت حیران ہو گئی۔

"اب چلو۔ مجھے کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

"کم از کم ایک روز تو اور رکئیے مس جاوید۔"

شاہد نے اصرار کیا اور اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ آخر دوسرے دن وہ لوگ واپس آ گئے۔

ان کے آتے ہی امجد حسین نے الگ بلا کر بیرسٹر شوکت کا انکار نامہ اس کے سامنے کر دیا۔ شاہد نے خط پڑھ کر بڑی بے نیازی سے لفافہ میز پر ڈال دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہماری رفعت کو ایسے ایسے سینکڑوں رضوان مل سکتے ہیں۔ دوسرا رشتہ تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو قائم ہے۔ اور میں چاہتا ہوں یہ قائم ہی رہے۔ ہم لوگوں کا بڑا فائدہ ہے۔ اب پتہ نہیں رفعت نے اس کی مرضی معلوم کی یا نہیں۔"

"میں نے پوچھا تھا۔ ابھی تک پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔"

"بالکل احمق لڑکی ہے۔ یہی بہترین موقع تھا۔ ویسے تمہیں یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔"

"جی ہاں۔ بالکل یقین ہے۔"

حالانکہ اس کے دل کی آواز اس کے بالکل برعکس تھی۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔ اچھا۔ اب جا کر آرام کرو۔"

اور وہ کچھ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

شوکت لاج میں ایک بار پھر مسرتوں کے شادیانے بج اٹھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں۔ عائشہ بیگم بھی زبردستی یہیں آ گئی تھی۔ حالانکہ جوڑوں کو ٹانکنے کے بجائے وہ سارا دن اوپر چاند والے کمرے میں ہی پڑی رہا کرتی۔ شمسہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ سے واپس آ گئی تھی۔ شادی کی تیاریوں کو دیکھ کر پہلے تو وہ بڑی خوش ہوئی۔ رضوان کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ دونوں نے مبارکباد دی۔

مگر جب عمرانہ سے یہ معلوم ہوا کہ چاند کے بجائے یہ بیاہ عذرا سے ہو رہا ہے تو جیسے دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

انہوں نے بڑی تشویش کا اظہار کیا۔ اور ان کو بھی عمرانہ نے جل جل کر ساری داستان سنا دی۔

"شوکت خالو نے اچھا نہیں کیا۔" شمسہ نے کہا۔

"شمو خالہ کی روح کس قدر بے چین ہو گی۔" اکرم نے سوچا۔

"لیکن رضوان نے کیسے منظور کر لیا؟"

"وہ تیس مار خاں جو ٹھہرے۔" عمرانہ بہت جلی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم تو ان سے بڑی خفا معلوم ہوتی ہو۔"

"اور کیا۔ میں نے، نجمہ نے اور فرحت خالہ نے بہت سمجھایا کہ انکار کر دیں۔ مگر اتراہٹ کے مارے سنتے ہی نہیں۔ ابو کا سر نیچا ہو گا۔ ان کے دوست کیا کہیں گے۔ لڑکا کتنا بدتمیز ہے۔ خود بڑے تمیز والے ہوئے۔"

شمسہ اور اکرم دونوں ہنس پڑے۔

"معلوم ہوتا ہے تم باقاعدہ لڑی ہو۔"

"میں بات بھی نہیں کرتی۔ بھلا چاند سنے گی تو کیا کہے گی؟"

"اسے ابھی اطلاع نہیں۔"

"ابھی کہاں۔ میں نے کہا تھا بلوا لوں۔ تو جناب نے منع کر دیا۔ اب سوچ رہی ہوں تار دے دوں۔"

"ہاں۔ تار دے دو۔ آ جائے گی۔ تو خود ہی معلوم ہو جائے گا غریب کو۔ لیکن اچھا نہیں۔"

"جانے کیا ہو گا۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ بھلا خالہ عائشہ یہ رشتہ کر سکتی تھیں۔

اور کیا۔ یہ سب کیا دھرا انہیں کا تو ہے خدا سمجھے۔"

"تم اس کی مخالفت کرتیں۔ خوب ضد کرتیں۔"

"ہاں۔ بھلا میری کون سنتا ہے۔ ممی ہوتیں تو یہ دن ہی کیوں آتا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"چلو۔ اب ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ اکرم نے سمجھایا۔ بقول بزرگوں کے یہ بھی قسمت کی بات ہے۔"

اور کیا۔ ورنہ شادی میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں میری۔"

رضوان نے ایک دم سے کمرے میں آ کر ان لوگوں کو چونکا دیا۔

"آپ ہی کا ذکر خیر تھا۔ اکرم نے کہا۔

"بزرگوں کو اسی طرح لوگ یاد کرتے رہتے ہیں۔"

"آپ بزرگ کب سے بن گئے؟" شمسہ نے پوچھا۔

"جب سے آپ اور یہ ہماری عمرانہ صاحبہ والدہ بزرگوار بنیں۔"

عمرانہ چڑ گئی۔ رضوان جان بوجھ کر اس کے قریب گھس کر بیٹھ

قسط جاری ہے۔

میں کبھی نہ بھولوں گی

مذاق

عابدہ صفدر لودھی

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے میں جب فرتھ ایئر میں پڑھتی تھی۔ فرحت، عصمت اور ساجدہ میری کلاس فیلوز تھیں۔ چونکہ ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے اس لئے ہم کالج اکٹھے آتی جاتی تھیں۔ ایک دن ہم کالج سے بڑے خوشگوار موڈ میں آرہے تھے کہ ساجدہ کو شرارت سوجھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق دھکے دینے لگی۔ ہم ایک گلی میں سے آرہے تھے۔ اور گلی بالکل سنسان تھی اور گھروں کے سب دروازے تقریباً بند تھے ہم سمجھے اندر سے بھی بند ہوں گے۔ اب ہم آرام سے باتیں کرتے آرہے تھے کہ اچانک ساجدہ نے دھکا دیا فرحت تو ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ میں اور عصمت بچنے کے لئے ایک دروازے کا سہارا لینے کے لئے جیسے ہی ساتھ لگے ایکدم دروازہ کھل گیا، دھڑام سے عصمت اور میں صحن کے اندر ایک دوسرے کے اوپر گریں۔ اتنے میں گھر کے سب افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اور ہم پڑے مزے سے ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے شرم کے مارے اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اتنے میں ایک عورت نے ہمیں اٹھایا۔ اور فوراً یہ کہہ کر کہ تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی۔ اور ہمیں باہر نکال کے کنڈی لگا دی ــ بڑی سخت ہوئیں آئی تھیں، شرمندگی اور تکلیف کی وجہ سے بڑی مشکلوں سے گھر پہنچے۔ اب بھی اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے۔

بہادری

شہناز نیفی

ایک واقعہ جو میری دادی اماں کے ساتھ پیش آیا ــ انہی کی زبانی میں یہ واقعہ رقم کر رہی ہوں آپ بھی سنئے۔ کافی عرصہ پیشتر کی بات ہے مبارک پور ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اس اسٹیشن پر صرف پسینجر ٹرین رکتی ہے یا کبھی مال گاڑیاں اور بس، اور پھر اس اسٹیشن پر صرف ریلوے کے ملازمین چیدہ چیدہ رہائش پذیر تھے۔ بجلی کا ابھی تک انتظام نہ ہوا تھا اندھیرے کا راج تھا۔ جب ہم شروع شروع میں وہاں گئے تو بڑا خوف محسوس ہوتا تھا ہر طرف ہُو کا عالم سناٹا، نہ بازار نہ گھر۔ چند گھروں کے علاوہ جنگل بیابان تھا۔ اور جب کوئی ٹرین گذرتی یا پسینجر ٹرین رکتی اور مسافر اترتے چڑھتے تو ذرا رونق کا احساس ہو جاتا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ کمروں میں اندھیرا تھا گیس تھی نہ لالٹین، کیونکہ تیل نہ تھا۔ علی دوسرے اسٹیشن پر تیل لینے گیا ہوا تھا۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ اس اسٹیشن پر سانپ بہت تعداد میں پائے جاتے ہیں اس وجہ سے میں نے چند قرآنی صورتیں جو سانپ کے کاٹے یا ڈر کی تھیں پڑھ رکھی تھیں۔ اس روز ایسا ہوا کہ میں نے اندھیرے میں کیل پر سے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ اٹھانا چاہا تو رسی جیسی کوئی چیز میرے ہاتھ آگئی۔ مجھے کچھ نظر نہ آرہا تھا اور جب میں نے اسے کھینچا تو وہ کھنچتا چلا آیا اور جب نرم نرم چیز لجلجی سی ہاتھوں کو محسوس ہوئی تو میں نے جلدی سے اسے جھٹک دیا اور اندھیرے میں ہی اللہ کا نام لے کر کنڈی بندی لگائی اور منہ کو ڈنڈے سے کچل دیا۔ اور پھر جب صبح ہم نے روشنی میں اس سانپ کو دیکھا تو سب دنگ رہ گئے کیونکہ وہ تقریباً دو تین گز لمبا تھا اور اتفاق سے قرآنی آیات یا اللہ کے کرم سے۔ بس جو سمجھ لیں کہ اندھیرے میں منہ صحیح طور پر کچلا گیا ورنہ اگر بچ جاتا تو وہ کافی زہریلا تھا۔ اور شاید پھر میں آج یہ واقعہ سنانے کو زندہ نہ ہوتی۔ اس اسٹیشن پر میں نے بعد میں بھی کئی سانپ مارے۔

عید کا چاند

نسرین سلطانہ نسرین

پچھلے سال ماہِ رمضان کے آخری روز میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی کہ راستے میں عید کا چاند نظر آ گیا کچھ لوگ کہتے ہوئے جا رہے تھے خیر ہم نے بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن نظر نہ آیا جب ہم ڈاکٹر کے پاس سے واپس آئے تو والد صاحب کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے کہا کہ بیٹے وہ دیکھو عید کا چاند۔ والد صاحب نے کہا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرو۔ میں نے کہا نہیں راستے میں نہیں کرتے۔ والد صاحب نے کہا میں یہاں دعا مانگ لیتا ہوں تم گھر جا کر مانگ لینا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔

والد صاحب دعا مانگ رہے تھے کہ ایک عورت

قریب سے گزری اور کہنے لگی۔

"عید کا چاند غریبوں کے لئے کیا لے کر آتا ہے بچوں کے لئے آنسو، آہیں اور رونا رو ہاٹ۔"

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ بہت غریب تھی لباس شکستہ سا۔ آنکھوں میں حسرتیں سی تھیں۔

میں یہ واقعہ کبھی نہ بھولوں گی وہ عورت کہہ کر چلی گئی۔

لیکن

میں سوچنے لگی کہ واقعی عید جہاں دولت مند گھرانوں پر خوشیوں کا پیغام بن کر آتی ہے وہاں غریبوں کے لئے آنسوؤں اور حسرتوں کا پیغام بن کر نازل ہوتی ہے عید کا پیغام جو امیروں کے لئے مسرت کا باعث ہوتا ہے وہاں غریبوں کے لئے تکلیف کا باعث بنتا ہے

فرشتہ

شہناز فقیہ

یہ واقعہ ہمارے ایک رشتہ دار کا ہے انکی زبانی سنیئے۔

ہمارے رشتے داروں میں شادی تھی چونکہ قریبی رشتے داری تھی اس لئے ہم کو دو تین دن پہلے جانا تھا بیوی کو ہلکا سا بخار تھا اس لئے سوچا بچیوں کو ساتھ لے کر چلا جاؤں گا پھر واپس آکر ہم میاں بیوی شادی کے دن چلے جائیں گے تیر پروگرام کے مطابق دونوں بیٹیوں کو لے کر بس کے اڈے روانہ ہو گیا اڈے پر کافی رش تھا اس لئے بڑی مشکل سے جگہ بناتا ہوا بس کو پکڑ لیا اور آرام سے بیٹھ گیا ڈرائیور کو بھی شاید جلدی تھی اس لئے دیر کئے بغیر روانہ ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی آگے گئے تھے کہ بیٹی نے کہا۔

"ابا جان باجی نظر نہیں آرہی۔"

میرے اوسان خطا ہو گئے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ لیکن نظر نہ آئی۔ سوچا اب کیا ہو گا کیونکہ میری بڑی بیٹی گونگی تھی اور بات کرنے سے قاصر تھی۔ جلدی سے بس کو رکوایا اور اتر کر واپس اڈے پر آگیا لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ پھر سوچا ہو سکتا ہے ہمیں نہ پا کر واپس گھر چلی گئی ہو۔ لیکن گھر جا کر معلوم ہوا کہ یہاں بھی نہیں آئی۔ پریشانی سے برا حال تھا۔ تھانے بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ جوان لڑکی تھی اس لئے اگر بات منہ سے نکل گئی تو اچھا نہ ہو گا کیونکہ آجکل کے لوگوں کو تو بات کرنے کا بہانہ چاہیئے خراب لفظوں میں ایک دوسرے کو سنائیں گے ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ میری بیٹی اندر آگئی۔ اسے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہماری عزت رکھ لی۔ بیٹی نے باہر جانے کا اشارہ کیا میں باہر آگیا تو ایک شخص کھڑا تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"کس طرح یہ بچی غلطی سے پنڈی کی بس میں سوار ہو گئی اور آپ کو نہ پا کر رونے لگی۔ میں نے بات کرنا چاہی لیکن بات نہ کر سکی۔ اشاروں میں بتایا کہ لکھنا آتا ہے اس نے سر ہلا دیا ایڈریس لکھ کر دیا اور یوں میں اسے گھر لے آیا۔"

میں نے اس کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگا ابھی اچھے لوگوں کی کمی نہیں اگر میری بیٹی غلط لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی تو میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

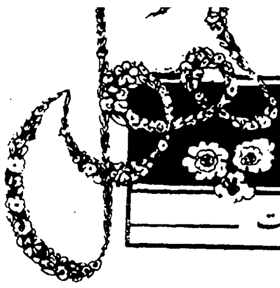
تیز رفتاری

ناظمہ انور

یہ اب سے چند سال پہلے کی بات ہے۔ ہم لوگ بذریعہ کار گلگت جا رہے تھے۔ موسم تو خیر خوشگوار تھا ہی مگر بوندا باندی نے خوف پیدا کر دیا تھا۔ کچھ دیر ہی گذری تھی کہ پیچھے سے دو بسیں آپس میں ریس لگاتی ہوئی زن سے گذر گئیں۔ ڈرائیور ان کو برا بھلا کہنے لگا کہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کہ صرف زندگی کو مشغلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہزار جانوں سے مذاق ہی مذاق میں کھیل بیٹھتے ہیں۔ کچھ دیر ہی گذری تھی کہ آگے جاتی ہوئی بس جو کہ پوری طاقت اور اسپیڈ سے آگے بڑھنے کی کوشش میں سرگرداں تھی اچانک ادھر ادھر ڈولنے لگی، ڈرائیور نے بہتیری کوشش کی ہو گی۔ لیکن افسوس کہ خدا کے حکم کے آگے کون ٹال سکتا ہے اس کا ٹائر ایکدم برسٹ ہوا اور دوسرے ہی لمحے بس کٹی پتنگ کی مانند ڈولتی ہوئی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ ہمارے ڈرائیور نے فوراً کار روک دی۔ سب کے سانس جیسے تھم چکے تھے۔ اور پھر ہمارا ڈرائیور صرف تیس میل کی اسپیڈ سے کار چلاتا ہوا آیا تھا۔ آج بھی کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔



ترتیب: شگفتہ محمود



رنگا رنگ

کچھ شعر ، لطیفے ، واقعات ، اقتباسات

وسیمہ عزیز

غلط فہمی

جوش ملیح آبادی نے کسی شخص پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔
"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔"
"میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھا تھا۔" اس آدمی نے برہمی سے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔
"تو آپ نہ سمجھے۔ غلط فہمی مجھ ہی کو ہوئی۔" جوش نے کمال عجز سے اعتراف کیا۔

ساجدہ ملک

کوٹ کی چوری

جرمنی میں ایک شخص کو فر کا بے حد قیمتی کوٹ چرانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا جب اسے عدالت میں پیش کیا تو وہ بولا۔ "بخدا جج صاحب سارا قصور میری بیوی کا ہے یقین کریں میں ایک فر کوٹ چرا کر لایا تو میری بیوی کو وہ پسند نہیں آیا۔ میں اسے رکھ کر دوسرا اٹھا لایا مگر وہ بھی میری بیوی کو پسند نہیں آیا۔ اسی طرح تیسرا پھر چوتھا مگر وہ ہر بار اسے مسترد کرتی رہی۔ آج پانچویں بار گیا تو پکڑا گیا۔"
جج نے اسے تو رہا کر دیا مگر اس کی بیوی کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

روبینہ بٹ روبی

رعایت

انقلاب فرانس کے دوران میں ایک مشہور و معروف دانشور اگینس ہلیول کو سزائے موت سنائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ انقلاب فرانس کے متعلق تعریفی ڈرامہ ایک ہفتے کے اندر اندر موزوں طور پر تیار کرے تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ چنانچہ اس دانشور نے ایک ہفتے کی میعاد گزرنے سے پہلے موسیقی اور ترنم پر ایک شاندار منظوم ڈرامہ تیار کر کے پیش کر دیا۔ اس کے نتیجے کے طور پر نہ صرف اس کو معاف کر دیا گیا بلکہ اسے بیش قیمت انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔

عابدہ تبسم

مسکرایئے

مریض:۔ (ڈاکٹر سے) میں آپ کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ آپ نے میری جان بچائی ہے۔
ڈاکٹر:۔ میں جان بچانے والا کون ہوں جان تو خدا نے بچائی ہے۔
مریض:۔ تو پھر دوائی کی رقم بھی اس کو دے دوں گا۔

حکایت سعدی

ایک دانا کو مکان بنوانے کی ضرورت ہوئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا کوٹھڑی نما دالان بنوایا جو اس کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے کافی تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ دوستوں نے دیکھ کر کہا "بھائی آپ اور یہ چھوٹا سا گھر؟"
دانا نے جواب دیا۔ "دوستو! پڑا رہنے کے لئے اتنا بہت ہے۔ اور یونہی چھوڑ دینے کے لئے کافی زیادہ۔ کھانے کے لئے دو روٹیاں۔ تن ڈھانپنے کے لئے تین کپڑے اور رہنے کے لئے ایک چار دیواری بہت ہے۔ اس سے زیادہ جتنی چیزیں ہم نے اپنی جان کے لئے لگا رکھی ہیں ہمارے لالچ کا نتیجہ ہیں۔ اور لالچ جتنا زیادہ آدمی کو دونوں جہاں میں اتنا ہی ذلیل کرتا ہے۔ ہم جب تک جیتے ہیں۔ بے فائدہ چیزیں بٹورنے کے لئے اپنی جا

ہلکان کرتے ہیں اور مرتے وقت حسرت چھوڑ جاتے ہیں۔

قناعت

عقل کے امیر نے کسی بزرگ کو ایک قیمتی پوشاک پہننے کے لئے بھیجی بزرگ نے وہ پوشاک چوم کر واپس کر دی۔ اور کہلا بھیجا پوشاک بہت اچھی ہے جو امیر نے دی ہے۔ لیکن میرے پھٹے پرانے کپڑے اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں کہ اس میں نہ کسی کا احسان ہے نہ منت۔

شمیم مصطفےٰ قریشی

کام کی باتیں

کسی نے امام غزالی سے پوچھا۔
"آپ نے اسقدر علم کیسے حاصل کر لیے؟"
فرمایا۔

◎ "میں جس بات کو جانتا نہ تھا اس کے پوچھنے میں شرم نہ کرتا تھا۔"

◎ ایک دانا فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی بات میں اپنی بڑ ہانک دیتا ہے وہ گویا اپنی جہالت کے اقرار نامہ پر مہر لگا دیتا ہے۔

◎ کسی لنگڑے نے ایک کنکھجورے کو مار ڈالا۔ حالانکہ اس کے سینکڑوں پاؤں تھے۔ مگر موت کے آگے سب بیکار ہے۔

◎ مسکرائیے کہ جذبے اور خوشی سے بھرپور ایک مسکراہٹ عمر میں برسوں کا اضافہ کر دیتی ہے۔

◎ عرب کا ایک مشہور شاعر "سبحان وائل" فصاحت اور بلاغت میں اس لئے بے نظیر مانا جاتا ہے کہ اگر وہ کسی جماعت کے سامنے سال بھر بھی تقریر کرتا تو جو مضمون ایک دفعہ بیان کرتا اس کو مکرر نہ کہتا تھا۔ اور اگر دوبارہ کہنے کی ضرورت بھی ہوتی تو طرز بیان اور اسلوب بدل کر دوسرے الفاظ میں ادا کرتا۔

بشریٰ صدیقی

اصلیت

ڈیانا کی جوہانا سٹین اپنی رازداری سے لڑکا بنی رہی کہ اس کے سوتیلے باپ کو بھی اس کی اصلیت معلوم نہ ہوئی۔ اس نے آسٹرین اور انگریزی فوج میں کام کیا۔ وہ سات دفعہ زخمی ہوئی اور تین دفعہ پکڑی گئی مگر پھر بھی وہ ۲۴ سال تک فوجی رہی۔ آخر کار اس کے لڑکی ہونے کا راز کھل گیا۔

میک اپ

انگلستان کی ماریا کیننگ نامی ملکہ جس کا شمار وقت کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا تھا۔ صرف ۲۶ سال زندہ رہی۔ اس کی موت کی وجہ سانس کی بیماری تھی جو بہت زیادہ میک اپ (بناؤ سنگار) کی وجہ سے لاحق ہو گئی تھی۔

شاہین یوسفانی

لطیفہ

ایک صاحبہ اپنی سہیلی کو بتا رہی تھیں۔
"سچ پوچھو تو بچوں نے ہماری طلاق ہوتے ہوتے رکوا دی۔"
سہیلی نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"
ان صاحبہ نے جواب دیا۔ "وہ اس طرح کہ طلاق کے بعد بچوں کو نہ میرے شوہر اپنے پاس رکھنے کو تیار تھے اور نہ ہی میں۔"

لطیفہ

واٹرلو کے میدان میں جب نپولین کو شکست ہو گئی تو ولنگٹن نے طنزیہ انداز میں نپولین سے کہا۔
"جانتے ہو ہم انگریز عزت کے لئے لڑتے ہیں اور تم دولت کے لئے۔"
نپولین نے برجستہ کہا۔
"ہاں، جس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔"

کوثر پروین

اقتباس

تم ہمارے لئے قبریں کھودتے ہو۔ اور محلوں کی دلکشی اور قبروں کی تاریکی کے درمیان انسانیت فولادی ہتھیار سجائے پہرہ دیتی ہے۔

ہم تمہاری راہوں پر پھولوں کا فرش کرتے ہیں اور
تم
ہمارے بستروں پر کانٹے بچھاتے ہو۔
اور
گلاب کی پتیوں اور کانٹوں کے درمیان حقیقت ابدی نیند سوتی ہے۔
اور ہم
غم کے بیٹھے ہیں۔ اور غم وہ بادل ہے جو دنیا میں معرفت اور سچائی کا مینہ برساتا ہے۔
اور تم مسرت کے راج دلارے ہو۔
از۔ جبران۔ "سحر ہونے سے پہلے"

کوثر ولی

نصیحت

ایک مشہور فرانسیسی ادیب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ اپنی کتاب کسی کو نہ دو، اور اگر دو تو واپس لینے کی امید نہ رکھو۔ کتاب دینے والا بیوقوف ہے اور واپس کرنے والا اس سے زیادہ احمق۔

میری لائبریری میں جتنی بھی اس وقت کی کتابیں ہیں وہ سب میرے دوستوں کی ہیں اور میرے پاس جو کتابیں تھیں وہ میرے دوست لے گئے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

روبی نیازی بھر

دو دل بارہ انگلیاں

اٹلی کے ایک باشندے آگسٹینو کوپی کے دو دل اور بارہ انگلیاں ہیں اس کا ایک دل تیز چلتا ہے اور دوسرے کی دھڑکن مدھم ہوتی ہے دو دلوں کی وجہ سے وہ کبھی بیمار نہ ہوا۔ ۴۳ سال کی عمر میں بھی وہ مضبوط جسم کا انسان ہے۔ لوگ اسے دیوتا سمجھتے ہیں وہ کئی آدمیوں سے زیادہ وزن اٹھا سکتا ہے اس کے ہاتھ کی انگلیاں بہت لمبی ہیں۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے وہ کافی دولت کما سکتا تھا لیکن اس نے یہ راستہ پسند نہ کیا بلکہ انجینئر بن گیا اور مزے سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

صالحہ بانو

میرے خیالات

■ ہر ایک کو اتنی محبت دو کہ وہ مسرور ہو جائے مگر کسی کی محبت کے طلبگار نہ ہو کہ وہ تم کو اتنی محبت نہ دے اور تم اس سے نفرت کرنے لگو۔

□ اپنے دوست کو اپنی خالص ترین محبت دے دو مگر نہ دو کہیں یہ اندھا اعتماد تمہیں ناگ کی طرح نہ ڈسے۔

□ ہم سب تنہا ہیں، ان جزیروں کی طرح جن کے ساحل ہی سمندر ہوتے ہوئے بھی دور دور ہوتے ہیں۔

□ دنیا میں دین سے چلتی ہے دوسروں کی عزت سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ مفید مشورہ ہر ایک سے لو کام اپنی عقل سے کرو۔

□ بعض باتیں پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں اور سمجھنے کے لئے دل کی نہیں دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ثریا رحمان

اندلس

اندلس کا حکمران ہشام ایک نیک، عادل اور نفیس آدمی تھا۔ مسجد قرطبہ کا مشہور پل اسی نے تعمیر کروایا تھا۔ پل بننے کے ایک دن اس نے اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

وزیر نے جواب دیا۔ "حضرت! اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں چونکہ آپ شکار کھیلنے کے بے حد شوقین ہیں اسی لئے لوگ کہتے ہیں آپ نے یہ پل صرف اسی وجہ سے تعمیر کیا ہے کہ آپ اس سے گذر کے شکار گاہ کی طرف جا سکیں۔"

ہشام نے اس انکشاف کا گہرا اثر قبول کیا اور اس کے بعد کبھی شکار کھیلنے نہیں گیا۔ اس کی تمام توجہ قوم کی بہبود اور فوجی طاقت بڑھانے میں صرف ہونے لگی۔

ان دنوں امام مالک مدینے میں رہتے تھے وہ [illegible] تھے۔ "کاش ہمارا خلیفہ بھی ہشام جیسا ہوتا۔"

ابن انشاء

لے چلی جی کی بے قراری دُور

لے چلی جی کی بے قراری دُور
ہم سمجھتے تھے اپنی باری دُور
دوستو! منزلیں ہماری۔ دُور

بھیس کیا کیا بھریں جنوں ساماں
(شہر، گلشن، محل سرا، زنداں)
شام کو اپنے شہر کی گلیاں

چاند بھی صورتِ کتاں صد چاک
چاندنی بھی فسردہ و غم ناک
جی آتا ہے لوٹیے سرِ خاک

مضمحل مضمحل ستارے بھی
دشتِ افلاک کے چکارے بھی
آنکھ اک سمت کو سدھارے بھی

راہِ جاناں میں جاں سپار ہیں لوگ
ہجرِ جاناں میں بیقرار ہیں لوگ
پھر بھی ہم سے خراب و خوار ہیں لوگ

چاند میں کچھ خیال کرتے ہیں
اپنا جینا وبال کرتے ہیں
میر صاحب کمال کرتے ہیں

کیوں ٹھہر سا گیا ہے وقت میاں؟
اور کتنے دوا زدہ کے نشاں
اور کتنی فراق کی گھڑیاں

ابنِ انشاء



حالِ دل جس نے سنا گریہ کیا
ہم نہ روئے ہاں ترا کہنا کیا

یہ تو اک بے مہر کا مذکور ہے
تم نے جب وعدہ کیا ایفا کیا

پھر کسی جانِ وفا کی یاد نے
اشکِ بے مقدور کو دریا کیا

نال و دنیبوں کے چل نقل ہو گئے
ابر برسا اک رات بھر برسا کیا

دل کے زخموں کی ہری کھیتی ہوئی
کام ساون کا کیا اچھا کیا

آپ کے الطاف کا شہرہ کیا
ہاں دلِ بے صبر نے رسوا کیا

میری بیاض سے

اسماء صدیقہ

میرے ساتھ چل رہا ہے غم زندگی کا صحرا
میں کہاں بھٹک گیا ہوں تیری بزم سے نکل کر

شمیم مصطفیٰ قریشی

کرو نہ گل شب ہجراں چراغ ہم نفسو
نصیب میں نہ ہو جب میرے سحر تو کیا ہوگا

رخسانہ ہارون

کتنا تاریک ہے شام غم کا سماں
لوگ کس بات پہ اُمیدِ سحر رکھتے ہیں

مسرت جبیں قادری

ہائے وہ تشنگیٔ ذہن، وہ تمنا جس نے
جب بھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا

شفق باجوہ

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

فرزین

وہ دلنواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
میرا علاج میرے چارہ گر کے پاس نہیں

سعیدہ مشتاق

بچھڑ گئے ہیں کہاں ہم سفر خدا جانے
نقوشِ پا بھی نہیں گرد کارواں بھی نہیں

روبی نیازی

میں تجھ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود بھی کھو گیا
تو کبھی اسی خلوص سے مجھ کو تلاش کر

خالدہ کوثر

کیا بیت گئی اب کے فراز اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

مسز ایم صابر قمر

خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری ہے راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے

مسرت جبیں قادری

اجل بھی اس کی زندگی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساس زندگی ہو جائے

ساجدہ ملک

سو گئی آنکھ تو جاگے میری تربت کے نشاں
بجھ گئی پیاس تو راہوں میں سمندر آئے

دلشاد نسیم

رکے تو چاند چلے تو ہواؤں جیسا ہے
وہ ایک شخص کہ جسے دھوپ میں دیکھو تو چھاؤں جیسا ہے

فرزانہ شمیم

جب تک بکے نہ تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا

نیئر ہشام

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

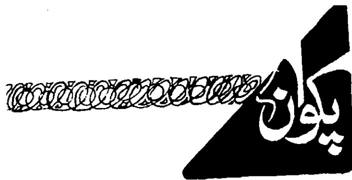
صفیہ خان

زندگی نے اپنا شیرازہ بکھرتا دیکھ کر
سونپ دی ہے ریزے ریزے کی نگہبانی مجھے

خالدہ قمر

باہر سے سلامت ہوں نہ اندر سے شکستہ
یارو مجھے جینے کی ادا کیوں نہیں آئی





مچھلی کے شامی کباب

اشیاء:۔ سنگھاڑ مچھلی بڑے بڑے کانٹوں والی ایک

دہی	ڈیڑھ پاؤ
سرخ مرچیں	۲ تولہ
لہسن	۳ پوتھی
گھی	حسب انداز
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔ مچھلی کا سر اور دھڑ کاٹ لیں پھر اس کا پیٹ چاک کر کے صاف کر لیں۔ پھر سخت آٹا گوندھ کر تمام مچھلی پر تھوپ دیں۔ اور گرم گرم راکھ میں دبا دیں۔ جب مچھلی کے اوپر کا آٹا سرخی پر آجائے تو اسے آگ میں سے نکال کر اسکے چھلکے اتار کر اندر سے کانٹے نکال پھینکیں اور اسے سل پر باریک پیس لیں۔ پھر سرخ مرچوں اور لہسن کو باریک پیس کر مع دہی کے اس میں ملا کر گول گول ٹکیاں بنا لیں۔ ان کو گھی میں تل لیں پھر نوش فرمائیں۔

شاہدہ سلطانہ

انڈوں کا کسٹرڈ

اشیاء:

دودھ	ایک پاؤ
شکر	۵ چمچے بڑے
انڈے	تین عدد
بیکنگ پوڈر	چھ چٹکی

کچھ قطرے زعفران

ترکیب:۔ پہلے انڈے پھینٹ لیں۔ پھر اس میں دودھ، شکر، بیکنگ پوڈر ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس میں چند قطرے زعفران کے ملا لیں۔ دو پیالیوں میں بھریں۔ لیکن کچھ حصہ خالی رکھیں۔ ایک دیگچی میں پانی بھر کر چولھے پر رکھیں لیکن پانی نصف پیالی تک رہے۔ ورنہ جوش کھا کر پیالی میں چلا جائے گا۔ دیگچی پر ڈھکنا ڈھانک دیں اور اس پر دہکتے ہوئے کوئلے ڈال دیں۔ پیالیاں پھول کر منہ تک آجائیں تو تیار ہے۔

بکرے کی ران

اشیاء:۔

بکرے کی ران	ایک عدد
پیاز	آدھ پاؤ
ادرک	آدھ پاؤ
سرخ مرچ	۴ تولے
سرکہ	ایک چھٹانک
انجیر یا پپیتا	ایک چھٹانک
چرونجی	چار تولے
سونف	ایک ماشہ
سونٹھ	۲ ماشہ
گرم مصالحہ کا پاوڈر	ایک ماشہ

ترکیب:۔ ران کو خوب دھو کر کانٹے سے گود لیں سرکہ چھڑک دیں اور نمک بھی لگا دیں۔ دہی کا پانی ململ کے کپڑے میں ڈال کر نکال دیں اور تمام مصالحہ، زعفران گرم مصالحے کا پاوڈر ۴ ماشہ گھی میں ملا کر ران کو اس مصالحے میں خوب لتھیڑ دو گھنٹے تک ران کو رکھا چھوڑ دیں۔ دو گھنٹے بعد ران کڑھائی میں رکھ کر مندی آنچ پر پکائیں۔ پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ گوشت پپیتا یا انجیر سے گل جاتا ہے۔ پھر بھی اگر ضرورت ہو تو گرم پانی کا چھینٹا دیں۔ جب ران تیار ہو جائے تو ڈش میں نکال لیں۔ اوپر سے ہرا دھنیا، ٹماٹر اور پیاز کے ٹکڑے سجا دیں۔ نہایت لذیذ ڈش تیار ہوگی

شگفتہ رشید

بوٹی کباب

اشیاء:۔

گوشت گائے کا	ایک سیر
دہی	ایک پاؤ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
گرم مصالحہ پسا ہوا	حسب خواہش
پپیتا کچا	آدھ پاؤ
لہسن	آدھ پاؤ
پیاز	آدھ پاؤ
ہری مرچ	۶ عدد
ادرک	آدھ چھٹانک

ترکیب:۔ تمام مصالحہ کو باریک پیس لیں اور گوشت کی چھوٹی، گول ایک سائز کی بوٹیاں کر لیں۔ اگر چکنائی ہو تو بالکل الگ کر دیں۔ صاف ستھری بوٹیوں کو کھلے برتن میں رکھ کر دہی اور تمام مصالحہ ملا دیں۔ ساتھ ہی کچا پپیتا پیس کر اچھی طرح بوٹیوں پر لگا دیں ایک گھنٹے تک رکھا رہنے دیں۔ جب گوشت پانی چھوڑ دے

عدنان کے مشورے



نفسیاتی الجھنیں اور ازدواجی

۲۸/ دسمبر جمعہ کے دن میں صبح سے نفسیاتی الجھنوں کی ڈاک کے لیے بیٹھا تھا اور خطوط کا انتخاب کر رہا تھا کہ جنوری کے شمارے میں کن خطوط کو شامل کیا جائے اور کونسے خطوط کے جوابات فروری تک کے لئے ملتوی کیئے جا سکتے ہیں. کن کن کے جواب ڈاک سے دینے ہیں کہ لاہور سے فون آیا.

ایک دل خراش خبر تھی.

یوں تو میری چار بہنیں ہیں لیکن بہنوں میں سب سے بڑی، اور مجھ سے دس سال چھوٹی بہن عصمت خاتون جسے ہم پیار سے حسنو باجی کہتے ہیں. انکے شوہر محمد جہانگیر اشرفی جو ہم سب کو سگے بھائیوں کی طرح پیارے تھے اور ہم سے ان کا محبت کا انداز ایسا تھا جس کی مثالیں مشکل سے ملتی ہیں. الٹا بھائی کے تو وہ دیوانے تھے. اور انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے، دیکھ دیکھ کر زندہ تھے.

جہانگیر اشرفی کی عمر مشکل سے چالیس سال کی ہو گی. نہایت صحت مند گورے رنگ، باتوں میں دھیما پن، درویش طبیعت، زندگی بھر کسی کی دل آزاری نہ کی. کسی سے کوئی معاملہ کی کسی نے زیادتی کی تو معاف کر دیا. لین دین کے نہایت کھرے تھے اور یہ کھرا ہونا ہی ان کے کام نہ آیا. ورنہ کرتا نہ ملک الموت کا تقاضا کوئی دن اور

تین بجے اچھے خاصے نہا کر نکلے. ملک الموت نے تقاضا کیا اور انہوں نے ٹالنا مناسب نہ سمجھا یہاں بھی اپنے کھرے ہونے کا ثبوت دیا.

یہ فون، یہ دل خراش خبر انکے بارے میں تھی.

وہ اس جوانی میں ہمیں روتا چھوڑ گئے.

اے میرے بھائی! محمد جہانگیر اشرفی!!

ابھی تو آپ کو بہت سے کام نمٹانے تھے.

وہ کام کون نمٹائے گا؟

محمد جہانگیر اشرفی، رومی انشا، صدر پاکستان ضیا الحق

کچھ کام ہمیں نپٹانے ہیں
جنہیں جلتے دا سے جانے ہیں
بھلا یہ بھی کوئی دن تھے آپ کے جانے کے ؛



ابھی تو خرم، ارم، قداقی اور کرن
ابا، پاپا ہی کہنا سیکھا تھا۔
ان کی انگلی بھی اگر پکڑ لوں گا۔
ان کو چلنا بھی سکھا دوں گا۔
مگر ان کا ابا کہاں سے لاؤں گا۔

عدنان



بشریٰ کرن

کی ڈائری سے

اس دن پُروا کے
جھونکے میرا آنچل
اڑا رہے تھے
اور تم میرا آنچل

تھامنے کی کوشش کرنے لگے مجھے جھونکوں کی زد سے بچانے لگے تو اس سمے میں نے کہا تھا تم بھلا ان جھونکوں کی زد سے مجھے بچا پاؤ گے تم بہت حیران تھے کیوں ٹھیک ہے ناں —— ہاں اس دن میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم زندگی میں کچھ ایسے کام سرانجام دو کہ میں فخر سے سر اٹھا سکوں.

اور آج

آج وہ بیکد سامنے ہے میلوں کی مسافت کے بعد بھی اس کے چہرے پر طمانیت ہے کہ جیسے اس نے زندگانی میں وہ کچھ کر گزرا ہے جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس نے وعدہ نبھا دیا.

طیبہ احمد

کی ڈائری سے

اے ہواؤ
تم میرے لئے اس
اجنبی کی طرح ہو۔ جو
میرے قریب آیا تو
تھا... چند لمحے ٹھہرا

اور پھر بہت دُور چلا گیا —— تم بھی مجھے چھوڑ کر دُور چلی جاؤ گی —— اس اجنبی سے میرا کوئی رشتہ نہیں —— مگر نجانے کیوں لگتا ہے کہ میرے اس کے ساتھ بہت سے ناطے ہیں —— ہاں اس نے مجھ سے چند جھوٹے رشتے استوار کر لئے تھے —— محبت کے —— مگر وہ اپنے الفاظ کا بھرم نہ رکھ سکا حالانکہ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا، مگر میرے بہت قریب تھا. شاید کہ سانسوں اور اس دل سے بھی —— اب وہ میرے لئے اجنبی ہے.

پیاری ہواؤ! تم بھی مجھے اس اجنبی کی طرح چھو کر گذر جاؤ گی اس لئے میں تم سے کوئی رشتہ استوار کرنا نہیں چاہتی۔ جاؤ تم کسی اور کو اپنا ساتھی بنا لو —— چند لمحوں کا —— کہ میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ میں صرف چند لمحوں کی ہی تمہاری ساتھی بن سکوں.

شہناز فیضی

کی ڈائری سے

آج ۱۴ تاریخ ہے
اسلامی مہینہ کی
یعنی چودھویں شب
اور میں عظیم تاج محل

کے سامنے کھڑی ہوں اور تاج محل کو روشنی میں نہاتے دودھیا سفید روشنی میں جگمگاتے دیکھ رہی ہوں. تاج محل کی مینا کاری کی جگمگاہٹ کو دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ اے خدا کیا انسان اتنا عظیم ہے کہ اس نے ایسی ایسی شاندار عمارتیں تعمیر کیں کہ جسے دیکھ کر دنیا بھی کہہ اٹھی واللہ بنانے والا اتنا شاندار ہے تو انسان کو بنانے والا کیسا ہے. تاج محل کی خوبصورتی اس کا حسن اس کی منہ بولتی تصویر ہے، اس میں بے پناہ کشش ہے یہ تاج محل وہ نہیں کہ خیالات کی رو سے اس کے محل لوٹ جائیں یہ تو وہ عظیم عمارت ہے جو سر بلند ہے جو چار ہزار سال سے سر اٹھائے کھڑی ہے اور انسان کے ہاتھوں کا جیتا جاگتا عظیم فن پارہ ہے.



شفق سلطانہ

کی ڈائری سے

خدا کرے تم میرے
تصور سے بھی اونچے
نکلو، اگر واقعی ایسا
ہو جائے تو میں... تو

میں تمہیں دیوتا مان کر زندگی کی پوجا کروں ورنہ اس زندگی میں کوئی سکون —— کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی.

آئی اک ایسی شب بھی تیرے انتظار میں
غم باعث سکونِ دلِ زار بن گیا
بانٹی گئی نہ کسی سے تنہائیاں میری
میں آپ اپنا مونس و غمخوار بن گیا



بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے

گل راچر۔ کراچی

ج: آپ کا خط مل گیا مگر پتہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم خط کا جواب نہ دے سکے برائے مہربانی جوابی لفافہ بھیج کر جواب منگوائیں۔

رضوانہ فرخ۔ حیدرآباد

س: باجی میرا چہرہ ہر وقت چکنا رہتا ہے اور مسام چہرے کے کافی کھل گئے ہیں میری عمر ۱۷ سال ہے اور میں سخت پریشان ہوں آپ مجھے اس الجھن سے نجات دلوائیے۔

ج: محترمہ۔ آپ اس طرح کریں کہ صبح اٹھ کر خوب گرم پانی سے منہ دھوئیں پھر خشک چہرہ کر کے خوب ٹھنڈے پانی کا تولیہ نچوڑ کر چہرے پر ہلکے ہاتھوں سے پھیریں کم از کم پانچ منٹ تک ٹھنڈے تولیے سے مساج کریں۔ گرم اور چکنی چیزوں سے پرہیز کریں۔ فروٹ اور سبزی کا زیادہ استعمال کریں۔ دن میں دو تین مرتبہ منہ دھوئیں اور ململ کے کپڑے سے چہرے کے پانی کو جذب کریں چہرے کو رگڑیں نہیں۔

شہناز۔ ملتان

س: میرے چہرے کی جلد بہت خشک ہے — البتہ گرمیوں میں چکنی رہتی ہے۔ اور قبض کی شکایت بھی ہے۔ اور ہاتھ پیر سردیوں میں بالکل بوڑھے محسوس ہوتے ہیں۔

ج: محترمہ آپ سردیوں میں منہ ہاتھ دھو کر گیلے ہی ہاتھ پیروں پر نیویا کریم لگا کر اور ململ کے کپڑے سے صاف کر لیا کریں اور قبض کے لئے آپ روزانہ سوتے وقت ایک کپ گرم دودھ میں ایک چھوٹا چمچہ زیتون کے تیل کا ڈال کر پی لیا کریں۔ اسی طرح چہرے پر بھی سردیوں میں گرم پانی سے منہ دھو کر صاف چہرہ کر کے آپ Barnavette-C-CREAM تھوڑی سی لگا لیا کریں۔ مگر آنکھوں کو بچا کر۔ انشاءاللہ جلد فائدہ ہوگا۔

رومانہ لطیف حسن خان

ج: محترمہ ہم نے خاص چہرے کی چھائیوں اور کیل مہاسوں کے لئے پوڈر بنایا ہے اور وہ آپ کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ ہم اس مہینے کے آخر سے V.P کرنا شروع کریں گے اگر آپ کو منگانا ہو تو منگا سکتی ہیں۔

نسرین شاکرہ۔ کراچی

ج: ہم نے پوڈر تیار کر لیا ہے آپ وہ چہرے کے دانے مہاسے چھائیوں سب کے لئے استعمال کر سکتی ہیں آپ لکھیں تو ہم آپ کو روانہ کر دیں گے۔

ساجدہ رانی حضرو

س: میں نے تھریڈنگ کروائی تو میرے چہرے پر دانے نکل آئے اور تھریڈنگ کے بعد آپ بتائیں بال زیادہ تو نہیں آتے؟ ویکس زیادہ اچھی ہے یا تھریڈنگ؟

ج: تھریڈنگ کے بعد آپ چہرے کا مساج کیا کریں جب تھریڈنگ کروائیں تو ہلکے گرم پانی میں لیموں کا عرق ڈال کر ایک ململ کے کپڑے سے چہرے پر ہلکا ہلکا مساج کریں کم از کم پانچ منٹ تک پھر ٹھنڈے پانی سے چہرہ صاف کر کے آپ کوئی اچھی کریم لگائیں۔ جو دونوں کریم آپ نے لکھی ہیں دونوں اچھی ہیں۔ ویکس اور تھریڈنگ دونوں بہتر ہے۔

سوبتا بلوچ۔ کوئٹہ بلوچستان

ج: آپ کا خط ہمارے پاس محفوظ ہے آپ جوابی لفافہ بھیج کر جواب منگائیں۔

